سلسلة
فتاویٰ
علمائے
سلف
1
فتاویٰ البانی
پاک وہند میں اردو شائقین کے لیے پہلی بار
امام البانی
کے علمی وتحقیقی فتاویٰ کا مجموعہ
تالیف
محدث العصر علامہ ناصر الدین البانی
تقدیم
فضیلۃ الشیخ مولانا ابو الحسن مبشر احمد ربانی
اعداد
فضیلۃ الشیخ راشد حسن
فاضل مرکز التربیۃ الاسلامیہ

فتاوی البانیہ

تالیف

محدث العصر علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ

تقدیم

فضیلۃ الشیخ مولانا ابوالحسن مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ

اعداد

فضیلۃ الشیخ راشد حسن حفظہ اللہ

فاضل مرکز التربیۃ الاسلامیہ

نامِ کتاب

فتاویٰ البانیہ

تالیف

محدث العصر الشیخ محمد بن ناصر الدین البانی رحمہ اللہ

تقدیم .... الشیخ مفتی مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ

سرورق .... حنظلہ اقبال

اشاعت اول .... جنوری 2013ء

ناشر .... مکتبہ الصدیق السلفیہ

تعداد 1100

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

مکتبہ الصدیق السلفیہ 0336-2901780 0333-2884686

نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور: 042-37321865

مکتبہ اسلامیہ رحمان مارکیٹ اردو بازار لاہور پاکستان: 042-37244973

مکتبہ اسلامیہ بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ فیصل آباد: 041-2931204

دار الاندلس غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور: 042-37242314

مکتبہ الحرمین کراچی: 0333-3030804

فہرست مضامین

عقیدہ کے مسائل

توحید اسماء و صفات کے مسائل

ایمان کے مسائل اور تارک الصلاۃ کا حکم

اصول فقہ کے مسائل

غیب کے مسائل

عذاب قبر کا بیان

طھارت کے مسائل

نماز کا بیان

روزوں کا بیان

زکاۃ کے مسائل

کتاب الحج

معاملات کا بیان

لباس کا بیان

طلاق اور ترکہ کا بیان

سنن اور بدعات کا بیان

ذکر اور دعا کا بیان

بعض کتب اور مصنفات کے بارہ میں

کھانے کی چیزوں کا بیان

حلال اور حرام کھیل

متفرق مسائل

اصول حدیث' علل حدیث اور اسماء رجال کا بیان

رواۃ کے حالات کی پہچان

احادیث کے علل اور روایات پر نقد کا بیان

عورتوں کے مخصوص مسائل

حج بیت اللہ اور عمرہ کے متعلق چند اہم فتاویٰ

حرفِ چند

یارب لك الحمد كماينبغي لجلالك وعظيم سلطانك والصلاة والسلام على محمد ﷺ عبدك ورسولك: امابعد!

دین اسلام کو اللہ رب العالمین نے بہت ساری خصوصیات سے نوازا ہے اور جس قدر اللہ رب العالمین نے اس دین کو محفوظ فرمایا ہے اتنا کسی اور مذہب کو محفوظ نہیں فرمایا۔ کیونکہ اس دین کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ رب العالمین نے اٹھایا ہے۔

فرمان الٰہی ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ [الحجر: ۹]

''اس ذکر کو ہم نے ہی نازل فرمایا ہے اور اس کے محافظ بھی ہم ہی ہیں۔''

اب اگر اس دین کو صرف کتابوں تک یا ایک مخصوص طبقے تک مختص کر دیا جاتا تو اس دین کا بھی وہی حال ہوتا جو دوسرے سماوی ادیان و مذاہب کا ہوا کہ وہ ادیان اپنی اصل حالت و شکل کھو بیٹھے ہیں لیکن چونکہ اس دین کی حفاظت کا ذمہ اللہ رب العالمین کا تھا تو اس وجہ سے اللہ رب العالمین نے اس دین کو محفوظ کرنے کے لیے ہر زمانے میں ایسی نابغہ روزگار ہستیاں پیدا فرمائیں کہ جنہوں نے اپنے وقت میں دم توڑتی دینی سرگرمیوں اور دینی علم کی نئے سرے سے آبیاری فرمائی اور ہر دور میں اپنے علمی مقام سے اس دین کو کماحقہ زندہ رکھنے کی جہد بے نظیر فرماتے رہے۔

نبی علیہ السلام جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو طرح طرح کے فتنوں نے جنم لینا شروع کیا اور اس دین میں لوگوں نے من چاہی اشیاء کا اضافہ کرنا چاہا۔ اس دین کی اصل ہیئت کو بدلنے کی کوشش کرنے لگے تو یہ دین کے مبلغین اور خدام ان کے مقابلے میں سیسہ پلائی دیوار بن گئے۔

آپ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد تابعین پھر تبع تابعین اور پھر محدثین کرام نے اس دین کی حفاظت کے لیے اپنے لیل ونہار ایک کر دیے اور اپنے علمی وقار سے ہر اس باطل کا مقابلہ کیا جس نے اس دین میں ذرہ برابر بھی شک پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اپنے مال، جان اور قلم سے ان کے خلاف جہاد کیا اور ہر میدان میں ایسے لوگوں کو شکست فاش دی۔

وقت اپنی رفتار میں بہتا رہا۔ وقت کے ساتھ کبھی امام بخاری، کبھی امام حاکم، کبھی ابن ابی حاتم، کبھی نووی، کبھی ابن حجر، کبھی سیوطی، کبھی میاں نذیر حسین، کبھی شاہ ولی اللہ، کبھی شاہ اسماعیل شہید جیسی ہستیاں اس دین کی حفاظت کے لیے اس دنیا میں آتی رہیں۔ جنہوں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس دین کی حفاظت میں اپنا اپنا حصہ ڈالا۔

انہی نابغۂ روزگار ہستیوں میں البانیہ کے علاقے میں پیدا ہونے والی ایک شخصیت فضیلۃ الشیخ محدث العصر محقق الحدیث حافظ الحدیث عظیم محقق عظیم نقاد الشیخ ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ ونور اللہ مرقدہ وجعل الجنۃ مثواہ بھی ہیں۔

موصوف کسی تعارف کے محتاج نہیں کیونکہ علم حدیث کے متعلق جو کام آپ نے کیا ہے اور احادیث کی تحقیق وتخریج کا کام آپ نے کیا وہ صرف اور صرف آپ کا ہی خاصہ ہے اور آپ کے بعد آنے والے جتنے بھی محقق ہیں تمام کے تمام آپ کی اس علمی کاوش کے محتاج ہیں۔ آپ بے مثال عالم، بلند پایۂ محقق تھے اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دین اسلام کے لیے وقف کر چکے تھے۔ دنیا کے ہر کونے میں آپ کے مداح ہیں، اس لیے آپ جہاں بھی جاتے تو لوگ انتہائی اشتیاق اور عقیدت سے آپ سے ملنے آتے اور یوں وہیں علمی مجالس جم جاتیں اور لوگ آپ کی زبان سے احادیث مصطفیٰ کے وہ انمول موتی چنتے جو بہت کم لوگوں کا خاصہ ہے۔ سوال وجواب کی نشست لگ جاتی اور آپ صحیح قرآن وسنت کی روشنی میں لوگوں کے سوالوں کا کافی وشافی جواب دیتے، اس وقت جو آپ کے ہاتھوں میں فتاویٰ البانیہ کے نام سے موجود ہے۔

فتویٰ اصل میں فتیا سے ہے جس کا معنی ہوتا ہے رائے دینا اور مسائل کے جوابات میں بھی ایک مفتی اپنی رائے دیتا ہے اور اس پر قرآن وسنت سے اپنا فہم پیش کرتا ہے اس لیے اسے فتویٰ کہا جاتا ہے۔

فتویٰ کے بانی اول خود اللہ رب العالمین ہیں کیونکہ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اللہ رب العالمین نے فتویٰ کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے جیسا کہ سورۃ النساء میں اللہ رب العالمین کا ارشاد گرامی ہے:

﴿يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ﴾ [النساء:۱۷۶]

''یہ لوگ آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں انہیں کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔''

اور ایک دوسرے مقام پر اللہ رب العالمین نے یوں فرمایا:

﴿وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ﴾ [النساء:۱۲۷]

''وہ آپ سے عورتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ خود اللہ تمہیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔''

تو ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے مفتی اور بانی اول خود اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں اور قرآن میں اور بھی جگہوں پر یسئلونك یا اس جیسے اسلوب سے مسائل بیان کیے گئے ہیں جو کہ فتاویٰ کی ہی ایک صورت کی غمازی کرتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے بعد نبی کریم ﷺ اس مقام ومرتبے پر فائز ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بعد آپ ﷺ ہی مفتی اعظم ہیں اور آپ ﷺ جب اس مرتبے پر فائز ہیں تو آپ ﷺ کا طرۂ امتیاز یہ رہا کہ آپ ﷺ لوگوں کے تمام مسائل کا جواب وحی الٰہی کی روشنی میں دیتے جس کی گواہی خود اللہ رب العالمین نے قرآن میں دی ہے کہ نبی ﷺ اپنی طرف سے کچھ نہیں بولتے وہ جو بھی بیان کرتے ہیں وہ وحی الٰہی ہی ہوتا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اپنے تمام مسائل خود یا کسی کے ذریعے بارگاہ رسالت میں پیش

فرماتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر ہمارے مسائل کا پرامن حل کہیں سے مل سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف بارگاہ رسالت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے وہ بخوبی واقف تھے:

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ﴾[النساء: ۵۹]

کہ اگر تنازع کا حل کہیں سے مل سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بارگاہ سے ہی مل سکتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بہت بڑی جماعت اس مرتبہ عظیم پر فائز ہوئی۔ جن میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت علی، حضرت عائشہ، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر، حضرت ام سلمہ، حضرت انس، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابوسعید الخدری، حضرت عثمان بن عفان، حضرت حذیفہ، حضرت ابوموسیٰ الاشعری، حضرت زبیر بن عوام، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوالدرداء، حضرت ابوذر غفاری، حضرت ام حبیبہ، حضرت نعمان بن بشیر، حضرت خالد بن ولید، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت ابوایوب انصاری، حضرت جعفر بن ابوطالب، حضرت فاطمۃ الزہراء، حضرت عمار بن یاسر، حضرت سعد بن معاذ وغیرھم رضی اللہ عنہم قابل ذکر ہیں اور یہ تعداد تقریباً ڈیڑھ سو صحابہ تک پہنچتی ہے کہ جو اس مرتبہ پر فائز ہوئے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دور گزرا تو ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا دور آیا تو اس دور میں جو حضرات اس عظیم مرتبے پر فائز ہوئے ان میں حضرت سالم بن عبداللہ، نافع موفی ابن عمر، سعید بن المسیب، سعید بن جبیر، حسن بصری، سلمان سیار رحمہم اللہ قابل ذکر ہیں۔

تابعین اور تبع تابعین کے دور کے بعد محدثین کرام اور ائمہ اربعہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ ائمہ اربعہ میں سے امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کی تو کتابیں بھی معروف ہیں جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے کتب فقہیہ میں اقوال موجود ہیں۔

ائمہ اربعہ کے بعد محدثین میں سے امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام علی بن

المدینی، ابوزرعۃ الرازی، امام نسائی، امام ترمذی، امام حاکم، ابن خزیمہ ﷭ اور دوسرے بہت سارے محدثین نے یہ مسند سنبھالی۔ جہاں سے وہ لوگوں کو علم بھی سکھاتے اور ان کے مسائل بھی حل فرماتے تھے۔ ان محدثین کے بعد علامہ ابن حجر، علامہ ابن حزم، علامہ ابن قدامہ المقدسی، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ، شیخ الاسلام علامہ ابن القیم الجوزی ﷭ وغیرھم کا دور شروع ہوا۔

ان حضرات نے بھی اپنے اپنے ادوار میں اس مسند کو سنبھالا اور فن فتاویٰ اور لوگوں کے مسائل حل کے لیے کئی کتابیں تصنیف فرمادیں۔ ان میں قابل ذکر المحلی، المغنی، زادالمعاد، اعلام الموقعین، ادب المفتی والمستفتی، التمہید اور فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ ہیں۔

پھر ان حضرات کے بعد بھی بہت سارے اہل علم آئے جنہوں نے اس فتاویٰ کی مسند کو سنبھالا اور اس بارِگراں کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور اللہ کی مدد ونصرت کے سہارے لوگوں اور دین کی خدمت میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔

مسند فتاویٰ کی اہمیت:

موجودہ دور میں فتویٰ دینا اور فتویٰ لگانا سب سے آسان کام سمجھ لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں بے لگام محققین کی بہتات ملے گی جو ایک ہی فتوے میں جس کو چاہیں جنتی بنادیں یا جس کو نار جہنم کا نوالہ، جس کو چاہیں پکا مومن ثابت کردیں اور جس کو چاہیں کفر کی انتہا کو پہنچادیں۔ دراصل ایسے مفتیان کرام نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان کے مصداق ہیں کہ عنقریب ایسے لوگ آئیں گے جو فتویٰ دیں گے جو خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے اور یہی آج کل ہو رہا ہے۔" الامن رحم ربی"

مسند فتاویٰ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کرنا چاہیے کہ اس مسند کے بانی اول اللہ تبارک وتعالیٰ خود ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر جناب محمد مصطفی ﷺ کو اس مسند عظیم پر فائز فرمایا اور آپ ﷺ کے بعد جو بھی اس مسند پر بیٹھتا ہے گویا کہ وہ

اللہ رب العالمین کا نائب، خلیفہ ہوتا ہے۔ کیونکہ مفتی جب کسی مسئلے کے بارے میں فتویٰ صادر کرتا ہے تو گویا کہ وہ مستفتی کو ایک شرعی حکم بتا رہا ہوتا ہے اور اس فتوے کے آخر میں اس کے دستخط یا مہر اس بات کی غماز ہوتی ہے کہ گویا کہ یہ فیصلہ اللہ رب العالمین کا ہے۔ اس لیے ایک مفتی پر یہ بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مکمل تحقیق اور اطمینان کے بعد فتویٰ دے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ انجانے میں بہت بڑی غلطی کا مرتکب ہو جائے۔

جو حضرات اس مسند پر فائز ہیں، انہیں ایسی کتب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے کہ جن میں ان تمام آداب کا احاطہ کیا گیا ہے کہ جو ایک مفتی کے لیے بہت ضروری ہیں۔ ان کتابوں میں سے خصوصی طور پر شیخ الاسلام علامہ ابن القیم رحمہ اللہ کی اعلام الموقعین اور الشیخ حافظ علامہ ابن الصلاح کی کتاب ''ادب المفتی والمستفتی'' قابل ذکر ہیں۔

ان حضرات نے اپنی ان کتابوں میں ایک مفتی کے لیے کیا کیا ضروری ہے اور ایک مستفتی کے لیے کیا کیا ضروری ہے وہ تمام چیزیں بیان کی ہیں۔ ان حضرات نے اپنی کتاب میں مسند فتاویٰ کی اہمیت کو بھی بہت اجاگر کیا ہے اور سلف صالحین سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ حضرات فتویٰ دینے میں کس قدر احتیاط کا دامن تھامتے تھے۔ حتی کہ یہاں تک نوبت آ جاتی کہ ایک شخص جب کسی سے مسئلہ پوچھتا تو وہ دوسرے اہل علم کے پاس بھیج دیتا، وہ تیسرے اور وہ چوتھے کے پاس بھیج دیتا اور وہ سائل گھوم کر اسی پہلے عالم کے پاس آ جاتا جس سے اس نے سب سے پہلے سوال کیا تھا اور وہ ایسا صرف اور صرف اس بات کے ڈر کی وجہ سے کرتے تھے کہ وہ جانتے تھے کہ مسند فتاویٰ بہت عظیم ہے اور کہیں وہ سائل کو غلط مسئلہ نہ بتا بیٹھیں اور بارگاہ الٰہی میں مجرم بن جائیں۔ اس لیے مسند فتاویٰ ایک بہت عظیم مسند ہے۔

اب ہم کچھ معروف فتاویٰ جات جو اہل علم نے تصنیف فرمائے یا بعد میں آنے والے ان کے جانشینوں نے جمع فرمائے کا تذکرہ کرتے ہیں۔

1- الفتاویٰ الطرسوسیہ یا انفع الوسائل الی تحریر المسائل، للشیخ نجم الدین الطرسوسی۔ م 758ھ

2- فتاویٰ البزازیہ، لابن البزازی۔ م985ھ

3- الفتاویٰ الزینیۃ، لابن نجیم۔ م970ھ

4- الفتاویٰ الخیریہ لنفع البریۃ، لخیرالدین الرملی۔ م1081ھ

5- الفتاویٰ الانقرویۃ، لمحمد بن الحسین الانقروی۔ م1098ھ

6- مجموعہ الفتاویٰ، للشیخ الاسلام ابن تیمیہؒ۔ م728ھ

7- فتاویٰ للجنۃ، دارالافتاء سعودی عرب

8- فتاویٰ نواب صدیق حسن خان

9- فتاویٰ نذیریہ، حضرت مولانا میاں نذیر حسین دہلویؒ۔ م1902ء

10- نورالعین من فتاویٰ الشیخ حسین الیمنی۔ م1327ھ

11- فتاویٰ مولانا شمس الحق عظیم آبادی۔ م1911ء

12- فتاویٰ سعیدیہ، للشیخ محمد سعید بنارسی

13- فتاویٰ مولانا عبداللہ غازی پوریؒ

14- فتاویٰ غزنویہ، للشیخ عبدالجبار غزنوی

15- فتاویٰ ثنائیہ، للشیخ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ

16- فتاویٰ اہل حدیث، للشیخ حافظ عبداللہ محدث روپڑیؒ

17- فتاویٰ ستاریہ، للشیخ حافظ عبدالستار دہلوی

18- فتاویٰ سلفیہ، للحافظ محمد اسماعیل السّلفی

19- اسلامی فتاویٰ، مولانا عبدالسلام بستویؒ

20- فتاویٰ احکام ومسائل، للشیخ حافظ عبدالمنان نورپوریؒ

21- فتاویٰ علمائے اہل حدیث، للشیخ ابوالحسنات علی محمد سعیدیؒ

22- فتاویٰ رفیقہ، مولانا محمد رفیق پسروری

23- فتاویٰ برکاتیہ، للشیخ ابوالبرکات احمد مدراسی

24- فتاویٰ اصحاب الحدیث، حافظ عبدالستار حماد صاحب ﷾

25- فتاویٰ محمدیہ، حضرت العلام مفتی عبیداللہ خان عفیف

26- فتاویٰ ثنائیہ مدینہ، للشیخ حافظ ثناء اللہ مدنی ﷾

27- فتاویٰ علمیہ، المعروف توضیح الکلام، للشیخ زبیر علی زئی ﷾

28- فتاویٰ الدین الخالص، فضیلۃ الشیخ ابومحمد امین اللہ پشاوری ﷾

29- آپ کے مسائل اوران کا حل، ابوالحسن مبشراحمد ربانی ﷾

30- فتاویٰ سماحۃ الشیخ ابن باز ﷫

31- فتاویٰ راشدیہ، ازمحب اللہ شاہ راشدی

یہ تو تھے وہ فتاویٰ جات جومطبوعہ ہیں اورحق کے متلاشی لوگوں کی دنیا کے اطراف واکناف میں پیاس بجھارہے ہیں۔ اب چند ایک ان فتاویٰ کا تذکرہ کرتے ہیں کہ جو غیرمطبوعہ ہیں اورقدیم کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

1- الفتاویٰ الکبریٰ و''الفتاویٰ الصغریٰ'' لحسام الدین السدرالشہید۔م536ھ

2- التجنیس والمزید للمرغینانی۔م592ھ

3- فتاویٰ التمرتاشی۔م610ھ

4- الفتاویٰ الولوالجیۃ للولواجی۔م710ھ

5- فتاویٰ القاسم بن قطوبغا۔م879ھ (احکام ومسائل للربانی)

فتاویٰ البانیہ دراصل امام البانی کے مختلف فتاویٰ جات کا مجموعہ ہے، جسے نظم الفرائد اور سلسلہ صحیحہ اور ضعیفہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ فتاویٰ انتہائی ان تھک کوشش کے بعد جمع وترتیب کیے گئے ہیں، اس کے بعد آئندہ جلد پر کام جاری ہے جو کہ اہل علم کی پیاس بجھانے میں کارآمد ہوگی جو کہ تفصیلی ہوگی۔ ان شاء اللہ اور اس کے بعد فتاویٰ ابن حزم اور فتاویٰ ابن تیمیہؒ قارئین کی خدمت میں پیش ہوں گے۔ دعا ہے اللہ صحت دے اور دین کا کام لے لے۔ آمین

آخر میں اللہ رب العالمین کی بارگاہ ایزدی میں دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس فتاویٰ کو ہمارے لیے توشۂ آخرت بنائے اور اسلام اور اہل اسلام کے لیے مشعل راہ بنائے اور متلاشیان دین کے لیے سرچشمۂ ہدایت بنائے۔

اور جتنے جملہ معاونین ہیں اللہ رب العزت اس کو تمام کے لیے ذریعہ نجات بنائے اور آخرت میں اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ شیخ ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ کی ان جملہ حسنات کو قبول و منظور فرمائے اور ان کے لیے نجات کا باعث بنائے۔ آمین

آخر میں قارئین اور اہل علم کی خدمت میں استدعا ہے کہ اگر اس کتاب میں کوئی کمی ہو یا کوئی رائے یا مشورہ ہو تو ضرور اطلاع فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں تاکہ اس کی کمی بیشی کو دور کیا جاسکے۔

احقر العباد العبد الآثم
راشد حسن صوفی (بیرانی)
فاضل مرکز التربیۃ الاسلامیہ فیصل آباد
مدرس جامعہ بحر العلوم السّلفیہ میرپور خاص سندھ
0333,2884686

تعارف علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ

اسم گرامی:

آپ کا اسم گرامی محمد ناصر الدین بن نوح نجاتی ہے۔ آپ کل 6 بھائی تھے اور تمام بھائیوں کا نام آپ کے والد محترم نے محمد رکھا تھا اور پھر فرق کرنے کے لیے ایک نام اور ساتھ لگا دیا تاکہ تمام بھائیوں میں امتیاز ہو سکے۔ اس طرح آپ کا پورا نام محمد ناصر الدین تھا۔

آپ کی پیدائش:

علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ 1914ء کو البانیہ کے دار الحکومت اشقودر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم نوح نجاتی البانی اپنے وقت کے بہت بڑے حنفی فقیہ تھے۔

تعلیم و تربیت:

آپ جس وقت پیدا ہوئے اس وقت البانیہ میں شاہ احمد زوغ نامی شخص کی حکومت تھی۔ اس شخص نے البانیہ میں مغربی تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانا چاہا تو البانیہ میں دینی طبقے کے لیے مشکلات کھڑی ہو گئیں۔ ان حالات کو دیکھ کر آپ کے والد محترم نے اپنے بچوں کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے دمشق کی طرف ہجرت کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

اس طرح آپ اپنے والد کے ہمراہ البانیہ سے شام آ گئے۔ اسی لیے علامہ البانی اپنے والد محترم کے لیے یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اللہ میرے والد محترم کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے شام کی طرف ہجرت کر لی۔ اگر میں البانیہ میں رہتا تو بہت بڑا جاہل انسان بن جاتا۔

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اپنی تعلیم کی ابتدا جمعیت اسعاف الخیریہ کے سکول سے کی۔ بعدازاں اپنے والدمحترم جو کہ حنفی المسلک اور بہت بڑے فقیہ بھی تھے،سے دینی تعلیم شروع کی۔آپ کے والد چونکہ حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے،اس لیے وہ آپ کو بھی ایک حنفی عالم بنانا چاہتے تھے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

شیخ البانی رحمہ اللہ نے علامہ رشید رضا بصری کی جب ''المنار'' کا مطالعہ فرمایا تو آپ کے دل میں علم حدیث کے متعلق تڑپ پیدا ہوئی اور پھر آپ نے علامہ غزالی کی احیاء العلوم کی تخریج و تحقیق کا کام کیا تو آپ کے والد کو یہ بات بہت شاق گزری کیونکہ وہ آپ کو حنفی بنانا چاہتے تھے۔اس لیے آپ کو طعنہ دینے لگے کہ یہ تو مفلس لوگوں کا کام ہے اور آپ کو مجبور کرنے لگے کہ آپ یہ کام چھوڑ دیں۔شیخ البانی رحمہ اللہ کے انکار پر آپ کو گھر سے نکال دیا گیا اور آپ قرآن وسنت کی محبت میں گھر سے دستبردار ہو گئے۔

آپ کے والد محترم گھڑی ساز تھے۔اس لیے شیخ البانیؒ نے یہ ہنر بھی اپنے والد سے حاصل کر لیا تھا۔آپ اپنا بیشتر وقت دمشق کے مکتبہ المکتبۃ الظاہریہ میں گزارتے اور دن میں صرف تین گھنٹے کام کرتے تھے اور اکثر وقت مکتبہ میں گزارتے۔آپ کے ذوق مطالعہ کو دیکھ کر مکتبہ کے مالکان نے مکتبہ کی ایک چابی آپ کو عنایت فرمادی تھی۔اس لیے آپ ہی مکتبہ کو کھولتے اور مکتبہ کا عملہ آپ کے بعد پہنچتا تھا۔اس مکتبہ میں تقریباً دو ہزار مخطوطات تھے۔علامہ البانی رحمہ اللہ نے نہ صرف ان مخطوطات کو پڑھا بلکہ ان کی ایک جامع فہرست بھی تیار کی اور یہ کام شیخ البانی رحمہ اللہ نے تن تنہا فرمایا۔

آپ کی علمی خدمات:

شیخ البانی رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے جو ملکہ عطا فرمایا تھا وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا ہے۔آپ واقعی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عظیم شاہکار تھے۔علم حدیث کی جو خدمت آپ نے کی ہے محدثین کے بعد ویسی مثال ملنا ہی مشکل ہے۔آپ کی مؤلفات و تعلیقات کی تعداد دوسو سے زائد ہیں۔آپ کی چند کتب جو کہ مشہور ہیں وہ یہ ہیں۔

1- سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ
2- سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ والموضوعہ
3- صحیح وضعیف سنن اربعہ
4- مختصر جامع صحیح البخاری
5- تمام المنۃ
6- جلباب المرأۃ المسلمۃ
7- ارواء الغلیل
8- صحیح وضعیف الادب المفرد للبخاری
9- صحیح الترغیب والترہیب
10- آداب الزفاف
11- صحیح الجامع الصغیر
12- نمایۃ المرام فی تخریج احادیث الحلال والحرام
13- تحذیر المساجد من اتخاذ القبور المساجد
14- التوسل انواعہ واحکامہ

علامہ البانی رحمہ اللہ بحیثیت مدرس اور داعی:

علامہ البانی رحمہ اللہ کو صرف تصنیف و تالیف سے ہی شغف نہیں تھا بلکہ آپ ایک بہترین مدرس اور ایک بہترین داعی تھے۔ قلم کے ساتھ ساتھ آپ نے زبان سے بھی حدیث کی خدمت فرمائی۔ باطل عقائد کے حامل افراد سے آپ نے درجنوں مناظرے کیے اور مختلف علاقوں میں دعوتی اور تبلیغی دورے کیے۔ آج بھی شیخ البانی رحمہ اللہ کے ہزاروں دروس کیسٹوں میں محفوظ ہیں۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں آپ تین سال تک بطورِ مدرس خدمت سرانجام دیتے رہے۔ وہاں آپ کو طلباء کا ایک وسیع حلقہ میسر آیا اور کئی نامور شخصیات آپ کی

شاگرد بنیں۔جن میں علامہ احسان الٰہی ظہیر شہیدؒ، شیخ مقبل بن ہادی، شیخ ربیع بن ہادی مدخلی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔وفات سے قبل آپ نے اپنی ساری کتب مکتبہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے نام کردی تھیں۔تاکہ دنیا کے ہر کونے سے آنے والے طلباء اور اہل علم اس سے استفادہ کرسکیں۔

ابتلاء و آزمائش:

یہ تو دنیا و اہل دنیا کا دستور رہا ہے کہ جب بھی کوئی شخص صحیح دین کی آواز لے کر اٹھا تو اہل دنیا کو یہ بات ہضم نہ ہوئی اور ایسے لوگوں پر دنیا کو تنگ کرنے کی جہد میں لگ جاتے ہیں۔کلمۂ حق کہنے کی پاداش میں آپ کو بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔حکومت شام نے دو مرتبہ آپ کو جیل بھیجا۔جیل میں بھی آپ نے اس دعوت و تبلیغ کے کام کو جاری رکھا۔آپ کو دمشق کی القلعہ نامی جیل میں بھی ڈالا گیا۔یہ وہ تاریخی جیل ہے کہ جس میں شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو بھی قید کیا گیا تھا۔

وفات حسرت آیات:

شیخ البانی ،عالم ربانی رحمہ اللہ والباری 22 جمادی الآخر 1420ھ بمطابق 1999ء کو اردن کے شہر عمان میں اس دار فانی سے کوچ فرما گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ نے عصر اور مغرب کے درمیانی وقت میں وفات پائی اور آپ کی وصیت کے مطابق گھر کے قریبی قبرستان میں نماز عشاء کے فوراً بعد دفن کردیئے گئے۔ایسا آپ کی وصیت کے مطابق کیا گیا کہ آپ کی میت کو زیادہ دیر تک نہ رکھا جائے اور جلد ہی دفن کر دیا جائے۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ

ابو انیس حافظ ثناء اللہ تبسم (بیرانی)

(فاضل جامعہ بحر العلوم السلفیہ)

مقدمہ

فتویٰ نویسی اور اس کے احکام

حروف الفتویٰ: فتویٰ کے اصل حروف ف، ت اور ی ہیں۔ لفظ فتویٰ کے دو معنی ہیں:

ا۔ طراوت و تروتازگی۔ ۲۔ حکم بیان کرنا۔

ا۔ امام اللغة ابوالحسین بن فارس بن زکریا المتوفی ۳۹۵ھ لکھتے ہیں:

الفتى : الطرى من الابل ...... والإصل الآخر الفُتيا : يقال : أفتى الفقيه فى المسألة اذابين حكمها واستغيث، اذا سألت عن الحكم قال الله تعالىٰ ﴿ يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ﴾ [النساء : ۱۷٦] ويقال منه فتوى و فتيا۔

[معجم مقاييس اللغة ص ۸۰٦، ط: دار احياء التراث العربى بيروت]

”تروتازہ جوان اونٹ ...... اور اس کی دوسری اصل فتیا ہے، کہا جاتا ہے فقیہ نے اس مسئلہ میں فتویٰ دیا، جب وہ اس کا حکم اچھی طرح بیان کر دے۔ جب تو شرعی حکم کے بارے میں سوال کرے تو استغیث بولتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں کہہ دیجیے اللہ تمھیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔“ اور اسی سے فتویٰ اور فتیا بھی کہا جاتا ہے۔“

۲۔ علامہ مجد الدین ابی السعادات المبارک بن محمد الجزری المعروف بابن الأثیر المتوفی ٦۰٦ھ راقم ہیں:

”يقال افتاه المسئلة يفتيه اذا اجابه والاسلم الفتوى۔“

[النهاية فى غريب الحديث والأثرص ۳٤۲، ط۔ دارالمعرفة بيروت]

"جب سوال کا جواب دیا جائے تو افتی، یفتی بولا جاتا ہے اور اس کا اسم الفتویٰ ہے۔"

۳۔ علامہ ابوالفیض السید محمد مرتضیٰ الزبیدی نے لکھا ہے:

" أفتاه الفقيه فى الأمر الذى سيشكل : أبانه له ويقال أفتيت فلا نا فى رؤيا راها اذا عبرتهاله۔ وأفتيته فى المسألة اذا أحببته عنها ومنه قوله تعالى:﴿يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلَالَةِ﴾ والفُتيا والفتوى بضمها وتفتح الأخيرة ماأفتى به الفقيه فى المسألة۔ قال الراغب : هو الجواب عمايشل فيه من الأحكام۔"

[تاج العروس من جواهر القاموس ۲۰ / ۳۸ط۔ دارالفکر بیروت]

"فقیہ نے اسے مشکل امر کے بارے میں فتویٰ دیا، یعنی اس کے لیے اسے واضح کیا جب تم کسی کے خواب کی تعبیر بیان کرو تو کہا جاتا ہے کہ تم نے فلاں شخص کو اس کے خواب کے بارے میں جو اس نے دیکھا ہے فتویٰ دیا ہے۔ جب کسی سوال کا جواب دیں تو کہا جاتا ہے میں نے اسے فلاں مسئلہ میں فتویٰ دیا۔ اسی سے اللہ کا فرمان ہے:" کہہ دیجیے اللہ تعالیٰ تمھیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔" فتیا اور فتویٰ فاء کے ضمہ کے ساتھ دونوں کو پڑھا جاتا ہے اور آخر الذکر کو فتح کے ساتھ (فتویٰ) بھی پڑھا جاتا ہے۔ یہ اس وقت کیا جاتا ہے جب فقیہ کسی مسئلہ میں فتویٰ دے۔ امام راغب اصفہانی نے کہا ہے مشتبہ اور مشکوک احکام میں حکم کو کھول کر بیان کرنے اور جواب دینے کا نام فتویٰ ہے۔"

۴۔ علامہ ابن سید المرسی الاندلسی المتوفی ۴۵۸ھ تحریر کرتے ہیں:

" والفتوى والفتيا : ماأفتى به الفقيه وقد حكيت الفتوى

وھی قلیلة۔" [المخصص ۲۱٤/۷، ط : دارالکتب العلمیة، بیروت]

دوسری جگہ رقمطراز ہیں :

" افتیت فی الأمر : ابنته وھی الفتیا والفتوی والفتوی۔ "

[المخصصی ۵/ ۵۸۰، ط: دارالکتب العلمیة، بیروت۔]

ایک اور مقام پر قلمبند کرتے ہیں :

" والفتیا والفتوی والفتوی : ماأفتی به الفقیه الفتح فی الفتوی لأھل المدینة۔"

[الحکم والمحیط الاعظم ۵۲٤/۹، ط : دارالکتب العلمیة]

۵۔ ابوالفضل قاضی عیاض بن موسیٰ الیحصبی المتوفی ۵۴۴ھ فرماتے ہیں :

" الفتوی بفتح الفاء والواو واصله السؤال ثم سمی الجواب به قال الله ﴿يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ﴾ (النساء : ۱۷٦) وقال ﴿فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ﴾ [الصافات : ۱٤۹] أی سلهم۔"

[مشارق الأنوار ۲٤٤/۲، ط: دارالکتب العلمیة، بیروت۔]

" الفتویٰ لفظ فاء اور واو کے فتح کے ساتھ ہے اور اس کا اصل سوال کرنا ہے، پھر سوال کے جواب کے لیے متعین کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: '' آپ سے سوال پوچھتے ہیں کہہ دیں اللہ تمھیں جواب دیتا ہے'' اور مزید فرمایا: '' ان سے سوال کر کیا تیرے رب کے لیے بیٹیاں ہیں'' یعنی ان سے پوچھ۔''

٦۔ علامہ ابوعبید احمد بن الہروی المتوفی ۴۰۱ھ رقم طراز ہیں :

" قوله تعالی ﴿ فَاسْتَفْتِهِمْ﴾ أی : سلهم۔"

[الفریبن فی القرآن والحدیث ۱٤۱۰/۵، ط : المکتبة العصریه، بیروت]

'' اللہ کے فرمان کا معنی ہے ان سے سوال کر۔''

۷۔ علامہ محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر الرازی المتوفی ۶۶۰ھ تحریر کرتے ہیں:

" استفتاه فی مسألة فأفتاه والاسم الفتيا والفتوى وتفاتوا اليه ارتفعوا إليه في الفتيا۔"

[مختار الصحاح ص ۲۹۰، ط: داراحیاء التراث العربی، بیروت]

۸۔ علامہ ابوالقاسم جاراللہ محمود بن عمر الزمخشری المتوفی ۸۳۵ھ:

" وفلان من أهل الفتوى والفتيا۔ وتعالوا فناتونا وتفاتوا اليه: تحاكموا۔" [أساس البلاغة ص ۳۳٤ ط: دارالمعرفة، بيروت]

مذکورہ بالا ائمہ لغات کے حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مشتبہ، مشکل معاملہ میں عالم سے سوال کرنا اور عالم کا سوال کے جواب دینے اور مسئلے کی شرعی نوعیت کو کھول کر واضح کرنے کا نام فتویٰ ہے۔ اس کو فَتْوَی، فُتْوَی اور فُتْیَا بھی کہتے ہیں۔ اس کی جمع فتاوی اور فتاویٰ ہے اور فتویٰ جاری کرنے والے کو مفتی کہا جاتا ہے اور فتویٰ کے یہی معنی زیر بحث موضوع کے زیادہ مناسب ہے، کیونکہ لفظ ''مفتی'' اسم فاعل مفعل کے وزن پر ہے جیسے کہا جاتا ہے۔ أفتاه في الامر۔ مفتی نے سائل کے سوال کا حکم بیان کیا۔ أفتى الفقيه في المسئلة۔ فقیہ نے مسئلہ کا حکم بیان کیا۔

شرعی تعریف:

مفتی کی شرعی تعریف میں مختلف اقوال ہیں، دوقول زیادہ مشہور ہیں۔ الاول: مفتی وہ مجتہد مطلق ہوتا ہے جو پیش آمدہ مسائل میں لوگوں کی شرعی راہنمائی کی ذمہ داری قبول کرتا ہے اور قرآن کے عموم وخصوص اور ناسخ ومنسوخ وغیرہ کا علم رکھتا اور اس طرح حدیث میں بھی مہارت تامہ اور استنباط کے ملکہ کے ساتھ متصف ہو۔

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((لا يفتي الناس الا ثلاثة: رجل قد عرف ناسخ القرآن و منسوخه او أمير لا يجد بدأ او أحمق متكلف))

[الفقيه والمتفقه ۲/۳۳۱، ط: دارابن الجوزی ۲/۱۵٦، ۱۵۷]

''لوگوں کو صرف تین آدمی ہی فتویٰ دیتے ہیں۔ ایک وہ آدمی جو قرآن حکیم کے ناسخ و منسوخ کو پہچانتا ہے یا امیر جو کوئی چارہ نہ پائے یا بے وقوف تکلف برتنے والا۔''

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((لا یحل لأحد یفتی فی دین اللہ الا رجلاً عارفًا بکتاب اللہ بناسخه و منسوخه ویمحکمه ومتشابهه وتاویله وتنزیله ومکیه ومدینه وما أرید به وفیما أنزل ثم یکون بعد ذلك بصیراً بحدیث رسول اللہ ﷺ وبالناسخ والمنسوخ ویعرف من الحدیث مثل ام عرف من القرآن ویکون بصیرا باللغة، بصیرا بالشعر وما یحتاج الیه العلم والقرآن ویستعمل مع هذا الانصاف وقلة الکلام ویکون بعد هذا مشرفا علی اختلاف أهل الأمصار))

[الفقیه والمتفقه ۲/ ۳۳۱، ۳۳۲، ط: دار ابن الجوزی: ۲/ ۱۵۷]

''اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے میں کسی شخص کے لیے اس وقت تک فتویٰ صادر کرنا حلال نہیں جب تک وہ قرآن حکیم اور اس کے ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، تاویل و تنزیل، مکی و مدنی سورتوں اور ان کے معانی و مطالب اور اس کے بارے میں نازل کیا گیا کی پوری معرفت نہ رکھتا ہو، پھر اس کے بعد حدیث رسول ﷺ میں کمال بصیرت رکھنے والا ہو اور حدیث کے ناسخ و منسوخ اور کتاب اللہ کی طرح حدیث کے بارے میں مکمل معرفت نہ رکھتا ہو اور لغت و شعر کا بھی اس قدر ماہر ہو جو قرآن و سنت کے فہم کے لیے ضروری ہے۔ اس کے ساتھ انصاف اور قلت کلام پر عامل ہو مزید برآں مختلف علاقوں کے اصحاب علم کے اختلاف سے بھی آگاہی رکھنے والا ہو۔''

حافظ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت خطیب بغدادی المتوفی ۴۶۲ھ رقم طراز ہیں:

وہ مفتی جس کا فتویٰ قبول کرنا لازم آتا ہے اس کے اوصاف یہ ہوں:

۱۔ بالغ ہو اس لیے کہ بچے کے قول کا کوئی حکم نہیں۔

۲۔ عاقل ہو۔ اس لیے کہ مجنون سے عدم عقل کی وجہ سے قلم اٹھا دیا گیا ہے۔

۳۔ ثقہ عادل ہو۔ اس لیے کہ احکام دین میں فاسق کے غیر مقبول الفتوی ہونے میں علماء کرام کا اختلاف نہیں ہے۔ اگرچہ وہ اس کی بصیرت رکھنے والا ہو، خواہ وہ آزاد ہو یا غلام۔ صحت فتویٰ میں آزادی شرط نہیں ہے۔

۴۔ احکام شرعیہ کا عالم ہو۔ احکاماتِ شرعیہ کے اصول و فروع کے بارے میں اس کا علم وسیع ہو اور شرع میں احکام کے اصول چار ہیں۔

① اللہ کی کتاب کا علم۔ یعنی وہ قرآن کے محکم و متشابہ، عموم و خصوص، مجمل و مفسر اور ناسخ و منسوخ کا عالم ہو۔

② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابتہ کا علم رکھنے والا ہو، جو آپ کے اقوال و افعال پر مشتمل ہے اور تواتر و آحاد کے اعتبار سے اس کی اسانید اور صحت و فساد اور اس کے ورود کا سبب یا اطلاق جانتا ہو۔

③ سلف صالحین کے اجماعی مسائل اور جن میں انھوں اختلاف کیا ہو ان کا علم رکھتا ہو تا کہ اجماع کی پیروی کرے اور اختلاف کی صورت میں اجتہاد سے کام لے سکے۔

④ قیاس کا علم رکھتا ہو تا کہ وہ فروعی مسائل جن کے بارے میں نصوص شرعیہ میں سکوت ہے ان کو ایسے احکام پر لوٹا سکے جن کے بارے میں نص موجود ہے۔

[ملخص از الفقیہ و المتفقہ ۲/ ۳۳۰، ۳۳۱۔ دار ابن الجوزی ۲/ ۱۵۹]

الثانی: علامہ سبکی رحمہ اللہ وغیرہ کہتے ہیں کہ مفتی کے لیے مجتہد ہونا کوئی ضروری نہیں، بلکہ اس کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ اپنے امام کے مذہب کا متبحر عالم اور اپنے امام کی

بات کو سمجھنے والا ہو راجع مرجع، مرجوع عنہ اور مرجوع الیہ کا علم رکھتا ہو، گو وہ استنباط احکام کے ملکہ سے محروم اور کتاب وسنت کا تبحر نہ ہو اور ان کے مباحث و وجوہ میں کورا ہو، ان علماء کا کہنا ہے مفتی کے لیے اجتہاد مطلق کی شرط ایک ایسی شرط ہے جو بڑی نقصان دہ ہے اور لوگوں کو ان کی غیر شرعی خواہشات کے سپرد کرنے کے مترادف ہے، لہٰذا اگر مفتی اپنے مذہب کا ماہر ہے تو اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے اور عوام اس کے فتویٰ کو اللہ کا حکم سمجھ کر قبول کرلیں گے۔ منصب قضاء ہر حال میں منصب فتاء سے اہم تر اور مرکزی منصب ہے، لیکن اس میں باتفاق علماء قاضی کے لیے مجتہد ہونا ضروری نہیں سمجھا گیا تو پھر مفتی کے لیے اجتہاد کی شرط کو ضروری قرار دینا کوئی معقول وجہ نہیں۔ شیخ تاج الدین سبکی کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ سنی میں اجتہاد کی شرط کی ضرورت نہیں رہی اس کے لیے بس اپنے مذہب کا ماہر ہونا ہی کافی ہے۔

"قد انعقد الا جماع فی زماننا علی هذا النوع من انقياد"

[تعذيب الفروق ٢/١١٦]

راقم کہتا ہے کہ الافتاء کے منصب جلیل پر فائز شخص میں تین امور کا متحقق ہونا ضروری ہے۔

۱۔ اس کے ہر شرعی نصوص کا علم علی وجہ الصواب ہو، یعنی جس طرح شارع سے وہ علم صادر ہوا اس نہج پر ہو اغلاط، اَوہام اور کذب سے پاک ہو، اس لیے کہ نصوص شرعیہ کا علم فقہ اسلامی کا مادہ ہے تو ضروری ہے کہ اَغلاط، اَخلاط اور اَملاط سے صاف ستھرا اور محفوظ ہو۔

اور ذخیرہ احادیث میں صحت وسقم کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو تاکہ فتویٰ دیتے ہوئے احادیث صحیحہ وحسنہ کو بطور احتجاج پیش کرے، مناکیر وغیرہ سے اجتناب کرے۔

۲۔ فہم ثاقب رکھتا ہو۔ شرعی نصوص کو سمجھنے میں اس کی اصابت کی جانب خطا پر

غالب ہو۔

پیغمبر اسلام کے علاوہ معصوم عن الخطاء تو کوئی نہیں ہوتا، تاہم اگر کوئی سقیم الفہم ہو اور درستگی کے بجائے اغلاط اور کجی و کم فہمی کا عنصر غالب ہو تو وہ شرعی حکم کس طرح واضح اور برہن کر سکے گا۔

۳۔ مفتی صحیح الاعتقاد ہو۔ مبتدع، منافق اور مشرک نہ ہو۔ مستقیم السلوک ہو فاسق و فاجر نہ ہو۔ غلط عقیدے اور ہوائے نفسانی کا مارا ہوا شخص کتاب و سنت جو اصل الاصول ہیں کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔ جس شخص میں یہ امور ثلاثہ مجتمع ہوں وہ صحیح اسلامی مفتی اور فقیہ ہے ان تمام امور پر دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے۔

((نضر الله امرأ سمع منا حديثا فبلغه غيره ، فرب حامل فقه الى من هو افقه منه ، و رب حامل فقه ليس بفقيه))

[صحيح ابن حبان (٦٨٠) (٦٧) سنن ابی داؤد (٣٦٦٠) سنن الترمذی (٢٦٥٦)

مسند احمد ١٨٣/٥ ط قديم۔ ٤٦٧,٣٥ (٢١٥٩٠) ط۔ مؤسسة الرسالة۔

المحدث الفاصل (٤،٣) السنة لابن ابی عاصم (٩٤)]

اللہ تعالیٰ اس آدمی کو تروتازہ رکھے جس نے ہم سے حدیث سنی پھر اسے دوسرے لوگوں تک پہنچایا، پس ایسے بہت لوگ ہیں جو فقہ کو ایسے شخص کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں جو ان سے زیادہ فقیہ ہوتا ہے اور ایسے بہت لوگ ہیں جو فقہ کے حامل ہوتے ہیں لیکن فقیہ نہیں ہوتے۔''

اس نص صحیح میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی حدیث اور اس صحیح فہم کو فقہ سے تعبیر کیا ہے، لہٰذا صحیح فقیہ و مفتی وہ شخص ہے جسے نصوص شرعیہ کا علم اور صحیح فہم ہو، نصوص سے ناواقف اور فہم صحیح سے محروم شخص عہدہ افتاء کے لائق نہیں ہے۔

اسی طرح امام الانبیاء و المرسلین، سید الاولین، والاخرین شفیع الموحدین امام اعظم محمد ﷺ کا ایک اور ارشاد ذی شان ہے۔

((من یرد اللہ بہ خیرا یفقه فی الدین))

[صحیح البخاری (۷۱) صحیح مسلم ۱۰۳۷/۹۸ سنن الترمذی (۲٦٤۵) سنن ابن ماجة (۲۲۰، ۲۲۱) مسند احمد ۳۰٦/۱ ط قدیم۱۱/۵ (۲۸۹۰)]

"جس آدمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ کر لیتا ہے اسے دین کی سمجھ نصیب فرما دیتا ہے۔"

یہ نص صحیح اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ارادہ خیر یہ تفقہ فی الدین ہے۔ از لائے شرع جو چیز باب العلم میں خیر نہیں ہے وہ شرعاً فقہ نہیں ہے اور دین میں تفقہ خیر اور فقہ اتنی دیر تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کا مادہ صحیح شرعی نصوص نہ ہوں۔ موضوعات، واہیات، بدعات کے خرافات و ہفوات شر اور جہل کا مادہ ہے خیر وفقہ کا مادہ نہیں ہے۔

جب کسی شخص کو نصوص شرعیہ کی معرفت و پہچان ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ ان نصوص کے معانی ومفاہم وہی مراد لے جن کا شارع نے قصد کیا ہے اور اس کے مصالح و اہداف اور مسائل پر حکم شارع کی مراد کے خلاف نہ ہو، اس لیے کہ جو شخص شرعی نصوص کے مطالب و مقاصد اور مراد و مرام شارع کی مراد کے خلاف لیتا ہے، اسے مفتی وفقیہ کہلانے کا حق نہیں ہے بلکہ وہ شرع کی نظر میں سفیہ اور کم عقل ہے لہٰذا مفتی صحیح العقیدہ، نصوص شرعیہ کا ماہر اور مراد شارع سے باخبر اور صحیح وضعیف اور غث وسمین کی اچھی طرح جانچ پڑتال کا مادہ رکھتا ہو۔ ورع وتقویٰ، زہد و پرہیز گاری میں معروف اور محلی ہو۔ جن لوگوں کا اعتقاد وسلوک درست نہ ہو ان میں شرعاً خیریت کا مادہ نہیں ہوتا۔ اگر مبتدعین و اشرار اور فاسقین و ملحدین کو منصب افتاء سونپ دیا جائے تو وہ اسلامی عقائد اور فقہ اسلامی کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیں گے اور شرع کی منشا کے خلاف فتاوے صادر کر کے لوگوں کو ضلالت و گمراہی کا موجب ہوں گے اسی طرح محض مقلدین جن کے فتاوی کا ملجا و ماویٰ قول امام کے سوا کچھ نہیں اور وہ اپنے مذعوم امام کی آراء پر تفریع در تفریع کے مرتکب ہوتے چلے جاتے ہیں، حتیٰ کہ انہیں اپنے امام کے قول کا ماخذ نہ

بھی معلوم تو اپنے آپ کو اس کی تقلید کا پابند رکھتے ہیں۔ انھیں بھی مفتی کہلانے کا حق نہیں ہے۔ وہ شرعی مسائل میں اپنے آپ کو دلائل شرعیہ کا پابند نہیں سمجھتے۔

سید حسین احمد مدنی دیوبندی کہتے ہیں:

''امام صاحب سے متون تو منقول ہیں دلائل منقول نہیں، لہٰذا دلائل کا تسلیم کرنا ہم پر ضروری نہیں، اس سے مذہب حنفی پر کوئی زد نہیں آسکتی اور جو دلائل مذہب حنفیہ کے مطابق ہوں گے ہم ان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔'' (تقریر ترمذی صفحہ ۲۷ مرتب عبدالقادر قاسمی کتب خانہ مجیدیہ ملتان) لہٰذا ایسے افراد جو دلائل کو مذہب حنفیہ کے مطابق بنانے والے ہوں اور صحیح شرعی ادلہ سے چشم پوشی کرتے ہوں ان سے فتویٰ نہیں لینا چاہیے کیونکہ وہ جادۂ مستقیم سے دور اور اصل مأخذ سے کورا اور عاری ہے۔ علامہ سیوطی تو مقلدین پر علماء وفقہاء کا اطلاق کرنا جائز نہیں رکھتے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رقم طراز ہیں:

((و معلوم ان لفظ الفقهاء والعلماء انما يطلق على المجتهدين أما المقلد فلايسمى فقيها ولا عالماً كم نص عليه أهل الفقه والاصول وامتناع الطاق الفقيه والعالم على المقلدكامتناع اطلاق لفظ المسلم على اليهودى والنصرانى))۔

[الحاوى للفتاوى ۲/ ۱۲۵ ط۔ دارالكتب العلمية بيروت]

''اور یہ بات معلوم ہے کہ فقہاء اور علماء کا لفظ صرف مجتہدین پر بولا جاتا ہے۔ باقی رہا مقلد تو اس پر فقیہ اور عالم کا نام نہیں دیا جاتا جیسا کہ اس بات پر علمائے فقہ واصول نے نص کی ہے۔ مقلد پر فقیہ اور عالم کا لفظ استعمال کرنا اسی طرح منع ہے۔ جیسے یہودی اور نصرانی پر مسلم کے اطلاق کی ممانعت ہے، لہٰذا محض مقلد مفتی کہلانے کا حق دار نہیں ہے۔''

مفتی کا مقام:

اس منصب کی جلالت قدر اور رفعت منزلت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ خود حق تعالیٰ اپنے بارے میں فرماتا ہے:

﴿وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ﴾ [النساء : ۱۲۷]

"اور آپ سے خواتین کے بارے فتویٰ طلب کرتے ہیں آپ کہہ دیں! ان کے بارے اللہ تعالیٰ تمھیں فتویٰ دیتا ہے۔"

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ﴾ [النساء : ۱۷۶]

" آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں کہہ دیجیے کلالہ کے بارے اللہ تعالیٰ تمھیں فتویٰ دیتا ہے۔"

اشہب امام مالک سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

((كان النبي ﷺ يسأل فلا يجيب حتىٰ ينزل عليه الوحي وذلك في كتاب الله۔ قال الله تعالىٰ " يستفتونك قل الله يفتيكم في الكلالة" "ويسئلونك عن اليتامىٰ" "يسئلونك عن الخمر والميسر" ويسئلونك عن الجبال" هذا في كتاب الله سبحانه و تعالىٰ كثير .))

[احکام القرآن از ابوبکر ابن العربی صفحہ ۵۱۹ بتحقیق عبدالرزاق المہدی ط۔ دار الکتاب العربی]

نبی کریم ﷺ سے سوال کیا جاتا تھا تو آپ اس وقت تک جواب نہیں دیتے تھے جب تک وحی کا نزول نہ ہو جاتا۔ اور یہ اللہ کی کتاب میں ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: " آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں کہہ دیجیے اللہ تعالیٰ تمھیں کلالہ کے بارے فتویٰ دیتا ہے۔ اور آپ سے یتیموں کے بارے سوال کرتے ہیں۔ اور آپ سے شراب اور جوئے

کے بارے سوال کرتے ہیں۔ اور آپ سے پہاڑوں کے بارے سوال کرتے ہیں۔ یہ انداز اللہ کے قرآن میں بہت زیادہ ہے۔"

امام ابوبکر ابن العربی فرماتے ہیں: امام مالک نے جو فرمایا ہے ہم نے اسے قرآن حکیم میں (۱۳) مقامات پر پایا ہے۔

۱۔ ﴿ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ ﴾ [البقرة : ۲۱۷]

۲۔ ﴿ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ﴾ [البقرة : ۲۱۹]

۳۔ ﴿ مَاذَا يُنفِقُونَ ﴾ [البقره : ۲۱۹]

۴۔ ﴿ وَ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَى ﴾ [البقره : ۲۲۰۱]

۵۔ ﴿ وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ ﴾ [النساء : ۱۲۷]

۶۔ ﴿ يَسْئَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا ﴾ [النساء : ۱۵۳]

۷۔ ﴿ يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ﴾ [النساء : ۱۷۶]

۸۔ ﴿ يَسْئَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ ﴾ [المائده : ۴]

۹۔ ﴿ يَسْئَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ ﴾ [النازعات : ۴۲]

۱۰۔ ﴿ يَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ﴾ [الاحزاب : ۶۳]

۱۱۔ ﴿ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ ﴾ [الانفال : ۱]

۱۲۔ ﴿ وَيَسْئَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ﴾ [الكهف : ۸۳]

۱۳۔ ﴿ وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ ﴾ [طه : ۱۰۵]

۱۴۔ ﴿ وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ﴾ [البقره : ۲۲۲]

یہ ۱۳ کے بجائے ۱۴ مقامات ہیں جہاں پر اللہ تعالیٰ نے ﴿ يَسْئَلُونَكَ ﴾ اور ﴿ يَسْتَفْتُونَكَ ﴾ کا انداز اختیار کر کے بتا دیا ہے کہ لوگ محمد ﷺ سے سوال و فتویٰ طلب کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ آپ پر وحی نازل فرما کر اس سوال کا جواب اور فتویٰ دے دیتا۔

اس لیے فتویٰ دینے کا مقام بڑا رفیع، عالی شان اور بلند مرتبہ ہے' کیونکہ مفتی لوگوں

کے لیے ان دینی امور کی وضاحت کرتا ہے جن کا انھیں علم نہیں اور ان صحیح راستوں کی طرف راہنمائی کرتا ہے جن پر چل کر وہ رشد و ہدایت، فوز و فلاح اور کامرانی و کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

مفتی حضرات علوم شرعیہ کے وارث، اور اسے لوگوں تک پہنچانے والے اور جہلاء کو اس کی تعلیم دینے والے اور اس کی مخالفت سے ڈرانے والے ہوتے تھے۔ علماء و مفتیان رسول اللہ ﷺ کے ورثہ علم کے جانشین ہوتے ہیں۔ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((ان العلماء ورثة الانبياء ان الانبياء لم يورثوا ديناراً ولا درهما انما ورثوا العلم فمن أخذ به أخذ بحظ وافر))

[ترمذی (٢٦٨٢) مسند الدارمی (٣٤٩) ابوداؤد (٣٦٤١) ابن ماجه (٢٢٣) شرح مشكل الآثار (٩٨٢) صحيح ابن حبان (٨٨) مسند الشاميين (١٢٣) شرح السنة (١٢٩) تهذيب الكمال ١٩/ ٣٧٥]

"یقیناً علماء انبیاء کے وارث ہیں، بے شک انبیاء انھیں دینار اور درہم کا وارث نہیں بنایا بلکہ علم شرعی کا وارث بنایا ہے جس نے اس علم کو لے لیا اس نے بہت زیادہ حصہ لے لیا۔"

لہٰذا مفتی شریعت اسلامیہ میں ایک عظیم منصب پر فائز ہے۔ کیونکہ وہ تبلیغ احکام، انذار و تبشیر میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے بھیجے ہوئے علم کا وارث اور جانشین ہے۔

شروط المفتی:

اگرچہ مفتی کی شروط کے بارے پیچھے ہم نے مختصر طور پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ، امام شافعی اور خطیب بغدادی رحمہ اللہ کے حوالے سے کچھ باتیں تحریر کر دی ہیں یہاں قدرے تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔

ا۔ اسلام:

منصب افتاء پر فائز ہونے کے لیے اولین شرط مفتی کا مسلمان ہونا ضروری ہے اور پھر ایسی ناگزیر شرط ہے جس پر علماء امت کا اجماع ہے۔ اس لیے کہ مفتی نے علوم شریعہ کی وارثت کا حق دار کرنا ہوتا ہے اور اللہ کے نبی ﷺ کی جانشینی کا حق ایک مسلم ہی ادا کر سکتا ہے غیر مسلم تو مسلم کا وارث نہیں ہو سکتا۔

[صفة الفتوی والمفتي والسمتفتي لابن حمدان صفحه۱۳]

۲۔ التکلف الاعظم:

منصب کو سنبھالنے والا شریعت کا مکلف عاقل و بالغ ہو کیونکہ بالغ اور پاگل کی بات کا کوئی شرعی حکم نہیں پاگل تو مرفوع القلم ہے اور نابالغ کی عقل و فکر پختہ نہیں ہوتی یہ شرط بھی اجماعی ہے۔

۳۔ العلم:

منصب افتاء پر فائز شخص کے لیے شرعی علم کا حاصل ہونا بھی اساسی شرط ہے کیونکہ وہ احکامات الٰہیہ کا مبلغ ہوتا ہے اور شرعی احکامات سے ناواقف اور نابلد تبلیغ کا ہرگز اہل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بغیر علم کے فتویٰ دینے پر بڑی وعیدیں ذکر کی ہیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((من تقول علی مالم اقل فلیتبوأ مقعده من النار ومن استشاره اخوه المسلم فأشار الیه بغیر رشد فقد خانه ومن أفتي فتیابغیر ثبت فانمااثمه علی من افتاه))

[الادب المفرد (۲۵۹) وقال الالبانی: صحیح لغیره]

”جس نے مجھ پر ایسی بات تراشی جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنائے اور جس آدمی سے اس کے مسلم بھائی نے مشورہ طلب کیا اس نے اسے درست

مشورہ نہ دیا تو اس نے اس سے خیانت کی اور جس نے غیر ثابت فتویٰ دیا تو اس کا گناہ فتویٰ دینے پر ہے۔"

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((من افتی بفتیا یعمی عنها باثمها علیه))

[مسند الدارمی (١٦٢) جامع بیان العلم و فضله (١٦٢٦، ١٨٩٢) الفقیه والمتفقه ٣٢٨/٢ـ٥ـ دار ابن الجوزی ١٥٥/٣ طـ المکتبة العلمیه]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من افتی بفتیا من غیر ثبت فانما اثمه علی من افتاه))

"جس آدمی نے بغیر دلیل و برہان کے فتویٰ دیا تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہے۔"

[مسند الدارمی(١٦١) ابوداؤد (٣٦٥٨) شرح مشکل الآثار (١٧١/١)ـ المستدرك للحاکم (١٢٦/١)ـ السنن الکبریٰ بیهقی (١١٢/١٠) اسناده حسنـ نیل المقصود قلمی ٨٢٦ للشیخ زبیر علی زئی]

العدالۃ فی الاقوال والاعمال:

افتاء کے منصب پر فائز شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ حسن سیرت، صاحب مروت، صدق مقال کا خوگر اور ورع وتقویٰ، زہد ثقاہت کا پیکر ہو۔ ہمیشہ سچ بولنے والا، حرام، مکروہ، کذب بیانی کو بالکلیہ خیر باد کہہ دینے والا اور ہر قسم کے شک وشبہ سے اجتناب کرنے والا ہو۔ کیونکہ مفتی دین کے احکامات کی خبر دیتا اور اسے لوگوں تک پہنچاتا ہے جو کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے، لہٰذا اس کا اہل وہی ہوسکتا ہے جو صاحب عدالت ہو۔

عدالت ازلائے لغت جور کی ضد ہے اور اصطلاح محدثین میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"اهلية قبول الشهادة والرواية عن النبيﷺ و ضابطها اجمالاً: ملكة تحمل صاحبا على التقوىٰ و اجتناب الادناس وما يخل بالمروۃ عند الناس"

[معجم الفاظ و عبارات الجرح والتعديل صفحه: ١٠٤، ١٠٣]

عدالت سے مراد نبی کریم ﷺ سے روایت کرنے اور شہادت کی قبولیت کی اہلیت ہے اور اس کا اجمالی طور پر ضابطہ یہ ہے کہ عدالت ایسے ملکہ کو کہتے ہیں جو آدمی کو تقویٰ پر ابھارے اور عزت و اخلاق کے عیب دار ہونے اور لوگوں کے نزدیک آداب نفسانیہ میں مخل ہونے والی اشیاء سے اجتناب کرتا ہے۔

" العدالة هي ملكة تمنع عن اقتراف الكبائر والاصرار على الصغائر"

" عدالت ایسے ملکہ اور خوبی کو کہتے ہیں جو آدمی کو کبیرہ گناہ کے ارتکاب اور صغیرہ پر اصرار سے روکے۔"

خطیب بغدادی نے علمائے مسلمین کا اس پر اتفاق نقل کیا ہے کہ فاسق فاجر شخص کا فتویٰ احکام دین کے بارے میں غیر مقبول ہے۔

۵۔ حسن الطریقہ:

صاحب افتاء کو سلامت مسلک اور رضاء السیرہ ہونا چاہیے۔ اگر صحیح العقیدہ مسلک سلف صالحین کا پاسدار اور منہج محدثین کا امین ہوگا تو کتاب وسنت کے موافق فتویٰ صادر کرنے کی جہد و سعی بلیغ کرے گا۔ اور پسندیدہ سیرت کے حامل شخص پر عوام الناس بے دریغ اعتماد کرتے اور اس کے فتویٰ پر وثوق کرتے ہوئے بلا جھجک قبول کرتے ہیں۔ جو مفتی صحیح العقیدہ اور اضاء السیرہ والسلوک ہوگا اور ان اوصاف جمیلہ سے آراستہ ہوگا وہ عنداللہ اور عندالناس مقبول ہوگا۔ اور ان کمالات حمیدہ سے عاری اور غیر آراستہ مفتی، خواہ کتنا بڑا عالم ہو نظروں سے گر جاتا ہے اس کی بدعقیدگی، موشگافیوں اور شر انگیزی

صحیح فتویٰ دینے میں رکاوٹ ہوتی ہے وہ احکامات الٰہیہ کو اپنی رائے فاسدہ، ہوائے کا سدہ اور تاویلات رکیکہ کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ اسے کتاب وسنت کے چشمہ صافی سے سیراب ہونے کی سعادت نصیب نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ منصب افتاء کا صحیح اہل اور قرآن وحدیث کے ورثہ کا امین نہیں ہوسکتا۔ ایسے شخص اس منصب جلیل پر فائز کرنا امانت ودیانت کا خون کرنے کے مترادف ہے۔

۶۔ الورع والعفۃ :

مفتی صاحبان کے لیے ورع وتقویٰ، عفت مآبی اور خشیت الٰہی کا ستودہ صفات ہونا اور خود غرضی وحرص جاہ وجلال اور شیخ زرد اموال سے بے اعتنائی از حد ضروری ہے۔ خود دار اور اوصاف حمیدہ وصفات رشیدہ کا حامل ہونا حتمی ولازمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نافرمان لوگوں کو عذاب الٰہی اور زجر وتوبیخ کی آیات مجیدہ سنانے اور پہنچانے میں بلا کا دلیر اور شجاع ہو۔ الغرض! اس عادت اور رذالت سے اجتناب کرے جو تقویٰ وپرہیز گاری، طہارت وعفت سے متصادم ہو۔

اور اوامر ونواہی، حلال وحرام کی پابندی اسلام کے پیش کردہ منہج کے مطابق ہونی چاہیے۔

ان مطلوب صفات سے کورا شخص توفیق الٰہی سے محروم رہتا ہے۔ جبکہ اس منصب جلیل کا حق تب ہی ادا ہوتا ہے جب توفیق الٰہی شامل حال ہو ورنہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا مشکل امر ہے۔ خطیب بغدادی رقم طراز ہیں:

" وينبغي ان يكون في الاستنباط ، جيد الملاحظه ، رحين الفكر ، صحيح الاعتبار ، صاحب أناة وتودة ، وأخا استثبات ، وترك عجلة ، بصيرا بما فيه المصلحة ، مستوقفا بالمشاورة ، حافظاً لدينه ، مشفقاً على اهل ملته ، مواظباً على مرؤته ، حريصاً على استطابة مأكله ، فان ذالك اول

اسباب التوفیق، متورعا عن الشبهات، صادفا عن فاسد التاویلات، صلیبا فی الحق، دائم الاشتغال بمعاون الفتوی وطرق الاجتهاد ولا یکون ممن غلبت علیه الفضلة، واعتواه دوام السهر ولا موصوفا بقلة الضبط، منفوعا بنقص الفهم، معروفا بالاختلال، یجیب بما لا یسنح له ویفتی بما یخفی علیه)) [الفقیه و المتفقه ۲/۳۳ ط: دارابن الجوزی، ۲/۱۵۸ ط]

”جو مفتی قلیل الطمع اور کثیر الورع ہوگا وہ اپنے مقصد و مرام اور مطلب و مراد کو جلد حاصل کرلے گا اور اس کی نظر جب لوگوں کے درہم و دینار، مال و متاع اور زر زمین پر ہونے کے بجائے اللہ کے تقویٰ، ورع، زہد اور پرہیزگاری پر ہوگی تو فتویٰ صادر کرنے میں لوگوں کی ہیبت مانع نہ ہوگی اور باکمال مفتی وہی ہوتا ہے جو فتویٰ صادر کرنے میں لوگوں کی جیبوں اور جاہ و جلال کو خاطر میں نہیں لاتا۔“ ہر مفتی کے پیش نظر رسول رحمت، پیغمبر دو جہاں امام الانبیاء محمد ﷺ کا یہ فرمان ذی شان رہنا چاہیے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لایمنعن احدکم هیبة الناس أن یقول فی حق اذا رأه أو شهده أو سمعه))

[مسند احمد ۳/ ۵ ط، قدیم: ۱۷/ ۶۱، رقم: (۱۱۰۷)' ط: موسسة الرسالة]

”تم میں سے کسی کو بھی حق کہنے میں لوگوں کی ہیبت ہرگز مانع نہ ہو جب وہ حق کو دیکھ لے یا مشاہدہ کرلے یا سن لے۔“

اسی طرح دوسری حدیث کے الفاظ ہیں:

((ان الله یسأل العبد یوم القیامة حتی إنه یساله یقول: أی عبدی رأیت منکرا فلم تنکره واذا لقی الله عبدا حجته قال: یا رب وثقت بل وخفت الناس۔))

[مسند احمد ۲۶۲/۱' مؤسسة الرسالة، مسند الحمیدہ ۷۳۹، بیهقی ۹۰/۱۰ ،
سنن ابن ماجة ۱۰۱۷ صحیح ابن حبان ۷۳۶۸، مسند ابی یعلی ۱۰۸۹،
۱۳٤٤ تهذیب الکمال ۲۷/۳۰]

''یقیناً اللہ تعالیٰ قیامت والے دن اپنے بندے سے سوال کرے گا۔ اے میرے بندے! تو نے منکر دیکھ کر اس کا انکار نہیں کیا؟ (بندے کے پاس کوئی حجت نہیں ہوگی) تو اللہ تعالیٰ اس بندے کو اپنی حجت اور دلیل القاء کرے گا تو وہ کہے گا اے میرے پروردگار میں نے تجھ پر اعتماد کیا اور امید رکھی اور لوگوں سے ڈر گیا۔''

امام بوصیری فرماتے ہیں:

" هذا اسناد صحیح رواه الحاکم فی المستدرك۔"

[سنن ابی ماجة ۱٤٦٦/۲ ط: بیت الأفکار الدولیه]

علامہ سندھی رقمطراز ہیں:

" وخوفت من الناس" أی خفتهم فسامحت فی حقك اعماداً علی انك کریم مرجو لکمال فضلك ولطفك بخلاف الناس فانهم من الشح بمکان۔"

[سنن ابن ماجة ۱٤٦٦/۲، ۱٤٦۷' ط: بیت الأفکار الدولیه، سنن ابن ماجة مع حاشیه سندهی ۳،۳٦٦، ط: دارالمعرفة بیروت، ٤۸۸/۲]

یعنی تیرے حق کے بارے میں لوگوں سے خائف ہو گیا اس پر اعتماد کرتے ہوئے کہ تو بلاشک وشبہ تیرے فضل ولطف کے کمال کے باعث تجھ سے امید رکھی جاتی ہے جب کہ لوگ تو انتہائی کنجوسی کے مقام پر ہوتے ہیں۔ اس لیے مفتی کو اپنے پروردگار کامل پر توکل اور اکمل بھروسہ ہونا چاہیے۔ لوگوں کی زر زمین اور مال ومتاع کو نظر انداز کر کے رب العالمین کی وسیع رحمت کا امیدوار ہونا چاہیے جب خودغرضی سے پاک و

میرا ہوگا تو فتویٰ تحریر کرنے میں امداد الٰہی اور توفیق ربانی شامل ہوگی۔

۷۔ تحقیق و تدقیق کی رفتوں کا حامل ہو:

مفتی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صاحب بصیرت، قوی الاستنباط، جید الملاحظہ، رصین الفکر، صحیح الاعتبار، ثقاہت و ثبت کا حامل، فتویٰ دینے میں عجلت و سرعت کا تارک، دین کا محافظ ہو اور بحث و تمثیل، رطب و یابس، کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے والا اور موضوعات و مناکیر، صفات و مجاہیل، منقطع و سراہیل کی تحقیق و تدقیق کرنے میں ماہر اور استاد کامل ہو۔ علل و شذوذ سے واقف کار اور گہری بصیرت کا حامل ہو۔

ناقص الفہم، قلیل الضبط، معروف بالاختلال، نابلد، ناتجربہ کار اور اناڑی و انجان نہ ہو، ورنہ استنباط و اجتہاد کے بحر ناپیدا کنار میں غوطہ زنی اس کے لیے ہلاکت و تباہی کا موجب ہوگی اور وہ ضال و مضل ہو کر اس کرۂ ارضی پر فتنہ و فساد کو رواج دے گا۔

ائمہ حدیث و فقہ جو کتاب و سنت کے بحر ذخار میں غوطہ زن ہو کر دراری مضیہ ہموط ذہبیہ اور درپیسہ سے اپنی اور عوام الناس کی جھولیاں بھرتے تھے۔ وہ فتویٰ صادر کرنے میں انتہائی احتیاط کرتے اور تحقیق و تدقیق کی منازل رفیعہ کو طے کرتے تھے۔ تحقیق انیق کرنے اور غث و ثمین میں فرق کرنے کے بعد فتویٰ صادر کرتے تھے۔

اپنے فتاویٰ جات میں ہر طرح کا رطب و یابس جمع کرنے سے احتیاط از بس ضروری ہے تاکہ عوام الناس کے پاس خالص کتاب و سنت پر مبنی احکامات شریعہ کا علم پہنچے اور وہ اس پر عمل پیرا ہو کر دین و دنیا کی کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل کرسکیں۔

۸۔ متدین اہل سنت سے مشاورت:

متدین اہل علم، حدیث و فقہ سے پیش آمدہ مسائل میں مشاورت ایک ایسی شرط ہے جس پر سلف صالحین عمل پیرا ہوتے چلے آئے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مشورہ کرنے والے مومنوں کو سراہا ہے۔ فرمایا: ﴿ امرھم شوری بینھم ﴾ [الشوری : ۳۸]

"اور ان کا ہر کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے۔"

اس آیت سے مشاورت کی اہمیت وافادیت اور اس کی ضرورت ومشروعیت واضح ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا بھی ایک ارشاد گرامی پیش خدمت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے کہا اے اللہ کے رسول!

" ان نزل بنا أمر ليس فيه بيان أمر ولانهي فما تأمرنا؟ قال: تشاورون الفقهاء والعابدين ولا تمضوا فيه رأى خاصة۔"

[المعجم الاوسط للطبراني ٢/٣٦٨، ١٦٤١، ط : مكتبة المعارف الرياض، مجمع البحرين في زوائد المعجمين ١/٢٢٥، ٢٤١،]

" اگر ہمارے ہاں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس میں کوئی واضح بیان امر یا نہی موجود نہ ہو تو آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: تم فقہاء اور عابدین سے مشورہ کرو اور اس بارے میں کسی مخصوص فرد کی رائے نافذ نہ کرو۔"

علامہ ہیثمی فرماتے ہیں:

" رواه الطبراني في الاوسط ورجاله موثقون من اهل الصحيح۔"

[مجمع الزوائد ١/١٨٣، باب في الاجماع ١/٤٢٨، ٨٣٤، ط]

علامہ علاء الدین المتقی الہندی رقمطراز ہیں:

" فالحديث عن هذه الطريق حسن صحيح۔"

امور مشکلہ میں اہل علم کی باہمی مشاورت کی افادیت واہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا لیجیے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جیسا محدث، ملہم، سریع الفہم، صاحب بصیرت اور عبقری انسان حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مشورہ کر لیتا تھا حالانکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اہل علم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے عمر میں چھوٹے تھے۔

ملاحظہ ہو: [صحيح البخاری، كتاب التفسير رقم: ٤٩٧، فتح الباری ٣/٣٤٩٠، ط: بيت الأفكار الدوليه، ١١/١٣٦، ارشاد الساری للقسطلانی ١١/٢٧٧،

۲۷۸، ط: دار الفکر، وغیرھا من کتب الحدیث والرجال والسیر]

مگر یہ بات یاد رہے کہ مشاورت امور مشکلہ مسائل غامضہ اور احکامات خفیہ میں ضرور کرنی چاہیے تا کہ فتویٰ میں کسی فرد کو کوئی بلاوجہ گزند نہ پہنچے یا کسی کی توہین وغیرہ کا خدشہ اور جانی ومالی معاملات میں فساد بگاڑ کا اندیشہ نہ ہو۔بصورت دیگر مشاورت نہ بھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بہرحال مفتی کتاب وسنت کے دلائل ظاہرہ وباہرہ کو مدنظر رکھ کر فتویٰ صادر کر دے۔

۹۔منصب کی اہلیت اور معاصرین اہل علم کی شہادت:

مفتی کے لیے یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے ہم عصر علماء ومشائخ اس کے متعلق گواہی دیں کہ وہ اس منصب جلیل کا واقعی اہل ہے، اس سے عوام الناس میں اس کی مقبولیت بڑھے گی اور لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے اس کی طرف خوش دلی کے ساتھ رجوع کریں گے اور اسے پذیرائی حاصل ہوگی۔ جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے بارے میں ان کے اساتذہ ومشائخ اور تلامذہ کی شہادت فقاہت موجود ہے۔ جیسے امام بخاری کے استاذ ابو مصعب احمد بن ابی بکر الزہری فرماتے ہیں:

”محمد بن اسماعیل افقه عندنا۔“

[تاریخ بغداد فی نسخة ۱۹/۲، تهذیب الکمال ۲۳۳/۶، سیر اعلام النبلاء، ۴۲۰/۱۲ تاریخ دمشق ۸۶،۵۲]

امام محمد بن بشار فرماتے ہیں:

”هو افقه خلق الله فی زماننا او سید الفقهاء۔“

[تهذیب الکمال ۲۳۲/۶، ۲۳۵]

امام نعیم بن حماد اور امام یعقوب بن ابراہیم الدورقی فرماتے ہیں:

”فقیه هذه الأمة۔“

[تاریخ مدینة السلام ۳۴۴/۲، ۳۴۲ تهذیب الکمال ۲۳۴/۶، سیر اعلام

النبلاء ۱۲/۴۱۹، ۲٤۰ تاریخ دمشق ۸٤۵۲]

امام مالک بن انس فرماتے ہیں:

"ما افتيت حتى شهد لى سبعون أنى اهل لذلك۔"

[الفقيه والمتفقه ۲/۱۵٤،ط: المكتبة العلمية ۲/۳۲۲۵،ط: دارابن الجوزى

حلية الاولياء ٦/۳٤۵، ۳۳۸۵۱]

"میں نے اس وقت تک فتویٰ نہیں دیا جب تک ستر بندوں نے یہ شہادت نہیں دی کہ فتویٰ جاری کرنے کا اہل ہوں۔"

لہٰذا مفتی کے زمانے کے علماء وفقہاء کی شہادت اور گواہی بھی مفتی کی اہلیت کے لیے ازبس ضروری ہے۔

۱۰۔سائل کے اصل مقصد کا شعور:

منصب افتاء کا بھی یہ تقاضا ہے کہ مفتی سائل کے حالات، اس کے طرز عمل اور سوال کے پس منظر کی گہرے شعور اور پوری بیدار مغزی کے ساتھ جانچ پڑتال کرے کیونکہ بعض دفعہ مستفتی مکروفریب اور دھوکہ دہی سے کام لے کر من مانا فتویٰ لینے کی کوشش میں ہوتا ہے۔ یہ جانچ پڑتال اسی طرح ضروری ہے جیسے فتویٰ کے اصدار میں صراط مستقیم کی پابندی ناگزیر ہے۔ مفتی کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ وہ مستفتی کو خوش کرنے کے لیے کسی شرعی واجب کو ساقط کر دے یا حرام کو حلال بنا دے۔ کیونکہ یہ مکروفریب اور حیلہ وخدعہ ہے۔ علمائے یہود وغیرہ کی یہ حرکات تھیں کہ وہ لوگوں کی خوشی اور دنیا بٹورنے کے لیے شرع اللہ میں کمی بیشی اور حیل اختیار کرکے فتویٰ صادر کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لا ترتكبوا مارتكبت يهود فستحلوا محارم الله باذنى الحيل))

[ابطال الخيل لابن ربطه ص ۱۱۲، رقم ۵٦، ارواء الغليل ۵/۳۷۵، آداب الزفاف ۱۹٤، اغاثة اللهفان لابن القيم ۱/۵۱۳، ۵۲۲، ۵۵۸، وقال: هذا

اسناد جيد لصحيح مثله الترمذى اقامة الدليل لابن تيميه ص ٣٣، وقال: هذا اسناد جيد صحيح مثله الترمذى تفسير ابن كثير ١/ ٢٦١، تحت آية ٦٦ من سورة البقره وقال: هذا اسناد جيد و ٣/ ٢٢٣، تحت آية ١٦٣ من سورة الاعراف وقال مرة اخرى: هذا اسناد جيد]

ان چیزوں کا ارتکاب نہ کرو جن کا ارتکاب یہودیوں نے کیا کہ تم اللہ کی حرام کردہ اشیاء کو ادنیٰ حیلوں سے حلال بنانے لگ جاؤ۔ لہٰذا حیلے بہانوں کو مدنظر رکھ کر فتویٰ دینے والے مفتی سے فتویٰ نہ لیا جائے بلکہ سائل کے مقصد اور مطلب کو سن کر اصل بات کی تہہ تک جانے والے اور کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ صادر کرنے والے مفتیان کی طرف رجوع کیا جائے۔

۱۱۔ تحفظ اور احتیاط:

مفتی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جب پیش نظر ایسا سوال ہو جس میں متعدد صورتیں متحمل ہوں تو اس وقت اگر مفتی سائل کی مقصد صورت کا عالم نہ ہو تو سوال کا جواب تحریر نہ کرے اور اگر جانتا ہو تو اختلافی صورتوں میں سے محتاط اور محفوظ شکل اختیار کرے اور دیگر محتمل صورتوں کا بھی جواب دے دے، اگر مقصود کے ضیاع کا خطرہ نہ ہو۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب الصلوٰۃ باب ما یذکر فی الفخذ میں نقل کیا ہے:

"ويروى عن ابن عباس وجرهد ومحمد بن جحش عن النبي ﷺ "الفخذ عورة" وقال انس حسر النبي ﷺ عن فخذه۔ و حديث انس اسند و حديث جرهد احوط حتى يخرج من اختلافهم۔"

[صحيح البخاري مع الفتح ٢/ ٨٣، ط: دار طيبة، ١/ ٤٧٨]

"عبداللہ بن عباس، جرہد اور محمد بن جحش رضی اللہ عنہم نے نبی کریم ﷺ سے بیان

کیا ہے کہ ران شرمگاہ ہے اور انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (جنگ خیبر پر جاتے ہوئے) اپنی ران کھولی ہوئی تھی۔"

امام بخاری فرماتے ہیں: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سند کے لحاظ سے زیادہ معتبر ہے اور جرہد رضی اللہ عنہ کی حدیث زیادہ احتیاط والی ہے اس طرح ہم اہل علم کے باہمی اختلاف سے نکل جاتے ہیں۔

عبداللہ بن عباس جرہد اور محمد بن جحش سے مروی حدیث پر حافظ ابن حجر نے "تغليق التعليق على صحيح البخاری " ۲/۲۰۷، ۲۱۳ میں مفصل بحث کی ہے۔

نیز ملاحظہ ہو: [الامتاع بالاربعين المتباينة بشرط المساع رقم ۳۵، ص ۲۳۹۔۲۴۳، ط: الدار السلفية بكويت]

امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک ران شرمگاہ میں داخل ہے، اس لیے اسے چھپانا واجب ہے۔ امام احمد، امام مالک، امام داؤد ظاہر اور امام بن ابی ذئب کے نزدیک ران شرمگاہ میں داخل نہیں ہے۔

امام ابن حزم اپنی کتاب المحلی میں فرماتے ہیں کہ اگر ران شرمگاہ میں داخل ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ران نہ کھولتا آپ تو معصوم ہیں۔

ملاحظہ ہو: [شرح صحيح البخاری ۱/۴۴۵، از مولانا داؤد راز صاحب محدث دهلوی رحمہ اللہ]

امام بخاری رحمہ اللہ نے احتیاطاً ران کے ڈھانپنے والا موقف اپنایا اور اسے احوط قرار دیا ہے۔ لہٰذا مفتی کو چاہیے کہ وہ اختلافی مسائل میں سے مبنی بر دلائل اور محتاط موقف اپنائے۔ بالخصوص حلال وحرام کے مسائل میں۔

۱۲۔ فہم سلف صالحین کو مدنظر رکھنا:

مفتی حضرات کو چاہیے کہ وہ کتاب وسنت کی نصوص سے استنباط و استخراج کرتے

ہوئے سلف صالحین کے فہم کو بھی مدنظر رکھے آئمہ اسلاف منہج افتاء کی جس رفعت اور بلندی پر قائم تھے اس کا کچھ حصہ اختصاراً پیش خدمت ہے۔

ا۔ کتاب وسنت کے ساتھ تمسک:

خطیب بغدادی نے الفقیہ والمتفقہ میں ایک باب یوں باندھا ہے:
"اعتماد المفتي على الكتاب والسنة" مفتی کو کتاب وسنت پر اعتماد کرنا چاہیے۔

پھر اس کے ضمن میں یہ روایت لائے ہیں کہ ابونضرہ کہتے ہیں ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن بصرہ تشریف لائے تو ابوبشیر کے گھر اترے۔ میں حسن بصری کے پاس آیا۔ میں نے کہا یقیناً ابوسلمہ تشریف لائے ہیں اور وہ قاضی مدینہ اور ان کے فقیہ ہیں ہمارے ساتھ ان کی طرف چلیے تو ہم ان کے پاس آئے جب انھوں نے حسن بصری کو دیکھا کہا آپ کون ہیں؟ کہنے لگے حسن بن ابی الحسن ہیں۔ کہنے لگے: میری ملاقات کرنے والے لوگوں میں سے اس شہر میں تم سے زیادہ محبوب کوئی نہیں اور مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تم لوگوں کو فتوے دیتے ہو۔

" فاتق الله ياحسن وافت الناس بما اقول لك: افتهم بشيء من القرآن قد علمته اوسنة ماضية قدسنها الصالحون والخلفاء وانظر رأيك الذى هو رأيك فالقه۔"

[الفقيه والمتفقه ٢/ ٣٤٤، ٣٤٥، ط: دارابن الجوزى ٢/ ١٦٣]

"اے حسن اللہ سے ڈر اور جو میں کہتا ہوں اس کے مطابق لوگوں کو فتویٰ دے۔ انھیں قرآن پاک میں سے ایسے چیز کے ساتھ فتویٰ دے جسے تو جانتا ہو یا یاسنۃ مافیہ کے ساتھ فتویٰ دے جسے سلف صالحین اور خلفاء نے جاری رکھا اور اپنی رائے کو دیکھ اور اسے پھینک دے۔"

دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

" فلا تفت برأيك الا أن تكون سنة عن رسول اللهﷺ او كتاب منزل۔" [مسند الدارمی ١٦٥]

" تم اپنی رائے کے مطابق فتویٰ نہ دیا کرو مگر نبی کریم ﷺ کی سنت یا منزل شدہ کتاب کی رو سے فتویٰ دیا کرو۔"

جابر بن زید ابو الشعثاء بیان کرتے ہیں انہیں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما طواف کرتے ہوئے ملے تو کہنے لگے:

" يا ابا الشعثاء انك من فقهاء البصره فلا تفت الا بقرآن ناطق اوسنة مافية فانك ان فعلت غير ذلك هلكت وأهلكت۔"

[مسند الدارمی، ١٦٦، ط: دارابن حزم الفقيه والمتفقه ٣٤٤/٢ (١٠٧٠، ط: دارا ابن الجوزی ١٦٣/٢، ط: المكتبة العلمية، حلية الاولياء ٨٦/٣، وفی نسخة ١٠٢/٣، ٣٣٢٤، ط: دارالكتب العلمية التاريخ الكبير ١٨٧/٢، تحت ترجمة جابر بن زيد ط: دار الكتب العلمية ٢٠٤/٢، ط: قديم]

لہٰذا فتویٰ صادر کرنے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلام کا منہج کتاب وسنت تھا، یہی دین اسلام کی اساس ہے۔

۲۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مقابلہ میں کسی کا قول نہیں لیتے تھے:

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لا تمنعوا نسائكم المسجد بالليل))

" اپنی عورتوں کو رات کے وقت مساجد سے نہ روکو۔"

تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بیٹے نے کہا:

" لا ندعهن يتخذنه دغلا۔"

" ہم ان کو نہیں چھوڑیں گے وہ اسے دھوکہ ہی بنا لیں گے۔"

ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے سینے پر تھپڑ رسید کیا اور کہا:

" احدیثك عن رسول اللهﷺ وتقول هذا۔"

" میں تمھیں رسول اللہ ﷺ سے حدیث بیان کرتا ہوں اور تو یہ بات کہتا ہے۔"

[مسند احمد ٦٢/٩، ٤٥٧/٩،ط: موسسة الرسالة بيهقي ١٣٢/٢، المعجم الكبير للطبراني ٣٠٥/١٢، ١٣٤٧٢، مسند طيالسي (٢٠٠٦)، ٤١٩/٢، ط: دارالكتب العلمية وطبعة اخرى (١٨٩٤)]

ایک روایت میں ہے:

" فما كلمه عبدالله حتى مات۔"

[مسند احمد ٥٢٧/٨، ٤٩٣٣،ط: موسسة الرسالة]

" عبداللہ بن عمر نے مرتے دم تک اپنے بیٹے سے کلام نہ کیا۔"

قتادہ کہتے ہیں:

" حدث ابن سيرين رجلا بحديث عن النبيﷺ فقال رجل: قال فلان كذا وكذا فقال إبن سيرين: احدثك عن النبيﷺ وتقول: قال فلان و فلان كذا وكذا لا اكلمك ابدا۔"

[مسند الدارمي ٤٥٥]

" محمد بن سیرین نے ایک آدمی کو نبی کریم ﷺ کی حدیث بیان کی تو اس آدمی نے کہا: فلاں شخص نے اس، اس طرح کہا ہے، ابن سیرین نے کہا: میں تمھیں نبی کریم ﷺ کی حدیث بیان کرتا ہوں اور تو کہتا ہے فلاں اور فلاں نے اس طرح کہا ہے میں تجھ سے کبھی بھی کلام نہیں کروں گا۔"

امام مجاہد بن جبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" ليس احد بعد رسول اللهﷺ الا وانت آخذ من قوله و تارك۔"

"نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے مگر تو اس کے قول کو لینے والا بھی ہے اور ترک کرنے والا بھی۔"

[الفقيه والمتفقه ١/١٤٤، ٤٦٤، ط: دار ابن الجوزی، جامع بيان العلم وفضله ٢/٩١ ط: دارالكتب العلمية بيرورت، ٢/١٨٢، بتحقيق ابی عبدالرحمن فواز احمد زمرلي، ط: دار ابن جزم، ص ٣٥٩]

مذکورہ بالا قول کی نسبت متاخرین کے ہاں امام کی طرف مشہور ہے اور امام ابن عبدالہادی نے اسے ارشاد السالك ١/٢٢٧ میں امام مالک سے صحیح قرار دیا ہے اور امام ابن عبدالبر نے جامع بيان العلم وفضله میں اور امام ابن حزم نے الاحکام فی اصول الاحکام ٦/١٤٥، ١٧٩ ناشر جامعہ ابي بکر الاسلامیہ کراچی تحقیق شیخ احمد شاکر ﷫، مجاہد اور الحکم بن عتیبہ سے اسے روایت کیا ہے۔

امام ابوداؤد فرماتے ہیں:

"سمعت احمد يقول: ليس احد الا ويوخذ من رأيه ويترك يعني ماخلا لالنبي ﷺ۔"

[مسائل الامام احمد برواية ابی داؤد ص ٣٦٨، رقم: ١٧٨٦، ط: مكتبة ابن تيمية بتحقيق أبي معاذ طارق بن عوض الله ن محمد]

"میں نے امام احمد بن حنبل سے سنا وہ کہتے ہیں: نبی کریم ﷺ کے سوا ہر شخص کی بات کو لیا بھی جا سکتا ہے اور چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔"

امام ابوالحسن تقی الدین علی بن عبدالکافی السبکی امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ پڑھنے کو واجب قرار دیتے ہیں اور سنت رسول ﷺ کے حوالے سے کئی ادلہ اس پر پیش کرتے ہیں اور سری اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کے بارے میں فرماتے ہیں سری و جہری نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کے بارے میں بہت سارے آثار صحابہ کرام اور تابعین عظام ﷭ سے مروی ہیں اور سری و جہری نمازوں

میں قرآن کے ترک پر تھوڑے سے آثار مروی ہیں جو شخص اس کے بارے میں آثار صحابہ وتابعین ملاحظہ کرنا چاہے وہ امام بخاری کی کتاب جزء القرأۃ کا مطالعہ کر لے اور اگر ہم ان آثار کا صحیح ہونا تسلیم بھی کر لیں تو یہ دیگر آثار صحابہ کے معارض ہیں۔ پھر لکھتے ہیں:

" وحينئذ نرجع الى رسول الله ﷺ الذى كان كلامه كله شفاء وهدى بأبى هو وأمى فما أحسن ما قال ابن عباس" ليس أحد بعد النبیﷺ الا ويؤخذ من قول ويترك إلا النبیﷺ واخذ هذه الكلمة من ابن عباس مجاهد واخذ منهما مالك واشتهرت عنه۔"

[فتاوى السبكى ١٣٨/١ ،ط: دارالمعرفة، بيروت]

''اس صورت میں ہم رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کریں گے جن کا کلام سارے کا سارا شفا اور ہدایت ہے، میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں کس قدر اچھا کلام ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ: نبی کریم ﷺ کے بعد ہر شخص کا قول لیا بھی جا سکتا ہے اور چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ یہ کلمہ ابن عباس سے مجاہد رحمہ اللہ نے حاصل کیا اور ان دونوں سے امام مالک سے اور پھر کلام امام سائل رحمہ اللہ سے مشہور ہو گیا۔

[اسی معنی کا قول امام ابن خزیمہ سے امام حاکم نے معرفة علوم الحديث صفحه ٧٨۔ دارالكتب العلميه بيروت صفحه ١٤٠ ط۔ دارا احياء العلوم بيروت، صفحه ٢٨٦ رقم ١٩٠ ف]

لہٰذا سلف صالحین نبی کریم ﷺ کی حدیث وسنت کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے شخص کے قول اور رائے کو نہیں لیتے تھے۔

۳۔ حصول علم کے لیے جدوجہد کرتے اور صرف ثقہ و قابل اعتماد رواۃ سے ہی دین لیتے تھے:

سعد بن ابراہیم فرماتے ہیں اللہ کے رسول ﷺ سے صرف ثقہ راوی ہی حدیث

بیان کریں۔[مسند الدارمی(٤٢٩) الکفایة ص ٣٢ مقدمه صحیح مسلم]

امام محمد بن سیرین فرماتے ہیں:

"انظروا عمن تاخذون هذا الحديث فانما هو دينكم"

"دیکھو تم یہ حدیث کس سے اخذ کرتے ہو یہ تمہارا دین ہے۔"

[مسند الدارمی (٣٩٩) الفقیه والمتفقه ٢/٩٦ حلیة الاولیاء ٢/٢٧٨]

ابراہیم کہتے ہیں: سلف صالحین جب کسی آدمی کے پاس حصول علم کے لیے آتے تو اس کی نماز، سیرت اور ہیئت دیکھتے، پھر اس سے حدیث لیتے۔

[مسند الدارمی (٤٣٤، ٤٣٥) الجرح والتعدیل ٢/١٦ الکفایة ص ١٥٧]

۴۔ جس مسئلہ کے بارے کتاب وسنت میں خاموش ہوں اس کا جواب دینے سے بچتے تھے:

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

"من افتى بفتيا يعمى عنها فاثمها عليه"

"جس نے ایسا فتویٰ صادر کیا جس سے وہ اندھا ہے اس کا گناہ اسی پر ہے۔"

[مسند الدارمی (١٦٢) جامع بیان العلم (١٦٢٦، ١٨٩٢) الفقیه والمتفقه ٢/ ١٥٥ جامع بیان العلم (١٦٢٧)]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((من افتى بفتيا من غير ثبت فانما اثمه على من افتاه))

"جو شخص دلیل برہان کے بغیر فتویٰ دیا گیا اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہے۔"

[مسند الدارمی (١٦١) ابوداؤد (٣٦٥٧) الادب المفرد (٢٥٩) حاکم ١/١٢٦ الفقیه والمتفقه ١/١٥٥]

قاسم بن محمد فرماتے ہیں:

" وانا والله مانعلم كل ماتسألون عنه ولو علمنا ماكتمنا كم ولا حل لناأن نكتمكم"

" اللہ کی قسم ہم نہیں جانتے ہر اس بات کو جس کے متعلق تم سوال کرتے ہو اور اگر ہم جانتے ہوتے تو تم سے نہ چھپاتے اور نہ ہی ہمارے لیے تم سے چھپانا حلال ہے۔"

[مسند الدارمی (۱۱۳) ،المعرفة والتاريخ (۵۴۸/۱)،الفقيه والمتفقيه (۱۷۳/۲)، حلية الاولياء(۱۸۴/۲)،جامع بيان العلم (۱۴۱۰)]

۵۔ عام طور پر فتویٰ صادر کرنے سے حتی الوسع گریز کرتے تھے :

عطاء بن السائب کہتے ہیں میں نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے سنا وہ کہتے تھے میں نے اس مسجد میں ایک سوبیس (۱۲۰) انصار صحابہ کو پایا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی حدیث بیان نہیں کرتا تھا مگر یہ کہنا پسند کرتا کہ اس کے بھائی نے اسے حدیث بیان کرنے سے کفایت کر دی ہے اور کوئی کسی فتویٰ کے بارے سوال نہیں کیا جاتا تھا مگر یہ بات پسند کرتا کہ اس کے بھائی نے فتویٰ دے کر اس کی کفایت کر دی ہے۔

[مسند الدارمی (۱۳۷) ابن سعد ۷۴/۶ تاریخ ابی زرعه (۲۰۳۱) جامع بيان العلم (۱۹۴۴، ۱۹۴۵) كتاب الزهد لابن المبارك (۵۸)]

ابن المنکدر فرماتے ہیں :

" إن العالم يدخل فيما بين الله وبين عباده فليطلب لنفسه المخرج"

" بلاشبہ عالم اللہ اور اس کے بندے کے درمیان داخل ہوتا ہے اسے اپنے نفس کے لیے نکلنے کی کوئی راہ طلب کرنی چاہیے۔"

[مسند الدارمی (۱۳۹) حلية الاولياء (۱۵۳/۳) الفقيه والمتفقه (۱۰۸۸، ۱۰۸۹)]

٦۔صرف مفید اور عمدہ سوالات ہی پوچھا کرتے تھے لا یعنی گفتگو سے اجتناب فرماتے تھے :

قاسم بن محمد فرماتے ہیں : تم ایسی باتوں کے بارے سوال کرتے ہو جن کے بارے ہم سوال نہیں کرتے تھے اور تم ایسی چیزوں کے بارے بحث کرتے ہو جن کے متعلق ہم بحث نہیں کرتے اور تم ایسی باتیں پوچھتے ہو میں نہیں جانتا وہ کیا ہیں اور اگر ہمارے علم میں ہوتیں تو انھیں چھپانا ہمارے لیے حلال نہ تھا۔[مسند الدارمی (۱۲۰)]

٧۔غیر پیش آمدہ مسائل کے بارے سوالات کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے :

یزید بن مسلم فرماتے ہیں ایک دن ایک آدمی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اس نے ایک ایسی چیز کے بارے سوال کیا جو میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا ہے؟ اسے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ایسی چیز کے بارے سوال نہ کرو جو واقع نہیں ہوئی، میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے سنا ہے وہ ایسے آدمی پر لعنت کرتے تھے جو ایسی اشیاء کے بارے سوال کرتا جو واقع نہ ہوئی ہوں۔

[مسند الدارمی (۱۲۳) جامع بیان العلم (۱۸۲۰) کتاب العلم لابی خیثمه (۱٤٤) الفقیه والمتفقه ۲/۷]

طاؤس کہتے ہیں عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر کہا:

" احراج باللہ علی رجل سال عما لم یکن فان اللہ قدبین ماھو کائن"

"جو شخص ایسی چیز کے بارے میں سوال کرے گا جو واقع نہیں ہوئی میں اس پر راستہ تنگ کردوں گا یقیناً اللہ تعالیٰ نے ہر ہونے والی چیز واضح کر دی ہے۔"

[مسند الدارمی (۱۲٦) جامع بیان العلم (۱۸۰۷، ۱۸۰۸) فتح الباری (۲٦۷/۱۳، ۲٦٦) الفقیه والمتفقه (۷/۲) کتاب العلم (۱۲۵)]

رجاء بن حیوہ کہتے ہیں میں نے عبادہ بن نسی الکندی سے سنا ان سے ایک عورت

کے بارے سوال کیا گیا جو کسی ایسی قوم کے ہاں فوت ہو جائے کہ وہاں اس کا ولی نہ ہو تو۔ انھوں نے کہا: میں نے ایسی قوم کو پایا ہے وہ تمھاری شدت کی طرح شدت نہیں کرتے تھے اور تمھارے سوالات جیسے سوالات نہیں پوچھتے تھے۔

[مسند الدارمی (۱۲۹) تاریخ مدینة دمشق]

۸۔ کلمہ ''لا ادری'' سلف کے ہاں نصف علم کے مساوی تھا:

امام شعبی نے فرمایا: لا ادری (میں نہیں جانتا) نصف علم ہے۔ (مسند الدارمی)

نافع سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کسی چیز کے بارے سوال کیا تو انھوں نے کہا: ''لا علم لی'' مجھے علم نہیں۔ پھر آدمی کے چلے جانے کے بعد کہنے لگے:

''ابن عمر نے جو کہا بہت اچھا ہے وہ ایسی بات کے بارے سوال کیا جاتا ہے جسے وہ نہیں جانتا اور کہہ دیتا ہے مجھے اس کا علم نہیں۔''

[مسند الدارمی (۱۸۷) المعرفة والتاریخ (۱/ ۴۹۳) الفقیه والمتفقه (۲/ ۱۷۲)]

امام محمد بن سیرین فرماتے ہیں مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ مجھے ایسے امور کا سوال کیا جائے جو میں جانتا ہوں یا نہیں جانتا۔ اس لیے کہ جب مجھ سے ایسی چیز کے بارے پوچھا جائے جو میں جانتا ہوں تو میں وہی کہوں گا جو میرے علم میں ہے اور جب مجھ سے ایسی چیز کے بارے سوال کیا جائے گا جو میں نہیں جانتا تو میں کہوں گا: ''لا اعلم'' میں نہیں جانتا۔ [مسند الدارمی : ۱۸۹]

امام اعمش فرماتے ہیں: میں نے ابراہیم کو یہ کہتے ہوئے کبھی نہیں سنا کہ: یہ حلال ہے یا حرام وہ کہا کرتے تھے کہ سلف صالحین (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) اس چیز کو ناپسند کرتے تھے اور اسے پسند کرتے تھے۔ [مسند الدارمی : ۱۹۰]

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا:

'' ان الذی یفتی الناس فی کل ما یستفتی لمجنون ''

"بے شک وہ آدمی جو ہر استفتاء کے بارے فتویٰ دیتا ہے مجنون ہے۔"

[مسند الدارمی (١٧٦) الفقیہ والمتفقہ (١١٩٤، ١١٩٥) مجمع الزوائد (٨٧٠) الابانہ ١/٤١٨ (٣٢٦)]

مذکورہ بالا توضیح سے معلوم ہوا کہ سلف صالحین ہر چیز کے بارے فتویٰ صادر نہیں کر دیتے تھے بلکہ جس چیز کو علم ہوتا اس کے بارے فتویٰ دیتے جس کا علم نہ ہوتا اس کے بارے صاف کہہ دیتے میں نہیں جانتا اور یہ کلمہ ان کے نزدیک نصف علم کے برابر سمجھا جاتا۔ لہٰذا علماء کرام کو صرف اسی چیز کے بارے فتویٰ صادر کرنا چاہیے جس کے متعلق انہیں صحیح علم ہو ورنہ لا اعلم یالا ادری کہہ دینا ہی بہتر ہے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تم میں سے جو آدمی علم رکھتا ہو وہ اس کے بارے بات کہے اور جو علم نہیں رکھتا وہ کہے: اللہ اعلم اللہ بہتر جانتا ہے، اس لیے کہ جب عالم سے ایسی چیز کے بارے سوال کیا جائے جس کے بارے وہ نہیں جانتا تو اللہ عزوجل کہتا ہے: میں جانتا ہوں اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

((قل ما اسئلکم علیہ من اجر وما أنا من المتکلفین))

"آپ کہہ دیں میں اس پر تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا اور نہ ہی میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں۔"

[مسند الدارمی (١٧٩) ،مسند ابی یعلی (٥١٤٥) صحیح ابن حبان (٤٧٦٤، ٦٥٨٥) مسند حمیدی (١١٦) الفقیہ والمتفقہ ٢/ ١٧١)]

٩۔محض رائے زنی سے اجتناب کرتے تھے۔قرآن وحدیث کے مقابلے میں آراء کو لینے والے لوگوں کو آئمہ مضلین قرار دیتے تھے:

مالک بن مغول رحمہ اللہ فرماتے ہیں مجھے امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا: یہ لوگ جو بات تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کریں اسے لے لو اور جو اپنی رائے سے کہیں اسے گندگی کے ڈھیر پر پھینک دو۔

[مسند الدارمی (۲۰۶) الابانة (۲/ ۵۱۷،۶۰۷) الاحکام فی اصول الاحکام لابن حزم (۶/ ۱۰۳۰) جامع بیان العلم (۱۰۶۶)]

جو علماء قرآن اور حدیث کی نصوص کے مقابلے میں رائے اور قیاس سے کام لیتے ہیں وہ اصل میں ائمہ مضلین ہیں ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" انما اخاف علی امتی الائمة المضلین "

"میں اپنی امت پر گمراہ کرنے والے ائمہ سے خائف ہوں۔"

[مسند الدارمی (۲۱۵) مسند احمد ۵/ ۲۷۸، ۲۸۴، ترمذی کتاب الفین باب ماجاء فی الائمة المضلین (۲۲۳۰) ابن ماجه (۳۹۵۲) مسند الشهاب (۱۱۱۶) دلائل النبوة للبیهقی (۶/ ۵۲۷) حاکم (۴/ ۴۴۹)] اسے حاکم و ذہبی نے صحیح کہا ہے۔)

لہٰذا اہل علم کو چاہیے کہ وہ کتاب و سنت کی نصوص کے مطابق فتویٰ جاری کیا کریں۔

۱۰۔ اہل بدعت سے اجتناب کرتے تھے اور عوام الناس کو بھی بچانے کی کوشش فرماتے تھے :

ابوقلابہ عبداللہ بن زید الجرمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بدعتی لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو اور نہ ہی ان سے مجادلہ کرو وہ تمھیں اپنی گمراہیوں میں غرق کر دیں گے یا جن امور کو تم جانتے ہو وہ تمھارے اوپر خلط ملط کر دیں گے۔

[مسند الدارمی (۴۰۵) الابانة (۳۶۳) (طبقات ابن سعد۔ شرح اصول اعتقاد اهل السنة (۲۴۳) الشریعة للآجری ص (۶۷)]

ایوب سختیانی کہتے ہیں مجھے سعید بن جبیر رحمہ اللہ طلق بن حبیب مرجئی کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے کیا میں نے تمھیں طلق بن حبیب کے پاس بیٹھا ہوا نہیں

دیکھا؟ تم ہرگز اس کے ساتھ نہ بیٹھو۔

[مسند الدارمی (٤٠٦) البدع لابن الوضاح (١٤٥) الابانة (٤١٣)]

بدعتی لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے عقیدہ وعمل کی خرابی کا امکان ہے اس لیے سلف صالحین بدعتی لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے منع کیا کرتے تھے۔

نافع کہتے ہیں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی آیا اس نے کہا فلاں شخص آپ کو سلام کہتا ہے، فرمانے لگے مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ اس نے بدعت ایجاد کی ہے اگر اس نے بدعت ایجاد کی ہے تو تم اسے سلام نہ کہو۔ (مسند الدارمی (٤٠٧)

مسلم بن یسار رحمہ اللہ کہا کرتے تھے جھگڑے سے بچو یہ عالم کی جہالت کی گھڑی ہے اور اسی گھڑی میں شیطان اس کی پھسلاہٹ کو تلاش کرتا ہے۔

[الشریعة للاجری ص ٦١ مسندا لدارمی (٤١٠) حلیة الاولیاء ٢/٢٩٤ الابانة (٥٤٧، ٥٤٨)]

اسماء بن عبید کہتے ہیں دو بدعتی امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ کے پاس آئے انھوں نے کہا اے ابوبکر ہم تمھیں ایک حدیث بیان کرتے ہیں؟ ابن سیرین نے کہا نہیں ان دونوں نے کہا ہم تجھ پر قرآن کی ایک آیت تلاوت کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا نہیں تم دونوں مجھ سے دور ہو جاؤ یا میں تم سے دور ہو جاتا ہوں۔ اسماء بن عبید کہتے ہیں وہ دونوں چلے گئے تو کسی نے کہا اے ابوبکر کیا حرج تھا کہ وہ تم پر اللہ کی کتاب سے آیت تلاوت کرتا؟ فرمانے لگے مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھ پر تحریف کر کے آیت پڑھتے اور وہ میرے دل میں جگہ پکڑ لیتی۔

[الابانة (٣٩٨) مسند الدارمی (٤١١) شرح اصول اعتقاد اھل السنة (٢٤٢) الشریعة للاجری (٦٢)]

١١۔ اتباع قرآن وحدیث سے محبت کرتے اور بدعات وھوائے نفسانیہ سے بغض رکھتے تھے :

عثمان بن حاضر ازدی کہتے ہیں میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا مجھے

وصیت کریں تو انھوں نے کہا: تم اللہ کے تقویٰ اور استقامت کو لازم پکڑو و اتباع کرو اور بدعت اختیار کرنے سے بچو۔[مسند الدارمی (۱٤۱) السنة للمروزی (۸۳)]

بدعت اور اہل بدعت سے اجتناب کے بارے کچھ آثار اوپر ذکر ہو چکے ہیں۔
سلف صالحین اتباع سنت کو لازم پکڑتے تھے۔ بدعت اور اہل بدعت سے اجتناب کرتے تھے اور لوگوں کو بھی بچنے کی تلقین کرتے تھے۔

۱۲۔ جب حدیث رسول مل جاتی تو آراء کو ترک کر دیتے اور حدیث کی طرف رجوع کرتے تھے:

امام مالک رحمہ اللہ کے بارے الجرح والتعدیل کے مقدمہ میں امام ابن ابی حاتم رازی نے لکھا ہے کہ ان سے پاؤں کی انگلیوں میں خلال کے بارے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا، اس کے متعلق لوگوں میں کوئی چیز موجود نہیں پھر انھیں عبداللہ بن وہب رحمہ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی جسے سن کر فرمانے لگے یہ حدیث تو حسن ہے، پھر اس کے بعد ان سے جب بھی پاؤں کی انگلیوں کے خلال کے بارے پوچھا جاتا وہ اس کا حکم دیتے تھے۔

یہ سلف صالحین کا منہج تھا جس پر چل کر انھوں نے اللہ کے فریضے کو ادا کیا اور فقہ اسلامی کی بنیاد رکھی اسی غرض سے انھوں نے احادیث رسول کو جمع کیا اور اس پر کتب تالیف کیں اور اپنی کتب میں مختلف عنوانات پر مشتمل کتب، ابواب اور فصول قائم کیں۔ اور اسلامی زندگی کی صورۃ کاملہ مدون کر دی، تاکہ اللہ کا دین آسانی کے ساتھ لوگ سمجھ جائیں اور ظلمات و ضلالات سے بھی بچ سکیں۔

۱۲۔ جب حدیث رسول مل جاتی تو آرائے انسانیہ کو ترک کر دیتے اور حدیث کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان تمام نکات کے دلائل کے لیے راقم کی کتاب ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' جلد سوم ملاحظہ فرمائیں۔

تاریخ فتویٰ:

فتویٰ پوچھنے اور فتویٰ دینے کا سلسلہ تو نزول وحی کے وقت ہی جاری وساری ہے جس کا تذکرہ اجمالاً يَسْئَلُوْنَكَ يَسْتَفْتُوْنَكَ والی آیت میں موجود ہے، جنھیں پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے۔ اور لوگ اپنے پیش آمدہ مسائل اور مشکل احکامات کے بارے میں شروع سے ہی فتویٰ طلب کرتے آئے ہیں اور رسول مکرم ﷺ وحی الٰہی کی روشنی میں انھیں جواب دیتے رہے اور پوری امانت دیانت کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے اللہ کی وحی کو لوگوں تک پہنچایا۔

آپ نے مختلف اوقات میں جو فتاویٰ صادر فرمائے وہ کتب احادیث میں مختلف مقامات پر بکھرے پڑے ہیں اور ان کا ذکر امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اعلام المعقعين عن رب العالمين ٤/٢٦٦۔ ٤١٤۔ وفي نسخه ٩٣٣۔ ١٠٤٠ بتحقيق زائد صبري بن ابي علفة ط۔ دار طيبة میں ذکر فرمایا ہے اور یہ فتاویٰ جات ((فتاویٰ رسول اللہ ﷺ)) کے نام سے خلیل مامون کی تحقیق کے ساتھ دارالمعرفۃ بیروت سے بھی طبع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ اور یہ کتاب اردو کے قالب میں بھی ڈھل چکی ہے۔ حدیبیہ پبلی کیشنز رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور سے مولانا جونا گڑھی رحمہ اللہ کے ترجمہ اور مولانا ابو یحییٰ محمد زکریا زاہد صاحب حفظہ اللہ کی تصحیح و اضافہ اور راقم کی تقدیم کے ساتھ طبع ہو چکی ہے۔

اسی طرح نبی اکرم ﷺ سے پوچھے گئے سوالات کے جوابات ((موسوعة فتاوىٰ النبي ﷺ ودلائل الصحيحة من السنة الشريفة)) کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں دارالکتب العلمیہ بیروت سے بھی طبع ہو چکے ہیں۔

نبی مکرم ﷺ کے عہد مبارک کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بہت سارے مشکل مسائل کے بارے فتاویٰ صادر فرمائے اور تابعین عظام بھی اس کا اخیر سے پیچھے نہ رہے۔

((امام ابن حزم الاندلسی المتوفی ۴۵۶ھ نے ایک کتاب بعنوان اصحاب الفتیا من الصحابة والتابعين و من بعد هم على مراتبهم فی كثرة الفتيا)) مرتب کی جو سید کسروی حسن کی تحقیق کے ساتھ دارالکتب العلمیہ بیروت نے طبع کی جس میں ۴۵۲ مفتیان کرام صحابہ و تابعین وغیرہم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

امام ابن حزم فرماتے ہیں:

((ولقد تقصينا من روى عنه فتيا فی مسألة واحدة فاكثر فلم نجد هم الامامة ثلاثه وخمسين بين رجل وامراة فقط مع شدة طلبنا فی ذلك وتهممنا وليس منهم مكثرون الا سبقه فقط وهم)) عمر وابنه عبدالله، وعلى و ابن عباس وابن مسعود و ام المومنين عائشة، وزيد بن ثابت ولا متوسطون فهم ثلاثة ثمر فقط يمكن ان يوجد فی فتيا كل واحد منهم جزء صغير فهولاء عشرون فقط والباقون مقلون جداً فيهم من لم يروعنه الا فتيا فی مسئلة واحدة فقط، ومنهم فی مسئلتين واكثر من ذلك يجتمع من فتيا جميعهم جزء واحد۔)) [الاحكام فی اصول الاحكام ۴/ ۱۷۶]

جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایک یا زیادہ مسائل میں فتویٰ روایت کیے گئے ہیں ہم نے ان کو اچھی طرح سروے کیا ہے ہمیں صرف ۱۵۳ مرد اور خواتین کر ذکر ملا ہے۔ باوجود اس کے کہ اس کے بارے ہمیں شدید طلب اور تلاش تھی۔ اور ان میں صرف سات صحابہ کرام ایسے ہیں جن سے کثیر تعداد میں فتاویٰ مروی ہیں اور وہ یہ ہیں: ① عمر ② عبداللہ بن عمر ③ علی ④ عبداللہ بن عباس ⑤ عبداللہ بن مسعود ⑥ ام المومنین عائشہ ⑦ زید بن ثابت رضی اللہ عنہم

اور متوسط ۱۳ ہیں ممکن ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا مجموعہ فتاویٰ ایک چھوٹے سے جزء پر مشتمل ہو تو یہ کل ۲۰ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہوئے اور باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت کم فتویٰ دینے والے تھے۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جن سے صرف ایک مسئلہ میں فتویٰ روایت کیا گیا اور بعض سے دو یا اس سے زیادہ فتویٰ بیان کیے گئے ہیں۔ ان سب کے فتاویٰ جات کا ایک جزء میں مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ عصر حاضر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی فتاویٰ جات کی مرتب کیا جا رہا ہے۔ اور دکتور محمد اوّاس قلعہ جیا نے کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فتاویٰ جات کو الگ الگ کتب میں اکٹھا کیا ہے جن کے تراجم ادارۃ معارف اسلامی منصورہ سے طبع ہو چکے ہیں۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اعلام الموقعین رحمہ اللہ (۱)۔ کے شروع میں ہی فقہائے مدینہ، مکہ، بصرہ، کوفہ، شام، مصر، قیروان، اندلس، یمن اور بغدار کا تذکرہ کیا ہے۔ اور ان کی یہ تفصیل امام حزم رحمہ اللہ کی فراہم کردہ معلومات سے ہی ماخوذ ہے۔

پھر یہ بھی یاد رہے کہ دوسری صدی ہجری میں اصول وضوابط کے اختلاف کے پیش نظر فقہاء کے دو گروہ بن گئے، ایک اہل حدیث کا گروہ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پیش نظر رکھ کر فتویٰ صادر کرتے تھے اور جب تک کسی حادثے یا واقعہ کا وقوع نہ ہوتا فتویٰ صادر نہیں کرتے تھے اور دوسرا گروہ اہل الرائے کا پیدا ہو گیا جن میں عراق کے لوگوں کو غالب اکثریت تھی ان کا احادیث رسول کے ساتھ شغف کم تھا اور یہ غیر پیش آمدہ مسائل بلکہ محال اور غیر ممکن الوقوع مسائل فرض کر کے اپنی آراء کا اظہار کرتے تھے۔ جس کی تفصیل شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ اس گروہ نے اپنی کتب میں بے شمار ایسے مسائل جمع کر دیے جو محض آراء و قیاسات پر ہی مبنی ہیں اور ان کی پشت پر دلائل قرآن وسنت نہیں ہیں۔ ان کی فقہی کتب کا اللہ یہ حال ہے کہ اپنے مفروضہ مسائل کے حل کے لیے موضوعات وغیرہ سے بھی دریغ نہیں کرتے اور ہر طرح کی

رطب و یابس اور غبار آلود باتیں جمع کرتے چلے جاتے ہیں دلائل کے صحیح سے انھیں سروکار نہیں۔ مولوی حسین احمد مدنی سالار دیوبندی اپنی تقریر ترمذی میں فرماتے ہیں ''امام صاحب سے متون تو منقول ہیں دلائل منقول نہیں ہیں، لہٰذا دلائل کا تسلیم کرنا ہم پر ضروری نہیں اس سے مذہب حنفی پر کوئی زد نہیں آسکتی اور جو دلائل مذہب حنفیہ کے مطابق ہوں گے ہم ان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔''

[تقریر ترمذی اردو صفحہ ۷۲ ناشر: کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوھڑ گیٹ ملتان]

لہٰذا ان اصحاب الرائے کو دلائل سے غرض نہیں یہ فتاویٰ جات میں بھی اپنے امام سے منقول روایت فقیہ کو رواج دیتے اور لکھتے ہیں۔ جبکہ اہل حدیث کا طرز نگارش فتویٰ مرتب کرنے میں ان سے جدا اور الگ ہے۔ اہل حدیث مفتی حتی الوسع فتویٰ مرتب کرنے میں قرآن حکیم اور احادیث وسنن رسول کو مدنظر رکھتا ہے اور اپنے فتویٰ میں قرآن وسنت کے دلائل و براہین کا اندارج کرتا ہے اور سلف صالحین کا یہی طریقہ کار رہا ہے جیسا کہ کچھ حوالے ہم نے اس کے بارے اس تحریر میں درج کر دیے ہیں۔ اہل حدیث علماء کے فتاویٰ جات پر مختصراً تبصرہ پڑھنے کے لیے حافظ صلاح الدین یوسف ﷾ کا مضمون ''مجموعہ ہائے فتویٰ علمائے اہل حدیث'' ملاحظہ کیجیے جو کہ ہفت روزہ الاعتصام کی جلد نمبر ۶۱ شمارہ نمبر ۲۳، ۲۴، ۲۰۰۹ء میں دو قسطوں میں طبع ہوا ہے اور فتاویٰ راشدیہ میں جناب رمضان سلفی کا مضمون جو کہ ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔

عفی اللہ عنہ

ابوالحسن مبشر احمد ربانی

۲ جولائی ۲۰۱۲

عقیدہ کے مسائل

توحید الوہیت

سوال کیا قبروں پر جو کچھ اولیاء کے لیے ذبح کیا جاتا ہے' اس کو کھانا جائز ہے؟

جواب نہیں، کیونکہ یہ ایسی چیزوں میں شامل ہے کہ ان پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہے، لہٰذا یہ کھانا حلال نہیں ہے اور حدیث میں صراحت ہے کہ جس پر غیر اللہ کا نام لیا جائے وہ حرام ہے۔

سوال کاہنوں کے پاس آنا کیوں حرام ہے؟ جبکہ وہ ایسے وسائل وذرائع استعمال کرتے ہیں کہ جن کے ذریعے سے وہ غیب کی خبریں معلوم کرتے ہیں کہ جس طرح فلکیات وغیرہ۔

جواب کاہن جنوں سے رابطہ کرتے ہیں، جیسا کہ یہ بات صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ جن جاکر آسمانوں سے چوری سے فرشتوں کی باتیں سن کر آتے ہیں، پھر انسانوں میں سے جوان کے دوست ہیں' ان کی طرف نازل ہوتے ہیں اور اس سنی ہوئی بات کے ساتھ بہت سارے جھوٹ ملا کر اس انسان کی طرف القاء کرتے ہیں۔ اس طرح کے انسان اس میں بہت زیادہ غلو کرتے ہیں تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ غیب جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور لوگوں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ اس لیے نبی علیہ السلام نے کاہنوں کے پاس آنے سے منع فرمایا ہے' البتہ یہ ماہر فلکیات اور ڈاکٹر غیب کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ وہ خود بھی وضاحت کرتے ہیں کہ جیسے جیسے ان کی تحقیق زیادہ ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے ان کی معرفت بڑھتی جاتی ہے۔

سوال مخلوقات میں سے سب سے پہلے کسے تخلیق کیا گیا؟

جواب سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ان اول شئ خلقه الله تعالىٰ القلم' وامره ان يكتب كل شئ يكون۔(الصحيحہ ۱۳۳:۳)

"یقیناً اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلی چیز جو پیدا کی وہ قلم ہے اور اسے ہر ہونے والی چیزوں کے لکھنے کا حکم دیا۔"

اس حدیث میں اس نظریہ کے رد کی طرف اشارہ ہے جو اکثر لوگوں کے دلوں میں ایک پختہ عقیدہ بن گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز سب سے پہلے تخلیق کی ہے' وہ نور محمدی ہے۔ حالانکہ اس کی کوئی صحیح بنیاد نہیں اور مصنف عبدالرزاق کی حدیث کی سند غیر معروف ہے۔ جس کے متعلق ہم "سلسلة الاحاديث الضعيفه" میں الگ گفتگو کریں گے۔ ان شاء اللہ

اس حدیث میں ان لوگوں کا بھی رد ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ عرش اول مخلوق ہے جبکہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی دلیل مروی نہیں۔

یہ بات امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ وغیرہ (دیگر احادیث سے) استنباط اور اجتہاد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ جبکہ یہ حدیث اور اس معنی کی دیگر احادیث کو لینا (اجتہاد و استنباط) سے بہتر ہے کیونکہ یہ اس مسئلہ میں نص ہے اور نص کی موجودگی میں اجتہاد نہیں ہوتا۔ جیسا کہ معلوم ہے۔

یہ تاویل کہ عرش کے بعد قلم کی تخلیق ہوئی' باطل ہے۔ اس لیے کہ اس جیسی تاویل اس صورت میں درست ہے جب اس بارے میں نص قطعی ہو کہ عرش سب سے پہلی مخلوق ہے' لیکن اس جیسی نص مفقود ہے۔ لہٰذا یہ تاویل درست و جائز نہیں۔

نیز اس حدیث سے ان لوگوں کا بھی رد ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حوادث یعنی نئے نئے واقعات سے بھی پہلے کوئی چیز نہیں اور یہ ہر مخلوق سے پہلے موجود ہوتے ہیں اور اس طرح کی باتیں جن کی کوئی دلیل نہیں کہ یہ کہا جائے کہ یہ اول مخلوق ہے۔

چنانچہ یہ حدیث اس قول کی بھی تردید کرتی ہے اور قلم کا اول مخلوق ہونا متعین کرتی

ہے۔لہٰذا اس سے پہلے قطعاً کوئی مخلوق نہیں۔(نظم الفرائد ۱/ ۲۵۔۲٤)

سوال بعض لوگ انبیاء اور اولیاء سے مدد مانگنے کے لیے واقعہ معراج والی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ جس میں یہ بات بھی ہے کہ جب نبی علیہ السلام کو پچاس نمازوں کا تحفہ دیا گیا تو آپ علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعاون سے کم کروا کر پانچ کروائی ہیں۔اس استدلال کا ردفرما کر رہنمائی کریں......؟

جواب ان لوگوں نے جس طرح سے استدلال کیا ہے۔مردوں سے مدد و تعاون طلب کرنے کے لحاظ سے اس طرح کی کمزور دلیل کی وجہ سے یہ تو صریح قرآن کی خلاف ورزی ہے۔کیونکہ جو نبی علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان گفتگو کا سلسلہ ہے۔کیونکہ اگر اس کی نبی علیہ السلام ہمیں خبر نہ دیتے تو ہمارے لیے اس سے مطلع ہونا ناممکن تھا۔اس واقعہ کا مسلمانوں کے حال سے کیا تعلق بنتا ہے کہ یہ لوگ بھی موسیٰ علیہ السلام سے مدد طلب کریں کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فائدہ ملا؟ ان دونوں چیزوں میں بہت دوری ہے۔

بلاشبہ اس طرح کا استدلال کرنا کسی مسلمان کے لیے لائق ہی نہیں۔یہ ایک عجیب بات ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا، یہ لوگ اس کو مباح کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔بلکہ اس طرح کے صریح شرک کا ارتکاب کرنے کے باوجود کہ جو کتاب اللہ کے مخالف ہے پھر یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہم مقلد ہیں۔مقلد پر تو اجتہاد حرام ہے۔آپ اس طرح کے لوگوں کو پائیں گے کہ یہ اجتہاد بھی کرتے ہیں تو ایسے دلائل سے استدلال واجتہاد کرتے ہیں کہ جس طرح کے آج تک نہ کسی مجتہد نے استدلال کیے نہ ہی کسی مقلد نے اس طرح کی کوئی بات کی۔

سوال کیا قبرستان میں جا کر ''السلام علیکم دارقوم مؤمنین'' کہنا اس بات کے منافی نہیں کہ مردے سن نہیں سکتے؟ [فتاوی الامارات۔۸٤]

جواب اس طرح کے سلام سے یہ مراد نہیں کہ مردے سنتے ہیں۔بلکہ یہ تو عربی زبان کا اسلوب ہے۔جیسا کہ صحابہ کرام نبی علیہ السلام کے زمانے میں تشہد میں ''السلام علیك

ایھاالنبی ورحمة اللہ وبرکاتہ" کہا کرتے تھے۔لیکن اس سے قطعاً یہ مراد نہیں کہ وہ جب بھی نماز کے دوران سلام بھیجتے ہیں، نبی علیہ السلام ان کا سلام سنتے ہیں، جبکہ وہ لوگ مختلف مقامات میں نماز پڑھتے تھے۔

سوال ایک شخص مدینہ منورہ کے علاوہ کسی شہر سے نبی علیہ السلام پر سلام بھیجے اور ایک شخص آپ ﷺ کی قبر کے پاس کھڑا ہوکر سلام بھیجے تو کیا ان دونوں میں کوئی فرق ہے؟

جواب ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اہل بیت سے کسی شخص کے بارے میں آتا ہے کہ اس نے ایک شخص کو نبی علیہ السلام کی قبر کے کونے میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس سے وہاں بیٹھنے کی وجہ پوچھی ۔اس شخص نے جواب دیا کہ میں نبی علیہ السلام پر درود بھیج رہا ہوں۔تو اہل بیت کے اس شخص نے کہا کہ کوئی نمازی یہاں بیٹھ کر درود بھیجے اور کوئی اندلس سے درود بھیجے دونوں برابر ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات میں سے یہ بات تھی، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ لِلّٰهِ مَلَائِكَةً سَيَّاحِينَ فِي الْأَرْضِ يُبَلِّغُونِي مِنْ أُمَّتِي السَّلَامَ۔

کہ بے شک زمین میں اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے گھومتے رہتے ہیں کہ جو مجھے میری امت کی طرف سے بھیجا ہوا سلام پہنچاتے ہیں۔

ایک اور حدیث ہے کہ:

"من صلی علی نائیا أبلغته ومن صلیٰ علی قریباً منی سمعته"

"کہ جو شخص دور سے مجھ پر درود بھیجتا ہے وہ مجھے پہنچایا جاتا ہے اور جو شخص قریب سے مجھ پر درود بھیجتا ہے میں اس کو سن لیتا ہوں۔" یہ حدیث موضوع ہے' ثابت نہیں ہے۔ امام عقیلی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے اور محفوظ بھی نہیں ہے اور اس کی متابعت اس سے کم درجہ کے لوگوں نے کی ۔اس سے ان کی مراد سُدی ہے ۔جریر بن حازم نے اس کو کذاب کہا ہے۔ صالح جزرہ فرماتے ہیں کہ یہ شخص حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔مزید تفصیل کے لیے دیکھیں "ھدم المنارہ "ص ۳۱۱ تا ۳۱٦"

(سوال) کیا نبی علیہ السلام کی قبر کی زیارت میں اور عام مسلمانوں کے قبرستان کی زیارت میں کوئی فرق ہے؟ جیسا کہ حدیث میں قبروں کی زیارت کرنے پر ترغیب آئی ہے۔ یا آپ علیہ السلام کی کوئی خصوصیت تھی؟

(جواب) نبی علیہ السلام کی قبر کی کوئی اہم خصوصیت تو نہیں بلکہ اس کی زیارت بھی اسی طرح مشروع ہے کہ جس طرح عام مسلمانوں کی قبر کی زیارت مشروع ہے۔

تو صرف نبی علیہ السلام کی قبر کی زیارت کی نیت سے رخت سفر باندھنا اور چیز ہے اور قبر کی زیارت کرنا اور چیز ہے جبکہ اولیاء اور صالحین کی قبروں کی زیارت کی خاطر سفر کرنا یہ اس سے مختلف ہے۔ یہ آخری سفر جو ہے جائز نہیں، کیونکہ نبی علیہ السلام کا فرمان ہے:

((لَا تَشُدُّوا الرِّحَالَ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِی هَذَا وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى))

"(ثواب کی نیت سے) رخت سفر نہ باندھا جائے۔ تین مسجدوں کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف، مسجد نبوی، مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ۔" تو جو شخص شرعی طور پر نبی علیہ السلام کی قبر کی زیارت کے لیے سفر کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی فضیلت پانے کی نیت سے سفر کرے۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((صلاة فی مسجدی هذابالف صلاة فیما سواه من المساجد المسجدالحرام۔))

"میری مسجد میں نماز پڑھنے کا اجر وثواب دوسری مسجدوں سے ہزار گناہ زیادہ ثواب ہے۔ مسجد حرام کے علاوہ۔"

(سوال) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی علیہ السلام کے وضو کے پانی اور دیگر چیزوں سے تبرک حاصل کرتے تھے۔ تو کیا نبی علیہ السلام اس پر رضامند تھے۔؟ [فتاویٰ الامارات:۸]

(جواب) تبرک تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے لے لیا۔ یہ تو ثابت ہے۔ لیکن اس پر نبی علیہ السلام کی صرف وقتی خاموشی تھی لیکن یہ عمل مسلسل تو نہیں رہا۔

اوراس وقتی خاموش رہنے کی حکمت صلح حدیبیہ کے موقعہ پر واضح ہوگئی تھی کہ جب مشرکین کی طرف سے نمائندے آپ علیہ السلام کے پاس آنے لگے۔ جب وہ نمائندے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کی محبت کو اس مبالغہ کی شکل میں دیکھتے تو وہ حیران ہو جاتے۔ جب اپنے قریشی سرداروں کی طرف واپس جاتے تو ان کو یہی پیغام دیتے کہ محمد علیہ السلام سے صلح کرلو کیونکہ ہم نے قیصر وکسریٰ کو بھی دیکھا۔لیکن محمد علیہ السلام کے ساتھی جتنی ان کی تعظیم کرتے ہیں اتنی کوئی بھی رعایا اپنے بادشاہ کی تعظیم نہیں کرتی۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((لَا تُطْرُونِي كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارَى عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَام فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ فَقُولُوا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ))۔

"مجھے اتنا مت بڑھاؤ کہ جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریم کی تعظیم میں غلو کیا۔ میں بندہ ہی ہوں، مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔" اور ایک بار آپ علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کا مشاہدہ کیا کہ جب وہ آپ علیہ السلام کے وضو کے پانی سے تبرک حاصل کر رہے تھے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ تمہیں اس پر کس چیز نے ابھارا؟ تو صحابہ رضی اللہ عنہم فرمانے لگے: اللہ اور اس کے رسول کی محبت نے۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فاصدقوا في الحديث وادوا الامانة))

"اگر تم واقعی اللہ سے محبت کرتے ہو تو تم باتوں میں سچائی پیدا کرو اور امانت کو ادا کرو۔اس لیے ہم دیکھتے ہیں' تبرک کے لحاظ سے جو ثابت ہے وہ واقعتاً ثابت ہے۔" صلح حدیبیہ کا یہ قصہ صحیح بخاری میں آتا ہے۔بعض لوگ بڑی جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ اگر وہ پہلے آپ علیہ السلام کی خاموشی کی حکمت پہ غور کر لیتے پھر اس حدیث پر مطلع ہوتے تو ان کا اعتراض ختم ہو جاتا۔

توحید اسماء وصفات کے مسائل

سوال آیات صفات متشابہات میں سے ہیں یا کہ محکمات میں سے؟

جواب ایک لحاظ سے تو یہ آیات متشابہات کے حکم میں ہیں۔ کیفیات کے لحاظ سے لیکن دوسری جہت سے اگر غور کیا جائے تو یہ آیات الصفات متشابہات میں سے نہیں ہیں کیونکہ معنی کے اعتبار سے عربی زبان میں ان کا معروف معنی جانا جاتا ہے تو کیفیت کے لحاظ سے یہ آیات متشابہات ہوئیں کیونکہ ہمارے لیے اللہ کی ذات کو پہچاننا ہی جب محال ہے تو یقیناً اللہ کی صفات پہچاننا بھی ممکن نہیں۔

اس لئے خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ صفات کے بارے میں بھی نفی واثبات کے لحاظ وہی کچھ کہنا چاہیے کہ جو ہم اللہ کی ذات کے بارے میں کہتے ہیں تو جس طرح ہم اللہ کے لیے ذات ثابت کرتے ہیں' ذات کی نفی نہیں کرتے' نفی سے مراد ہے مطلق انکار۔ تو اسی طرح صفات کے بارے میں بھی ہمارا یہی عقیدہ ہے کہ ہم اللہ کے لیے صفات ثابت کرتے ہیں۔ اس کی نفی نہیں کرتے لیکن جس طرح اللہ کی ذات کی ہم کیفیت بیان نہیں کرتے اسی طرح صفات کی بھی کیفیت بیان نہیں کرتے۔

سوال ان اللہ خلق آدم علیٰ صورتہ اس میں ''ہ'' ضمیر کا مرجع کیا ہے؟

جواب میرے علم کے مطابق اس حدیث میں تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ امام بخاریؒ نے یہ حدیث اپنی صحیح میں مکمل روایت کی ہے کہ جس وجہ سے اس میں تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔ حدیث اس طرح ہے:

((خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ طُولُهُ......))

بے شک آدم کو اللہ تعالیٰ نے آدم کی انہی کی صورت پر پیدا کیا کہ ان کا قد ساٹھ ہاتھ ہے۔ ''صورتہ'' اس لفظ میں جو ضمیر ہے یہ اللہ کے بجائے آدم ہی کی طرف لوٹ رہی ہے۔

یہی حدیث بعض سنن کی کتب میں یوں مروی ہے:

((ان الله خلق آدم على صورة الرحمن))

کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم کو رحمٰن کی شکل وصورت میں پیدا کیا۔ تو یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ ضعیف ہے کیونکہ حبیب بن ابی ثابت کی روایت سے مروی ہے۔ یہ روای مدلس ہے اور اس سے تمام طرق میں عنعن سے روایت کیا ہے۔ ہمارے علم کے مطابق اسی پر ساری حدیث کا دارومدار ہے۔

کیا اللہ کو تردّد ہوتا ہے؟

سوال حدیث قدسی ہے: ''جو کام میں کرتا ہوں' مجھے اس میں تردد نہیں ہوتا۔'' اس حدیث میں ''تردّد'' کا کیا مطلب ہے؟

جواب سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''بے شک اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی تو میں اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں' اور میرا بندہ میری اس پر فرض کردہ چیزوں کے ذریعے میرے قریب ہوتا ہے اور میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعے میرے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پس جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کے کان بن جاتا ہوں' جس سے وہ سنتا ہے' اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں' جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کی ٹانگ بن جاتا ہوں' جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے۔ تو ضرور اسے عطا کرتا ہوں اور اگر مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو ضرور اسے پناہ دیتا ہوں اور کسی کام کو کرتے ہوئے مجھے تردّد نہیں ہوتا۔''

حدیث میں مذکورہ ''تردّد'' کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے درست جواب دیا ہے۔ جسے امام صاحب کی عزت اور اہمیت کے پیش نظر اختصار کے

ساتھ نقل کر دیتا ہوں۔ شیخ الاسلام نے (مجموعہ الفتاوی ۱۸/ ۱۲۹-۱۳۱) میں فرمایا:
یہ حدیث شریف اولیاء کی صفت میں اہم حدیث ہے۔
اور ایک گروہ نے اس کا رد کرتے ہوئے کہا:
''اللہ تعالیٰ کو تردّد کے ساتھ موصوف نہیں کیا جا سکتا' اس لیے کہ تردّد کا شکار وہ شخص ہوتا ہے جو معاملات کے انجام سے بے خبر ہوتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو تمام معاملات کے انجام و حال سے باخبر ہے اور ان میں سے کچھ بسا اوقات یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ ''بے شک اللہ تعالیٰ تردّد کا معاملہ بھی کرتا ہے۔''
تحقیق اس بات کی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا کلام حق ہے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس کے رسول ﷺ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا اور نہ ہی امت کا آپ ﷺ سے بڑھ کر کوئی خیرہ خواہ اور فصیح و عمدہ کلام کرنے والا ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو خود کو ہوشیار سمجھنے اور ڈینگیں مارنے' اس حدیث کا انکار کرنے والا سب سے بڑا گمراہ' جاہل اور بے ادب ہے۔ بلکہ ایسے شخص پر تادیب و تعزیر واجب ہے۔ ایسے باطل گمان اور فاسد عقائد سے رسول اللہ ﷺ کے کلام کو محفوظ رکھنا فرض ہے۔
لیکن ہم میں سے جو متردد ہے' وہ اگر معاملات کے انجام سے لاعلمی کی وجہ سے تردّد کا شکار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو ان صفات' معاملات کے ساتھ متصف نہیں کیا جا سکتا' جس سے ہم میں سے کسی کو منصف کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔
پھر علی الاطلاق تردّد کو شک کے معنی میں لینا بھی باطل ہے۔ اس لیے کہ کبھی کوئی انجام و نتائج سے لاعلمی کی وجہ سے تردّد کرتا ہے' تو کبھی دو کاموں کے فوائد اور مفاسد کی وجہ سے تردّد کرتا ہے تاکہ وہ فائدے والے کام کا ارادہ کرے اور نقصان کی وجہ سے اس کام کو ناپسند کرتا ہے۔ تاکہ اس چیز کے انجام سے بے خبری کی وجہ سے' جیسے ایک طرف سے پسند اور دوسری جانب سے ناپسند کیا جاتا ہے......!! اور اس کی مثال مریض کا

ناپسندیدہ دوا کا ارادہ کرتا بھی ہے(یعنی وہ دوا کو ناپسند کرتا ہے' لیکن صحت کے لیے اسے پسند بھی کرتا ہے) بلکہ بندہ جن اعمال صالحہ کا ارادہ کرتا ہے' تو اسے دل ناپسند کرتا ہے اور حدیث مذکور میں ''تردّد'' بھی اسی سے تعلق رکھتا ہے اور ''صحیح بخاری'' میں حدیث ہے کہ:

((حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ وَحُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ))

''جہنم کو پسندیدہ چیزوں نے گھیرا ہوا ہے اور جنت کو ناپسندیدہ چیزوں نے گھیرا ہوا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

((كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَكُمْ))۔(البقرہ۔۲۱۶)

''تم پر قتال فرض کیا گیا ہے' حالانکہ وہ تمھیں ناپسند ہے۔''

اسی سے حدیث میں ''تردّد'' کا معنی ظاہر ہے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((لايزال عبدي يتقرب الي بالنوافل حتى احبه))

''میرا بندہ نوافل کے ذریعے مسلسل میرے قریب ہوتا رہتا ہے' حتیٰ کہ میں اسے محبت کرنے لگتا ہوں۔''

یہ بندہ جس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ محبوبِ حق بن جاتا ہے۔ اس حق سے محبت کرنے والا ہوتا ہے۔

پہلے وہ اللہ کے پسندیدہ فرائض کے ذریعے اللہ کے قریب ہوتا ہے' پھر بندہ نوافل میں کوشش کرتا ہے جن سے اور جن کے کرنے والے سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے تو بندہ ہر وہ کام کرتا ہے جو اللہ کو محبوب ہوتا ہے۔

لہٰذا اللہ اپنے محبوب عمل کے کرنے پر اس بندے سے دو وجہ سے محبت کرتا ہے۔

ایک اللہ اور بندے کا اس کام کے کرنے میں ارادہ کا متفق ہونا' دوسرا بندہ کا اس چیز سے محبت کرنا جسے محبوب پسند کرے اور اس چیز کو ناپسند کرنا جسے محبوب ناپسند کرتا ہے۔

اور رب تعالیٰ اپنے بندے اور محبوب کے غمگین و پریشان ہونے کو ناپسند کرتا ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موت کو اس لیے اپنے بندے سے ناپسند کرتا ہے تاکہ وہ اس کے محبوب کاموں سے محبت کرتا رہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی نے اس کی موت کا فیصلہ کیا ہوتا ہے۔

لہٰذا ہر وہ کام جس کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا ہے وہ لازماً اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی موت کا ارادہ کرتا ہے کہ اس کا فیصلہ ہو چکا ہے جبکہ وہ اپنے بندے کو تکلیف وغم جو موت سے اسے پہنچتی ہے' دینا ناپسند کرتا ہے۔ اس اعتبار سے موت حق تعالیٰ کی طرف سے ارادہ ہوتی ہے جبکہ دوسرے اعتبار سے وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور یہ ہی ''تردّد'' کی حقیقت ہے۔

یعنی ایک اعتبار سے کسی ایک چیز کی چاہت (ارادہ) ہوتی ہے جبکہ دوسری جانب سے ناپسندیدہ ومکروہ' اگرچہ ان دونوں میں سے کسی کو ترجیح دینا لازمی ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ اپنے بندے کے غم و تکلیف کے باوجود' اس کے لیے موت کو ترجیح دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا اپنے محبوب مومن کے لیے موت کا ارادہ کرنا اور اس کی تکلیف کو ناپسند کرنا' اس کافر کی موت کے ارادے جیسا نہیں جس سے اللہ تعالیٰ نفرت بھی کرتا ہے اور اسے تکلیف بھی دینا چاہتا ہے۔''

شیخ الاسلام نے دوسری جگہ (۱۰/ ۸۹۔۵۷) پر فرمایا:

''پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے واضح کر دیا کہ وہ تردّد کرتا ہے' اس لیے کہ تردّد دو ارادوں کے تعارض کا نام ہے پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندے کی پسند کو پسند کرتا ہے اور جسے بندہ ناپسند کرے وہ بھی ناپسند کرتا ہے۔ جیسے بندہ موت کو ناپسند کرتا ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اس کے لیے موت ناپسند کرتا ہے۔

جیسا کہ ارشاد فرمایا:

((وانا اكره مساءته))

"اور میں اپنے بندے کی تکلیف کو ناپسند کرتا ہوں۔"

(معلوم ہوا کہ پھر بھی) اللہ تعالیٰ اس کی موت کا ارادہ کرتے ہوئے اس کی موت کا فیصلہ فرماتا ہے پس اسی کا نام "تردّد" ہے۔[نظم الفرائد ۱: ۳۷-۳۵]

سوال معصوم عن الخطاء صرف اللہ کی ذات ہے کیا یہ جملہ صحیح ہے؟ کیا یہ جملہ انبیاء کے معصوم عن الخطاء ہونے کے منافی ہے، اور کیا اللہ تعالیٰ کے لیے صفت معصوم بیان کرنا درست ہے؟

جواب یہ عبارت درست نہیں ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ انبیاء معصوم نہیں ہیں کیونکہ اللہ کے لیے وہ عصمت ثابت ہے کہ جس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ یعنی اس عصمت کے ہوتے ہوئے غلطی کا امکان ہی نہیں ہے۔ انبیاء کرام بھی معصوم ہیں لیکن مطلق طور پہ نہیں۔ کیونکہ صحیح بخاری و مسلم میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث موجود ہے کہ جب آپ علیہ السلام نے ایک دن بھول کر ظہر کی نماز میں ایک رکعت زائد کر دی تھی کہ پھر آپ فرمانے لگے:

((أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ أَنْسَى كَمَا تَنْسَوْنَ فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي))

کہ میں تمہارے جیسا ہی ایک بشر ہوں میں بھول جاتا ہوں کہ جس طرح تم بھول جاتے ہو۔ جب میں بھول جاؤں تو تم مجھے یاد کروا دیا کرو۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے لیے "العصمۃ للہ" کی طرح کا جملہ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے بطور وصف بھی یہ لفظ نہیں بولنا چاہیے۔

سوال ان دو باتوں میں تطبیق کیسے دیں؟ ایک یہ کہ جو کچھ رحموں میں ہے، اسے اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا۔ دوسرا یہ کہ جس طرح ڈاکٹر بچے کی پیدائش سے پہلے اس کی جنس بتا دیتے ہیں کہ وہ بچہ ہے یا کہ بچی؟

جواب ان باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رحموں میں جو کچھ ہے اسے اکیلا جانتا ہے۔ اس میں دو چیزیں ہیں:

پہلا معاملہ: کہ اللہ تعالیٰ ذاتی علم کے ذریعہ سے جانتا ہے۔ جبکہ لوگ مختلف وسائل کے ذریعہ سے معلوم کرتے ہیں کہ ان وسائل کو اللہ تعالیٰ جسے چاہے مہیا کر دے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جس طرح چاند گرہن کی خبر وقوع ہونے سے کافی پہلے دے دیتے ہیں۔ لیکن ایسے آلات کے ذریعہ سے کہ ان کو اللہ تعالیٰ ہی نے ان بندوں کے لیے مسخر کر دیا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۝ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ ﴾

[الجن: ٢٦، ٢٧]

اللہ تعالیٰ غیب کو جاننے والا ہے تو اسے اپنے کسی بندے پر ظاہر نہیں فرماتا مگر جس رسول کے لیے چاہے۔

غور فرمایئے! ان آیات کے اندر کس طرح اللہ تعالیٰ نے علم غیب کے درمیان فرق کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ذاتی طور پر غیب کو جانتے ہیں۔ باقی جو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہمارے پاس بسا اوقات ایسی چیزیں لاتے ہیں کہ جن کا تعلق غیب سے ہوتا ہے تو وہ ان کا ذاتی علم نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اس پر ان کو مطلع فرماتے ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ وسائل میں سے کسی وسیلہ کو استعمال کر کے اس کے ذریعہ غیب کی کوئی چیز معلوم کر لینا عالم الغیب نہیں ہے۔

دوسرا معاملہ: کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے:

﴿ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ﴾ [لقمان: ٣٤]

کہ وہ اللہ ہی جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے رحموں میں ہے۔ تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اکیلا ہی تفصیلی طور پہ جانتا ہے کہ جو ماں کے پیٹ میں ہے۔ وہ لڑکا ہے کہ لڑکی، نیک بخت ہے یا بد بخت، مکمل ہے کہ ناقص الخلق۔ اس کے علاوہ دوسری بھی تفصیلات جو ہیں وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ کسی بندے کے لیے یہ چیزیں معلوم کرنا ناممکن ہے۔

ایمان کے مسائل کا بیان

وعدہ' وعید' تارک الصلاۃ کا حکم

سوال مسلمانوں میں سے بعض لوگ نماز بھی پڑھتے ہیں' روزہ بھی رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اولیاء اور سابقہ نیک لوگوں کے بارے میں کچھ شرکیہ عقائد بھی رکھتے ہیں۔ تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ اسلام سے خارج ہیں اور ہمیشہ جہنم میں رہنے والے ہیں؟ ''فتاویٰ المدینہ ۹۴''

جواب اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا ﴾ [الاسراء:۱۵]

''کہ ہم اس وقت عذاب نہیں دیتے کہ جب تک ہم کسی رسول کو نہ وہاں بھیج دیں۔''

جب ان لوگوں کے پاس رسول دعوت لے کر آئے یا کسی اور ذریعہ سے دعوت پہنچ جائے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے۔ پھر بھی انکار کریں تو اس وقت یہ لوگ اور مشرک برابر ہیں۔ اگر ان کو دعوت نہیں پہنچی کہ جس طرح نبی علیہ السلام کے دل پہ نازل ہوئی تو ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے ہے کہ جس طرح وہ آدمی کہ جس کو آخر عمر میں دعوت پہنچی ہو یا اس بدحواس آدمی کی طرح ہے کہ جو دعوت نہیں سمجھ سکتا اور بھی اس طرح کے دوسرے اسباب ہیں کہ جن کا ذکر حدیث میں آیا ہے۔ تو اس طرح کے لوگوں سے قیامت کے دن خاص معاملہ کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کو آگ میں داخل نہیں کیا جائے گا، اگر وہ کفار کے حکم میں ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی طرف اپنے پیغمبر بھیجے گا جس نے اس کی اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے اس کی نافرمانی کی وہ آگ میں داخل

ہو گا۔اس طرح کے جاہل لوگوں کے بارے میں مطلق طور پہ مواخذہ کرنے کی بات کرنا صحیح نہیں ہے۔ ہاں ایک صورت ہے کہ اگر ان کو صحیح طور پر دعوت پہنچی اور اس کے باوجود انکار کردیا ایمان نہ لائے تو ان کا مواخذہ ہوگا۔

کیا محبت وطن ایمان ہے؟

سوال: کیا وطن سے محبت کرنا ایمان ہے' جیسا کہ ایک حدیث بھی ہے۔ وضاحت فرمائیں؟

جواب: "حب الوطن من الایمان"

"وطن سے محبت کرنا ایمان میں سے ہے۔"

یہ حدیث موضوع ہے۔(سلسلة الاحادیث الضعیفه۔۳۲)

اوراس کا معنی بھی درست نہیں کیونکہ حب وطن' نفس اور مال جیسی محبت کی طرح ہے اور یہ سب انسانی طبیعت کا حصہ ہیں۔جس کی محبت پر تعریف نہیں کی جاتی اور نہ ہی یہ ایمان کے لیے لازم ہے۔

کیا آپ نے مشاہدہ نہیں کیا کہ لوگ اس محبت میں باہم شریک ہوئے ہیں۔خواہ مؤمن ہوں' یا کافر' اس بارے میں ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔[نظم الفرائد: ١/٤٤]

سوال: کافروں کے بچوں کے بارے میں کیا حکم ہے' آیا وہ جنتی ہیں یا جہنمی؟

جواب: کفار کی اولاد جنت میں ہوگی۔سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں نے اللہ تعالیٰ سے لاھین کے بارے میں سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ عطا فرمادیئے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے کہا:

"لاھون کیا ہے؟"

تو ارشاد فرمایا:

''انسان کی اولاد''

یہ حدیث حسن ہے۔ اور حدیث میں ''اللا ھین'' سے مراد ''بچے'' ہیں۔ جیسا کہ طبرانی (١١٩٠٧) میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حسن درجہ حدیث ہے۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کفار کے بچے جنت میں ہوں گے اور یہ بات ہی راجح ہے۔ جیسا کہ ہم نے کتاب ''ظلال الجنۃ ١/ ٩٠'' میں بیان کیا ہے۔

[نظم الفرائد ١/ ٤٦] [1]

[1] (اس مسئلہ کے بارے میں اختلاف ہے اور ایک قول کے مطابق تو اس میں توقف کو بہتر قرار دیا گیا ہے کیونکہ ان کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابن القیم نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ وہ ہوں گے تو جنت میں لیکن مسلمانوں کے خادم ہوں گے۔ (راشد)

سوال آپ نے ''صحیح الترغیب والترھیب'' میں لکھا ہے کہ جو شخص پانچوں نمازیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق پڑھتا ہے اس کے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ کبائر سمیت۔ جبکہ امام نووی رحمہ اللہ نے قاضی عیاض سے نقل کیا ہے کہ جماعت اہل السنہ کا موقف یہ ہے کہ کبیرہ گناہ توبہ یا اللہ کی رحمت کے ساتھ معاف ہوتے ہیں۔ اس کے بغیر نہیں۔ وضاحت فرمائیے۔ [فتاویٰ المدینہ: ٣٥]

جواب اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور توبہ یہ بھی گناہوں کو مٹانے والے اسباب میں سے ہیں کہ جن کا ذکر حدیث میں آیا ہے۔ باقی جو قول امام قاضی عیاض سے منقول ہے اس کی نسبت اہل السنہ کی طرف کرنا درست نہیں ہے۔ قاضی عیاض کے اس قول کو کیسے قبول کیا جائے گا جبکہ نبی علیہ السلام کا فرمان ہے:

((مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ))

''جس نے حج کیا اور فسق و فجور نہیں کیا، تو وہ گناہوں سے اس طرح بری ہو جاتا ہے جس طرح اسی دن اسے اس کی ماں نے جنم دیا ہو''

تو اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ کہ صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں اور کبیرہ گناہ

باقی رہ جاتے ہیں؟ یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ کبیرہ گناہ توبہ اوراللہ کی رحمت کے علاوہ معاف نہیں ہوسکتا جبکہ نبی علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ كَمَثَلِ نَهْرٍ جَارٍ غَمْرٍ عَلَى بَابِ أَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ مِنْهُ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسَ مَرَّاتٍ۔فَذَلِكَ مِثْلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ يَمْحُو اللّٰهُ بِهِ الْخَطَايَا؟

کہ پانچ نمازیں پڑھنے کی مثال اس نہر کی طرح ہے کہ جو تم میں سے کسی کے گھر کے آگے سے گزر رہی ہو اور وہ اس میں پانچ مرتبہ غسل کرے تو کیا اس کے جسم پر اس کے میل میں سے کچھ رہے گا؟ تو صحابہ نے کہا نہیں اے اللہ کے رسول! پھر آپ ﷺ نے فرمایا: پانچوں نمازوں کی مثال بھی اسی طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ ان نمازوں کے ذریعہ سے انسان کے گناہوں کو مٹادیتا ہے۔

تو کیا مطلب ہے کہ یہ کہا جائے کہ چھوٹے چھوٹے میل کے ٹکڑے گر جاتے ہیں اور بڑے بڑے ٹکڑے رہ جاتے ہیں؟ باقی یہ بات کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا: کہ جب تک کبائر کا ارتکاب نہ کرے۔ یہ قید کسی زمانے میں تھی پھر یہ چیز اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور فضل کے ساتھ اٹھالی۔ ①

①(اس بارے میں میرے علم کے مطابق بھی شیخ البانی رحمہ اللہ کا موقف درست ہے۔کہ کبائر گناہ بغیر توبہ کے بھی معاف ہوسکتے ہیں۔شرح العقیدہ الطحاویۃ میں اس کے بارے میں بڑی تفصیلی بحث موجود ہے اور وہاں صاحب العقیدہ نے دس ایسے اعمال تفصیلاً بیان کیے ہیں جن سے کبیرہ گناہ بھی معاف ہوجاتے ہیں۔(راشد)

سوال اول مایحاسب علیه المرالصلاۃ فان صلحت صلح سائرعمله وان فسدت فسدسائر عمله ۔کہ قیامت کے دن سب سے پہلے بندے سے نماز کا حساب کیا جائے گا۔اگر نماز درست ہوئی تو اس کے سب عمل درست ہوں گے اوراگر نماز ناقص ہوئی تو اس کے تمام اعمال ناقص شمار ہوں گے۔تو کیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے سستی کی وجہ سے نماز نہ پڑھی اس نے اللہ کے ساتھ کفر کیا ہے؟[فتاویٰ المدینہ]

جواب میں اس حدیث سے یہ نہیں سمجھتا کہ یہ کفر خارج عن الملۃ ہے۔ کیونکہ قرآن وحدیث میں جہاں جہاں کفر کا ذکر آیا' اس سے مراد مرتد کرنے والا کفر نہیں ہے بلکہ کفر کی قسمیں ہیں۔ ایک کفر اعتقادی دوسرا کفر عملی ہے، اور اس کفر کی تقسیم ممکن ہے، کفر قلبی اور کفر لفظی میں۔

کچھ ایسی صریح احادیث ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نے نماز چھوڑی اس نے کفر کیا۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ سستی کی وجہ سے نما چھوڑنے والا ہے کہ جب نماز کے مشروع ہونے کا' اعتقاد رکھتا ہو اور اپنی کوتاہی کا بھی اعتراف کرتا ہو نماز چھوڑنے کی۔ شیطان کا یا اپنی خواہش کا پیروکار ہونے کی وجہ سے یا اپنی کسی اور مصروفیت کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے لیکن نماز کی مشروعیت کا انکار نہیں کرتا اور دل کے ساتھ ایمان بھی رکھتا ہے لیکن وہ اپنے ایمان کے مطابق عمل نہیں کرتا۔

اس لحاظ سے جس نے نماز چھوڑی گویا کہ کفر والوں کے کام میں شرکت کی' اس عمل میں۔ اس لیے ہم کہتے ہیں یہ کہ اس کا عمل کفر والا عمل ہے۔ یہ صرف اس کی بات نہیں ہے بلکہ بہت سارے اس طرح کے عمل ہیں مثلاً زنا حرام ہے لیکن کوئی اگر کرے تو وہ اس عمل سے کافر نہیں ہوگا' چوری حرام ہے لیکن چور کافر نہیں۔ لیکن بسا اوقات' ہمیں کچھ نوجوانوں سے یہ بات سننے میں آتی ہے کہ جو خود دنیا میں بری طرح گھسے ہوئے ہوتے ہیں کہ جی نماز کا دور چلا گیا۔ بالکل اس طرح کا آدمی اسلام سے نکل جاتا ہے۔

دراصل قاعدہ یہ ہے کہ ہم پر واجب ہے کہ ہم اس بات کا عقیدہ رکھیں کہ اسلام کا تعلق عقائد واعمال دونوں کے ساتھ ہے اور عقیدہ اصل چیز ہے عمل اس کا پیروکار ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ سستی سے نماز کو چھوڑنے والا اس کے باوجود کہ نماز کے وجوب کا عقیدہ رکھتا ہو تو اس کا یہ کفر عملی ہے۔ اس سے مراد نہیں کہ یہ بندہ مرتد ہوگیا اور یہ مسئلہ علماء کے درمیان اختلافی ہے۔

ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تارک الصلاۃ کو جیل میں ڈالا جائے گا یہاں تک کہ

توبہ کر لے یا وہیں مر جائے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور دیگر علماء فرماتے ہیں کہ تارک الصلاۃ کو نماز کا حکم دیا جائے گا اگر توبہ کر لے اور نماز پڑھے وگرنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ حد کی وجہ سے کفر کی وجہ سے نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے شخص کو جب لایا جائے گا تو اس پر تلوار سونت لی جائے گی اور کہا جائے گا کہ نماز پڑھ وگرنہ ہم تجھے قتل کر دیں گے۔ اگر تو اس نے قتل کو توبہ پر ترجیح دی تو اس شخص کو کبھی بھی مسلمان تصور نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ وہ اعتقادی طور پر ہی کافر شمار ہوگا۔ وگرنہ وہ کیسے توبہ پر قتل ہونے کو ترجیح دے سکتا ہے۔ سوال میں جو حدیث مذکور ہے اس کی نسبت سے آپ یہ سمجھ لیں کہ تارک الصلاۃ کے دوسرے اعمال قبول نہیں ہوتے۔

سوال کیا حجت قائم ہونے کے لیے صرف دعوت کا پہنچنا ضروری ہے یا سمجھنا بھی اس کا ضروری ہے؟

جواب اس دعوت کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ﴾ [ابراھیم: ٤]

''اور ہم نے جو بھی رسول بھیجا وہ اسی قوم کی زبان والا بھیجا تاکہ ان کے لیے وہ آسمانی احکامات واضح طور پہ بیان کر دے۔'' لیکن یہاں سوال کرنے سے مقصود یہ ہے کہ بعض دفعہ دعوت تو پہنچتی ہے لیکن بعض لوگ سمجھ نہیں پاتے تو کیا وہ معذور شمار ہوں گے؟

اس سوال کو یوں سمجھ لیں کہ نبی علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عرب کی طرف رسول بنا کر بھیجا، ان کی اپنی زبان عربی ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ کسی عربی کو رسول علیہ السلام کی دعوت سمجھ میں نہ آئی ہو اور ہم کہیں کہ یہ معذور ہے! یہ ممکن نہیں ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس بھیجے ہوئے پیغمبر نے۔

کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرما دی کہ ہر قوم میں حجت اس قوم کی زبان میں ہم نے قائم کی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قطعی دلیل پر محمول ہے کہ ہر انسان اسے سمجھ سکتا ہے۔

ہم فرض کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے علماء میں سے ایک عالم شخص یورپ والوں کے پاس جاکر ان کو ان کی ہی زبان میں اچھی طرح سے دعوت سمجھاتا ہے اور ان پر حجت قائم کرتا ہے' اس دین کی ایمان اور عقیدے کے حوالہ سے۔ کیا یہ جواب بدل جاتا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ بے شک ممکن ہے کہ یہ عالم دین اپنے بیان میں کوئی کمی بیشی کرے۔ لیکن واجب ہے کہ ہم تصور کریں کہ ہم میں سے ہر فرد اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کا دعویٰ کرے' پورے مکمل بیان کے ساتھ۔ پھر ایمان نہ لائے تو وہ کافر ہے۔ اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ اصول ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا۔ (الاسراء۔ ۱۵)

''کہ ہم اس وقت عذاب نہیں دیتے کہ جب تک ہم ان میں اپنا رسول نہ بھیج دیں۔''

کفر اعتقادی اور عملی:

سوال وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَکی وضاحت فرمادیں؟

جواب سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''بے شک اللہ عزوجل نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ [المائدہ:٤٤]

﴿فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ [۴۵]

﴿فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ [المائدہ:۴۷]

یعنی جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے نازل کیا ہے تو ہی کافر ہیں۔''

آیت ۴۵ میں فرمایا:

''وہی لوگ ظالم ہیں۔''

آیت ۴۷ میں فرمایا:

''وہی لوگ نافرمان ہیں۔''

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ آیات اللہ تعالیٰ نے یہود کے دو گروہوں کے متعلق نازل کیں۔ جن میں سے ایک دوسرے پر جاہلیت میں غالب آ گیا۔ حتیٰ کہ وہ آپس میں اس بات پر رضامند ہو گئے اور صلح کر لی کہ ہر مغلوب مقتول جسے غالب نے قتل کیا تو اس کی دیت پچاس (۵۰) وسق ہے اور ہر غالب مقتول جسے مغلوب نے قتل کیا تو اس کی دیت سو (۱۰۰) وسق ہے۔

اسی دوران رسول اللہ ﷺ (مکہ سے) مدینہ تشریف لے آئے' تو ان دونوں کی عزت ومقام میں رسول اللہ ﷺ کی آمد سے کمی واقع ہوئی اور ان دنوں آپ ﷺ نے ان پر غلبہ پایا تھا' نہ ہی ان کی صلح کو پامال کیا تھا۔

اسی دوران مغلوب گروہ میں سے کسی نے غالب گروہ کے کسی فرد کو قتل کیا تو انہوں نے سو (۱۰۰) وسق دیت کا مطالبہ کیا' تو مغلوب گروہ نے کہا: کیا کبھی دو ایسے قبیلوں میں ایسا ہوا ہے کہ جن کا دین' نسب' علاقہ ایک ہو اور ان میں ایک کی دیت دوسرے سے نصف (آدھی) ہو۔ ہم تو تمہیں صرف تمہارے ظلم وزیادتی اور ڈر کی وجہ سے پوری دیت دیتے رہے ہیں۔ اب جبکہ محمد ﷺ آ گئے ہیں تو ہم تمہیں کچھ نہیں دیں گے۔ تو ان کے درمیان جنگ دوبارہ بھڑکنے کے قریب تھی کہ پھر وہ اس بات پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ کو آپس میں ثالث مقرر کر لیں۔ پھر غالب گروپ نے (آپس میں مشورہ کرتے ہوئے) کہا:

''اللہ کی قسم! محمد ﷺ تمہیں ان (مغلوب) سے وہ نہیں لے کر دیں گے' جو تم بطورِ دیت انھیں نصف دیتے ہو۔ اور مغلوب گروہ نے سچ کہا ہے کہ وہ تو ہمیں یہ ہمارے ظلم وغلبہ کی وجہ سے ہی ہمیں دیتے ہیں۔ لہٰذا مخفی طور پر کسی کو محمد ﷺ کی طرف بھیجو تاکہ وہ ان کی رائے معلوم کر لے' تاکہ اگر وہ تمہیں (غالب گروہ کو) تمہاری مرضی کے مطابق دیں گے تو انھیں حاکم مقرر کر لو اور اگر وہ اس پر راضی نہیں ہیں تو پھر ان سے

بچتے ہوئے ان سے فیصلہ نہ کراؤ۔

توانہوں نے منافقین کوخفیہ طور پر رسول اللہ ﷺ کی طرف بھیجا تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ کی رائے معلوم کریں۔

جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سارے معاملے کی خبر آپ ﷺ کو دے دی تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی۔

﴿ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا﴾۔(سورة المائده۔٤١)

''اے رسول! تجھے وہ لوگ غمگین نہ کریں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں ان لوگوں میں سے جنھوں نے اپنے مونہوں سے کہا: ''ہم ایمان لائے۔''

آیت نمبر ۴۷ تک نازل فرمائی کہ:

''جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی نافرمان ہیں۔''

پھر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! یہ آیت ان دونوں کے متعلق نازل ہوئی اور یہ دونوں گروہ ہی اللہ کی مراد ہیں۔''

یہ حدیث حسن ہے۔[سلسلة الاحاديث الصحيحه :٢٥٥٢]

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ تینوں آیات :

﴿فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾[المائده:٤٤] ﴿ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ [۴۵] ﴿ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ [المائده:٤٧]

یہود کے اور نبی اکرم ﷺ کے متعلق ان کے اس قول ''اگر محمد ﷺ تمہاری پسند تمہیں دے دیں تو انہیں حاکم بنا لو اور اگر وہ تمہیں نہ دیں تو ان سے بچتے ہوئے انہیں حاکم نہ بناؤ۔'' کے بارے میں نازل ہوئی۔

اور قرآن نے ان کے اس قول کی طرف ان آیات سے پہلے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

﴿ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَذَا فَخُذُوهُ وَإِنْ لَمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا﴾ [المائده:٤١]

’’وہ کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ چیز دے دی گئی تو لے لو اور تمہیں نہ دی گئی تو (اس صورت میں) بچنا۔‘‘

یہ بات معلوم ہوگئی تو ان آیات کو بعض مسلمان حکمرانوں اور ان کے جج جو ارضی قوانین سے جو اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں کیے' فیصلے کرتے ہیں پر چسپاں کرنا جائز نہیں ہے۔
میں کہتا ہوں کہ اس وجہ سے ان کی تکفیر کرنا' انہیں ملت اسلامیہ سے باہر نکال دینا جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاتے ہیں' جائز نہیں۔
اگرچہ وہ اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ نہ کرنے کی وجہ سے مجرم ہیں۔
(لیکن) اس وجہ سے ان کی تکفیر جائز نہیں' اس لیے کہ یہ فیصلہ کرنے کے اعتبار سے حکم میں یہود کی طرح ہیں۔ (لیکن) اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ پر ایمان لانے اور اس کی تصدیق کرنے کی وجہ سے یہود کے مخالف ہے' کیونکہ یہود اور کفار منزل من اللہ پر ایمان و تصدیق نہیں کرتے' بلکہ وہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر یہود کا یہ قول اس پر دلیل ہے کہ ’’اگر محمد ﷺ تمہیں (تمہاری مرضی کے مطابق) نہیں دیتے تو پھر بچو۔‘‘
اس پر مستزاد یہ کہ وہ مسلمان بھی نہیں ہیں۔
اس تفصیل سے واضح ہوا کہ کفر کی دو قسمیں ہیں۔ ① اعتقادی۔ ② عملی۔
اعتقاد کا مقام دل اور عمل کا مقام دیگر اعضاء ہیں۔
لہٰذا جس کا عمل شریعت کے مخالفت کی وجہ سے کفر ہے اور وہ دل میں موجود جاگزیں کفر کے مطابق بھی ہے تو یہ اعتقادی کفر ہے، جسے اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا اور اس کے مرتکب کو ہمیشہ کے لیے داخلِ جہنم کرے گا اور اگر عمل مخالف شریعت ہونے کے باعث کفریہ ہے، لیکن دل کا معاملہ اس کے برعکس ہے وہ اپنے رب کے فیصلے پر ایمان رکھتے ہوئے اپنے عمل سے اس کی مخالفت کرتا ہے، تو اس کا یہ کفر عمل ہے، کفر اعتقادی نہیں۔
ایسا شخص رب تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہے، چاہے تو عذاب دے، اگر چاہے تو بخش دے اور کفر کی اس قسم پر ان احادیث کو محمول کیا جائے گا' جن میں معصیت کے

ارتکاب پر لفظ کفر لاگو ہوا ہے۔ چند ایک حسب ذیل ہیں:

① لوگوں میں دو کفر کی خصلتیں ہیں۔ ① نسب میں عیب جوئی۔ ② میت پر نوحہ کرنا۔[صحیح مسلم]

② قرآن میں جھگڑنا کفر ہے۔[صحیح الجامع الصغیر ۳/۸۳/۳۱۰۱]

③ مسلمان کو گالی دینا فسق اور لڑائی کرنا کفر ہے۔[مسلم]

④ نسب سے بیزاری اللہ کے ساتھ کفر ہے' اگرچہ یہ بیزاری کم ہی ہو۔

[الروض النضیر:۵۸۷]

⑤ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بیان کرنا شکر' اور اسے بیان نہ کرنا کفر ہے۔

[سلسلة الصحیحه:٦٦٧]

⑥ میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔[متفق علیه]

اس طرز کی بے شمار احادیث ہیں۔ جنھیں بیان کرنے کا یہ مقصد نہیں کہ پس جس مسلمان نے ان گناہوں کا ارتکاب کیا تو اس کا یہ کفر عملی ہے۔ یعنی وہ کفار کا سا عمل کر رہا ہے۔ سوائے اس کے وہ اس گناہ' معصیت کو جائز سمجھے اور اسے گناہ ہی نہ جانے تو اس صورت میں وہ کافر ہے اور اس کا خون جائز ہے۔ اس لیے کہ وہ کفار کے عقیدے میں ان کا شریک ہو گیا ہے۔

اور منزل من اللہ کے علاوہ سے فیصلہ کرنا' کبھی بھی اس قاعدے سے خارج نہیں ہو سکتا۔

اس موقف کو سلف کے قول سے بھی تقویت ملتی ہے کہ وہ آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ یہ "کفر دون کفر" ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ ترجمان القرآن سے اس بارے میں صحیح ثابت ہے۔ پھر ان سے بعض تابعین نے اسے حاصل کیا ہے۔ اور مجھے اس بارے میں جو میسر ہوا اسے بیان کروں گا' شاید کہ یہ مینارہ راہ بن جائے' ان لوگوں کے سامنے جو اس اہم مسئلہ میں

موجودہ دور میں گمراہ ہو گئے ہیں اور وہ خوارج سے دور رہیں' جو گناہوں کے ارتکاب پر مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں۔ اگر وہ مسلمان نمازیں پڑھتے ہوں' روزہ رکھتے ہوں۔

① امام ابن جریر طبری (۱۰/۳۵۵/۱۲۰۵۳) نے صحیح سند کے ساتھ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ

یہ کفر ہے لیکن اللہ اور اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں' اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر جیسا نہیں ہے۔

② اس آیت سے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی دوسری روایت میں ہے:

"یہ وہ کفر ہے جس کی طرف (خوارج) گئے ہیں۔ یہ وہ کفر نہیں جو ملت اسلامیہ سے نکال دے' یہ کفر دون کفر ہے۔"

امام حاکم (۲/۳۱۳) نے اسے "صحیح الاسناد" قرار دیا ہے اور ذہبی نے موافقت کی ہے۔ بہتر یہ تھا کہ وہ فرماتے: اس کی سند شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔ اس لیے کہ اس کی سند اسی طرح ہے۔

پھر میں نے تفسیر ابن کثیر (۶/۱۶۳) میں دیکھا کہ انہوں نے امام حاکم سے نقل کیا ہے۔

"صحیح علی شرط الشیخین" اور مستدرک کے مطبوعہ نسخہ میں یہ رہ گیا ہے اور اسی بات کو امام ابن کثیرؒ نے امام ابن ابی حاتم کی طرف اختصار کے ساتھ منسوب کیا ہے۔

③ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

"جس نے اللہ کے نازل کردہ کا انکار کیا تو اس نے کفر کیا اور جس نے اللہ کے نازل کردہ کا اقرار کیا اور اس کے مطابق فیصلہ نہ کیا تو وہ فاسق ہے۔"

[ابن جریر طبری:۱۲۰۶۳]

قلت: ابن ابی طلحہ رحمہ اللہ کا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سماع نہیں ہے لیکن شاہد میں

جید ہے۔

④ ابن جریر (۱۲۰۴۷) سعید المکی عن طاؤس کے طریق سے آیت ذکر کے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا:

"یہ وہ کفر نہیں جو ملت سے نکال دے" اور اس کی سند صحیح ہے۔

سعید المکی، ابن زیاد الشیبانی ہے، جسے ابن معین، عجلی، ابن حبان وغیرہم نے ثقہ قرار دیا ہے اور اس سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔

⑤ ابن جریر (۱۲۰۲۵، ۱۲۰۲۶) نے دو سندوں سے عمران بن حدید سے روایت کیا کہ انہوں نے کہا: ابومجلز تابعی کے پاس بنوعمر و بنوسدوسیا اباضیۃ (خوارج کا ایک گروہ) کے کچھ لوگ آئے اور کہا: آپ کا اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ﴾

کے متعلق کیا خیال ہے کہ یہ حق ہے؟

ابومجلز رحمہ اللہ نے فرمایا: جی ہاں:

انہوں نے کہا:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾

بھی حق ہے۔

ابومجلز نے کہا: جی ہاں! انہوں نے پھر:

﴿فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾

سے متعلق پوچھا: کہ یہ بھی حق ہے؟

ابومجلز نے فرمایا: یہ بھی حق ہے۔ ان لوگوں نے کہا: اے ابومجلز کیا یہ (حکمران) اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں؟

ابومجلز نے فرمایا: ان کا دین وہی ہے، جسے انہوں نے اختیار کیا ہے (یعنی اسلام) اسی کو وہ بیان کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو بھی جانتے ہیں کہ جو کام

وہ نہیں کرتے تو وہ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔تو ان لوگوں نے کہا: اللہ کی قسم! ایسا نہیں ہے۔آپ خوف زدہ ہو' ڈرتے ہو۔

ابومجلز نے فرمایا: تم مجھ سے زیادہ اس کے حقدار ہو۔ اور تم اسے سمجھنے کے باوجود اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے اور یہ آیات یہود نصاریٰ اہل شرک جیسوں کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔اس کی سند صحیح ہے۔

کفر کی تفسیر:

علماء کا اس آیت میں ''کفر'' کی تفسیر میں اختلاف ہے۔امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اپنی اسناد کے ساتھ''پانچ مختلف اقوال نقل کرکے آخر میں یہ کہہ کر بات ختم کی کہ:

''میرے نزدیک یہ قول صواب درست ہے کہ یہ آیات کفارِ اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔اس لیے کہ ان کے ماقبل و مابعد آیات انہی کے متعلق نازل ہوئی ہیں اور یہی ان آیات میں مراد ہیں اور یہ آیات ان کی خبر ہی بیان کررہی ہیں۔

اور یہ اولیٰ' بہتر ہے۔

اگر کوئی یہ کہے: اللہ تعالیٰ نے ہر وہ شخص جو اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ نہ کرے' عام ذکر کیا ہے۔آپ اسے (اہل کتاب کے متعلق) کیسے خاص کررہے ہو؟

جواب دیا گیا: بے شک اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے متعلق جو منزل من اللہ کا انکار کرتے ہوئے فیصلہ نہیں کرتے' عمومی خبر دی ہے۔لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ بتلایا کہ اللہ کے حکم کو ترک کرنے کی بنیاد پر کافر ہیں۔

اور اسی طرح ہر اس شخص کے متعلق جو منزل من اللہ کا انکار کرتے ہوئے اس کے ساتھ فیصلہ نہ کرے' وہ اللہ کا کفر کررہا ہے۔جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ کے حکم کو یہ جان لینے کے بعد کہ اللہ نے اپنی کتاب میں اسے نازل کیا ہے' اس کے ساتھ فیصلہ کرنے سے انکار کرنے کی وجہ سے کافر ہے' بالکل اسی طرح کہ کوئی شخص نبی کی نبوت کو جاننے کے بعد نبی ہونے کا انکار کردے۔'' [۳۵۷/۱۰]

خلاصہ کلام یہ کہ اللہ کے نازل کردہ کا انکار کرنے والے یہود کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔ جو اس انکار میں ان کا شریک ہو وہ کافر اعتقادی ہے اور جو انکار کرنے میں یہود کا شریک نہیں' تو اس کا کفر عملی ہے' اس لیے کہ وہ ان جیسا عمل کر رہا ہے (تا کہ عقیدہ اپنا رہا ہے) اس وجہ سے وہ گناہ گار' مجرم ہے لیکن دائرہ اسلام سے خارج نہ ہوگا جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے بیان ہو چکا۔

اور اس کی شرح و تفصیل امام حافظ ابوعبید القاسم بن سلام نے اپنی کتاب:

''کتاب الایمان'' کے باب'' الخروج من الایمان بالمعاصی'' [ص' ۹۷-۹۴] میں ذکر کی ہے۔ شائقین وہاں ملاحظہ کرلیں۔

یہ سب لکھنے کے بعد "مجموعہ الفتاوی ۳/۲٦۸" میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اس تفسیر میں فرمایا:

''یعنی (کافر وہ ہے) جو منزل من اللہ کے علاوہ سے فیصلہ کرنے کو جائز وحلال جانتا ہے۔'' پھر شیخ الاسلام نے ذکر کیا: [۷/۲۵٤]

''امام احمد رحمہ اللہ سے اس آیت میں مذکور کفر کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: یہ کفر ایمان سے خارج نہیں کرتا' ایمان کی طرح کفر کے بھی درجات ہیں، حتی کہ وہ شخص (جو کفر کا مرتکب ہے) اس مقام پر آجائے کہ جس میں کوئی اختلاف نہ ہو (تو وہ کافر ہے)۔

اور شیخ الاسلام نے ایک اور جگہ (۷/۳۱۲) پر فرمایا:

''اسلام کے قول کے مطابق جیسے انسان میں ''ایمان اور نفاق'' ہوتا ہے' اسی طرح اس میں ''ایمان اور کفر'' بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ کفر دائرہ اسلام سے نہیں نکالتا' جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب نے اللہ کے فرمان'' ومن لم یحکم بما انزل اللہ......'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: یہ کفر ملت اسلامیہ سے نہیں نکالتا۔

اور اسی کی امام احمد اور دیگر آئمہ رحمہ اللہ نے پیروی کی ہے۔

سیدنا براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ﴾ [المائدہ:٤٤]

﴿فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [٤٥]

﴿فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ [المائدہ:٤٧]

کے متعلق ارشاد فرمایا:

"هي في الكفار كلها"

"یہ آیات سب کافروں کے متعلق ہیں۔"

یہ حدیث صحیح ہے۔[سلسلہ الصحیحہ:٢٧٠٤]

یہ حدیث اس بات کی صریح دلیل ہیکہ ان تینوں آیات میں یہود ونصاریٰ کے کفار اور انہی کی مثل جو لوگ شریعت اسلامیہ اور اس کے احکامات کا انکار کرتے ہیں' مقصود ہیں اور جو کوئی بھی اگرچہ وہ بظاہر اسلام کا دعویدار ہو' اس انکار میں حتیٰ کہ ایک حکم کا بھی انکار کردے' وہ بھی ان میں شمار ہوں گے۔

لیکن یہ بات یاد رہے کہ جو شخص اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ کرتا ہے نہ ہی اس کا انکار، تو وہ اوپر بیان کردہ کافر کی طرح نہیں اور اس پر کفر کا حکم لگا کر ملت اسلامیہ سے خارج نہیں کیا جائے گا، کیونکہ وہ مومن ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کے کفر کو عمل کفر قرار دیا جائے گا۔ اس مسئلہ میں یہ بنیادی نقطہ ہے۔ جس سے اسلام کے مطابق فیصلہ کرانے کے خواہش مند بہت سے جذباتی نوجوان غافل ہیں۔ اسی بناء پر وہ بہت سے علاقوں میں ان حکمرانوں کے خلاف خروج کرتے ہیں جو اسلام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے فتنے واقع ہوگئے ہیں اور ایسی جنگ جس کی کوئی تیاری نہیں ہے میں ناحق خون بہہ رہا ہے۔

میرے نزدیک یہ فرض ہے کہ اسلام کو عقائد باطلہ' بے کار فیصلوں' مخالف سنت آراء فاسدہ سے پاک وصاف کیا جائے اور اس مصفی اسلام پر لوگوں کی تربیت کی

جائے۔ واللہ المستعان۔[نظم الفرائد: ١/ ٥٧-٦٤]

سوال تشہد میں جو "السلام علیك ایھاالنبی......" کہا جاتا ہے۔کیا اس میں ان لوگوں کے لیے دلیل ہے کہ جو رسول اللہ ﷺ سے مدد مطلب کرنے کے دعویدار ہیں؟[فتاویٰ المدینۃ: ٧٦]

جواب اس میں مطلق طور پر ان لوگوں کے لیے کوئی دلیل نہیں بالخصوص سلفیوں کے نزدیک کوئی حجت نہیں ہے۔ یہ ایک مثال ہے اور ہم اپنے آپ کو سلف کی طرف کیوں منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم سلفی ہیں؟ یہ اس لیے کہ وقت گزرنے کے ساتھ مسلمان بھی بہت سارے گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ نبی علیہ السلام کے اس فرمان کا مصداق بنتے ہوئے کہ:

((علی ثلاث وسبعین فرقة کلها فی النار الاواحدة" قالوامن هی یارسول الله؟ قال هی التی علی ماانا علیه واصحابی))

"عنقریب میری امت کے تہتر (٧٣) فرقے بنیں گے'ایک کے علاوہ سب جہنم میں جائیں گے'لوگوں نے کہا وہ کون سا فرقہ ہے؟ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ نے فرمایا وہ وہی ہے کہ جس طریق پر میں ہوں اور میرے ساتھی ہیں۔"

ایک اور صحیح روایت میں ہے "ھی الجماعة"وہ جماعت ہے۔یہ تمام فرقے جن پر نبی علیہ السلام نے جہنمی ہونے کا حکم لگایا ہے' یہ کتاب وسنت کی روشنی میں اس آگ سے بچ نہیں سکتے۔لیکن ان فرقوں کی مثال اس طرح ہے کہ جس طرح ایک عربی شاعر نے کہا ہے کہ:

وکل یدعی وصلا بلیلی

ولیلی لا تقرلھم بذاك

ہر ایک لیلیٰ کے وصال کا دعویٰ کرتا ہے لیکن لیلیٰ ان کے لیے اس چیز کا اقرار بھی نہیں کرتی۔

تو ان فرقوں میں راہ راست پر وہی فرقہ ہے کہ جو اپنی جماعت کے لیے منہج کے طور پر اس حدیث کا خیال کرتا ہے کہ جس طرح نبی علیہ السلام نے فرقہ ناجیہ کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

((هي التي ما انا عليه و اصحابي))

یعنی وہ راستہ کہ جس پر میں اور میرے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔

على ماانا عليه فقط

یہ الفاظ نہیں ہے۔یعنی جس پر صرف میں ہوں۔ بلکہ اس کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو بھی شامل کیا۔ تو سوال یہ ہے کہ صحابہ کو کیوں ملایا......؟ کیا یہ کافی نہیں تھا کہ وہ صرف سنت پر عمل کرنے کے لیے ابھارتے؟ میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ نبی علیہ السلام کا صحابہ اور خلفاء راشدین کا ذکر کرنا اگرچہ آپ پر وحی نازل نہیں ہوئی تھی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ضمن میں آ جاتے ہیں:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾[النساء: ۱۱۵]

''جس نے بھی رسول علیہ السلام کی مخالفت کی، اس کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت واضح ہو چکی تھی اور مومنوں کے راستہ کے علاوہ کسی اور راستے کی وہ پیروی کرتا ہے۔ہم اسے پھیر دیتے ہیں کہ جس طرف بھی وہ پھرتا ہے اور ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے اور جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔''

ہر فرقہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ کتاب وسنت پر عمل پیرا ہے لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کے آپس میں شدید قسم کے اختلاف بھی ہوں لیکن اس کے باوجود وہ کتاب وسنت پر عمل پیرا ہوں؟ تو ان گروہوں کا آپس میں جو اختلاف ہے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس اختلاف کا سبب قرآن ہو۔ تو ہر وہ جماعت کہ جو دعویٰ کرتی ہے کہ وہ کتاب وسنت پر عمل پیرا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس کے لیے کوئی شاہد پیش کرے اور شاہد نیک

مومنوں کا راستہ ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی عزت وقدر کا وسیلہ:

سوال کچھ لوگ نبی اکرم ﷺ کی عزت' شرف' قدرومنزلت کے وسیلے کے لیے یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ:

((توسلوا بجاهي' فان جاهي عندالله عظيم))

''میری عزت وشرف کا وسیلہ مانگو' اس لیے کہ میری عزت' قدر اللہ کے ہاں عظیم ہے۔'' اوردعا میں ''آمین بجاہ النبی الکریم ﷺ'' بھی پڑھتے ہیں۔وضاحت فرمادیں؟

جواب یہ حدیث بے اصل ہے۔[سلسلہ الضعیفہ:۲۲]

اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی مکرم ﷺ کی عزت' قدر اورآپ ﷺ کا مقام اللہ کے ہاں بہت زیادہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی تعریف کی:

﴿وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا﴾ [الاحزاب:۶۹]

''وہ اللہ کے ہاں بہت عزت والا تھا۔''

اورہمارے نبی محمد ﷺ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے افضل ہونے کے ساتھ بغیر کسی شک وشبہ کے اللہ کے ہاں موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ شرف ومنزلت والے تھے لیکن یہ بات اوران کی عزت ومقام کا وسیلہ الگ معاملہ ہے۔انہیں آپس میں خلط کرنا مناسب نہیں۔جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں۔نبی اکرم ﷺ کی ''جاہ'' کے وسیلے سے دعا کرنے والے کا اگر یہ مقصد ہوتا ہے کہ اس سے دعا کی قبولیت کی امید ہے تو یہ بات بعید از عقل ہے' کیونکہ قبولیت دعا غیبی امور سے ہے جسے عقل سے نہیں پایا جاسکتا' لہٰذا اس بارے میں کسی صحیح دلیل کا ہونا ضروری ہے۔البتہ ایسا ممکن نہیں۔

اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کے وسیلہ سے متعلق احادیث یا تو صحیح ہیں یا ضعیف۔ بہرحال صحیح احادیث سے ان کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔مثلاً استسقاء میں اور نابینے

صحابی رضی اللہ عنہ کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ۔ تو درحقیقت یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا وسیلہ ہے نا کہ آپ کی عزت اور ذات کا۔ اب جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم الرفیق الاعلیٰ کے پاس چلے گئے ہیں تو آپ کی دعا سے توسّل بھی ناممکن ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی ناممکن و ناجائز ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں استسقاء کے سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنایا' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں' اس لیے کہ وہ مشروع وسیلہ کے معنی سے واقف تھے اور یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا (ان کی زندگی میں) سے وسیلہ ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ تبھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی دعا کو وسیلہ (ذریعہ) بنایا جو کہ ممکن اور مشروع ہے۔

اسی طرح یہ بھی منقول نہیں کہ کسی نابینا نے اس نابینے صحابی رضی اللہ عنہ کی دعا کو وسیلہ بنایا ہو۔ اس لیے کہ اصل راز اس نابینا کی دعا۔

"اے اللہ! میں تیرے نبی' نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔"

میں نہیں بلکہ بڑا راز اس نابینا کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے۔ جس کا تقاضا اس صحابی رضی اللہ عنہ نے آپ سے کیا تھا۔ جیسا کہ اس کی دعا سے عیاں ہے:

((اللھم فشفعه فی))

"اے اللہ! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت' میرے بارے میں قبول فرما۔"

الغرض حدیث کا سارا موضوع دعا پر مبنی ہے۔ جیسا کہ اس مختصر وضاحت سے قارئین کرام پر واضح ہو گیا ہے۔

حدیث اعمٰی کا بدعی وسیلہ سے کوئی تعلق نہیں ۔ لہٰذا امام ابوحنیفہ نے اس کا انکار کرتے ہوئے فرمایا: جیسا کہ "الدر المختار" وغیرہ کتب حنفیہ میں!

((اکرہ ان یسئل اللہ الا باللہ))

''میں اللہ تعالیٰ سے اللہ کی ذات کے علاوہ (کسی اور ذریعے سے) سوال کو ناپسند کرتا ہوں۔''

رہا زاہد کوثری کا اپنے ''مقالات ص ۳۸۱'' پر یہ کہنا کہ:

''تاریخ بغداد میں صحیح سند کے ساتھ امام شافعی کا امام ابوحنیفہ کو وسیلہ بنانے کا ذکر ہے۔''

تو یہ کوثری کے مبالغے' بلکہ مغالطے میں سے ہے۔ اس لیے کوثری نے جس کی طرف اشارہ کیا ہے وہ علامہ بغدادی نے (تاریخ بغداد ۱/ ۱۲۳) میں ''عمر اسحاق بن ابراہیم از علی بن سیمون از شافعی'' سند سے ذکر کیا ہے کہ امام شافعی کو علی بن میمون نے یہ کہتے ہوئے سنا:

''بے شک میں ابوحنیفہ سے تبرک لئے ہوئے قبر کی زیارت کے لیے آتا ہوں۔ جب مجھے کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو دو رکعات نماز ادا کر کے ان کی قبر کی طرف آتا ہوں اور امام صاحب کی قبر کے قریب اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں' وہ ضرور مجھ سے دور (دعا کے ذریعے) ہوتے ہی پوری ہوجاتی ہے۔''

یہ روایت ضعیف باطل ہے۔ اس لیے کہ عمر بن اسحاق بن ابراہیم غیر معروف ہے اور اس کا ذکر کتب رجال میں نہیں ملتا۔ ممکن ہے کہ یہ ''عمرو بن اسحاق بن ابراہیم بن حمید بن السکن ابومحمد التونسی'' ہے جس کا ترجمہ علامہ خطیب بغدادی (۱۲/ ۲۲٦) نے کرتے ہوئے ذکر کیا کہ وہ بخارا کا رہنے والا ہے جو بغداد میں ۳٤۱ میں آیا۔

اس کے علاوہ علامہ خطیب نے جرح وتعدیل ذکر نہیں کی' لہٰذا یہ مجہول الحال ہے، لیکن درست نہیں۔ کیونکہ اس کی اسناد ''علی بن میمون'' کی وفات ۲٤۷ھ کی ہوئی، اس طرح ان دونوں کی وفات کے درمیان سو سال کا فاصلہ ہے اور ان کی ملاقات بعید ہے۔

لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے' جس کے صحیح ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''اقتضاء الصراط المستقیم ص: ۱٦٥'' میں اس روایت کا معنی ذکر کر کے اسے

باطل ثابت کیا ہے۔

اور توسل کے متعلق دوسری قسم کی احادیث ضعیف ہیں۔[نظم الفرائد: ۱/ ۷۴۔۷۲]

سوال آج کل جیسے ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان مختلف جماعتوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہمارا کیا کردار ہے مسلمانوں کی وحدت میں؟ کیا ضروری نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کو کسی ایک جماعت میں ملا لیں؟[فتاویٰ :الامارات ۱۱۴]

جواب ہمارا کردار مسلمانوں کے متحد ہونے میں ضروری ہے، لیکن پریشانی یہ ہے کہ جس سے سب مسلمان غافل ہیں کہ کس بنیاد پر مسلمان متحد ہوسکتے ہیں؟ کیا اسی پرانی بنیاد پر کہ ہر چیز کو اپنی جگہ باقی رکھا جائے، یا اس اللہ تعالیٰ کے فرمان کی بنیاد پر:

﴿ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔﴾ [النساء:۵۹]

''اگر تمہارا کسی چیز میں تنازعہ ہوجائے تو تم اس کو لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم ایمان لاتے ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔''

جس نے مسلمانوں کو متحد ہونے کی دعوت دی لیکن اس اتحاد کی بنیاد قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کو معیار بناتا ہے۔وہ کبھی بھی اس چیز میں کامیاب نہیں ہوگا۔ اگر چہ اسے عمر نوح عطا کردی جائے۔

اگر آپ مسلمانوں کو متحد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو مسلمانوں میں سے بھی آج جو کتاب اللہ کی وجہ سے کافر بن جاتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن میں نقص ہے۔بسا اوقات وہ نماز بھی پڑھتے ہیں روزے بھی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔آپ اسے مسلمان کے ساتھ کس طرح متحد ہوسکتے ہیں کہ جو عقیدہ کی بنیاد ہی میں آپ کی مخالفت کررہا ہو۔ اس لیے جو شخص بھی مسلمانوں کے اتحاد کی حرص رکھتا ہو تو اس پر واجب ہے کہ اس اصول کو مدنظر رکھے:

﴿ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ﴾

جبکہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((تَفَرَّقَتِ الْيَهُودُ عَلَى إِحْدَى وَسَبْعِينَ أَوْ اثْنَتَيْنِ وَسَبْعِينَ فرقة وتفرقت النصارىٰ على اثنين وسبعين۔فرقة وستفترق امتي على ثلاث و سبعين فرقة كلها في النار الاواحدة قالوا من هي يارسول الله ؟ قال "الجماعة" وفي رواية هي التي على مااناعليه واصحابي))

"یہودیوں کے اکہتر(۷۱) فرقے ہوئے اور نصاریٰ کے بہتر(۷۲) فرقے ہوئے۔ عنقریب میری امت کے تہتر(۷۳) فرقے ہوں گے۔سارے کے سارے آگ میں جائیں گے۔ایک کے علاوہ۔ انہوں نے کہا وہ کونسی جماعت ہے اے اللہ کے رسول؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ جماعت ہے اور ایک روایت میں ہے کہ وہ راستہ کہ جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔ مسلمانوں کے وحدت کا ایک طریقہ ہے کہ جب وہ اپنا منہج بھی ایک کرلیں۔ الحمدللہ مسلمانوں کا اصل منہج بھی ایک ہی قال اللہ وقال الرسول ہے۔

فرقہ ناجیہ کسی ایک گروہ میں بند نہیں ہے۔ نہ ہی کسی ایک جماعت کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان جماعتوں اور گروہوں میں سے جس جس فرد پر وہ علامت ونشانی جوآپ نے بتائی صادق آئے گی ہر وہ شخص فرقہ ناجیہ میں شمار ہوگا۔

کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ فرقہ ناجیہ والے اہل حدیث ہیں یا اہل السنۃ ہیں یا سلفی المنہج والعقیدہ ہیں تو کیا ضروری ہے کہ وہ اپنے اس دعویٰ میں سچا ہو؟

تو یہاں مسئلہ دعویٰ کرنے کا نہیں ہے کہ کسی معین فرقہ کی طرف منسوب کرنا یا کسی مخصوص جماعت کا دعویٰ کرنا بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ ہر مسلمان شخص کو اس علامت کا خیال رکھنا چاہئے۔ جس علامت کوفرقہ ناجیہ کی علامت قرار دیا ہے۔ علامت یہ ہے کہ وہ راستہ کہ جس پر اللہ کے رسول علیہ السلام اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ باقی جماعتوں کے نام رکھنا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کوئی بھی شخص اپنی جماعت کا کوئی نام رکھ لے کہ جب ان کے باہم آپس میں اختلاف نہ ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ "ہر قوم کے لیے ہے

کہ وہ جیسی چاہیں اصطلاحیں وضع کریں لیکن اس نام کے پیچھے ایسی کوئی چیز مرتب ہو کہ جو شریعت کے خلاف ہو اور قوم پرستی کی بنیاد پہ اپنے آپ کو کسی معین گروہ کی طرف منسوب کرتا ہے اور یہ نام انتشار کا سبب بن رہے ہوں، تو یہ چیز جائز نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے عموم میں داخل ہوگا۔

﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ﴾ [الانفال:٤٦]

"آپس میں جھگڑو مت' پس تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔"

ہم صاف فرقہ واریت کی مخالفت کرتے ہیں کیونکہ اس فرقہ واریت پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ﴾ [المؤمنون:٥٣]

"ہر جماعت کہ جو ان کے پاس ہے اس پر وہ خوش ہیں۔"

اسلام میں کوئی فرقہ واریت نہیں ہے۔ اسلام میں ایک ہی جماعت ہے۔ قرآن کے نص سے:

﴿أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ [المجادلة:٢٢]

"خبردار بے شک اللہ تعالیٰ ہی کی جماعت کامیاب ہے۔"

اللہ کی جماعت سے مراد رسول اللہ ﷺ کی جماعت ہے۔ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ صحابہ کے منہج پر چلے تو اس لیے اسے چاہئے کہ کتاب وسنت کی تعلیم حاصل کرے۔

سوال تبلیغی جماعت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ [فتاویٰ الامارات: ۷۳]

جواب تبلیغی جماعت نئی صوفی جماعت ہے۔ ان کی بنیاد کتاب وسنت پر قائم نہیں ہے۔ تبلیغ کے لیے تین دن یا چالیس دن کے لیے نکلنا اور اس مدت کو مقرر کرنا تبلیغ کے لیے یہ چیز نہ سلف سے ثابت ہے بلکہ نہ ہی خلف کے فعل سے ثابت ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ وہ تبلیغ کی غرض سے نکلتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ وہ تبلیغ کے اہل نہیں ہیں۔ تبلیغ کے اہل تو اہل علم ہی ہیں۔ جیسا کہ نبی علیہ السلام

کیا کرتے تھے۔کہ جب آپ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے قاصدوں کو بھیجتے تھے۔ ان میں علماء اور فقہاء شامل ہوتے تھے تاکہ لوگوں کو اسلام کی تعلیم دیں۔

نبی علیہ السلام نے تبلیغ کے لیے اکیلے علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ابو موسیٰ اور معاذ رضی اللہ عنہما ان کو بھی اکیلے بھیجا۔ان کے ساتھ صحابہ میں سے کسی کو بھی نہیں بھیجا۔ اس کے باوجود کے وہ صحابہ تھے۔ ان تبلیغیوں کے پاس اتنا علم بھی نہیں ہے کہ جتنا ان لوگوں کے پاس علم تھا۔ ہم ان کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ یہ دین کا علم حاصل کریں' دین کو سمجھیں۔ پھر ان کفار کے ملکوں میں جا کر دعوت کی غرض سے دورے کریں، تاکہ کسی فتنہ کا شکار نہ ہوں اور ان کو تو ان لوگوں کی زبان بھی نہیں آتی۔

اور وہ دلیل پکڑتے ہیں کہ صحابہ کو دیکھو کہ جو مکہ و مدینہ کے تھے اور ان کی قبریں بخاریٰ و سمرقند میں ہیں۔ جواب یہ ہے کہ کاش کہ ہم بھی اس طرح نکل جائیں کہ جس طرح یہ لوگ جہاد کرتے ہوئے نکلے ۔"یہ قیاس مع الفارق ہے" یعنی نص کے مقابلہ میں قیاس ہے۔ ہم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا انکار تو نہیں کرتے، لیکن اس تبلیغ کے نام سے جماعت کا انکار کرتے ہیں۔بعض تبلیغیوں نے "لا الہ الا اللہ" کی شرح میں رسائل لکھے۔لیکن وہ لکھتے ہیں کہ "اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔" اللہ کے علاوہ کیسے معبود نہیں ہے۔معبود تو بہت سارے ہیں۔تو اہل علم اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں "کوئی معبود برحق نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ۔ وگرنہ لات' مناۃ' عزیٰ اور آگ وغیرہ ان کی عبادت کی جاتی رہے۔

سوال تبلیغی جماعت کا منہج کیا ہے؟ اور کیا کسی طالب علم کے لیے جائز ہے یا کسی اور کے لیے کہ وہ ان کے ساتھ تبلیغ میں نکل جائے؟[فتاوی :المدینہ:۸]

جواب تبلیغی جماعت کا منہج کتاب وسنت اور سلف صالحین والا منہج نہیں ہے۔ جب معاملہ اسی طرح ہے تو ان کے ساتھ نکلنا جائز نہیں ہے۔کیونکہ ہمارے اس منہج کی بنیاد سلف صالحین کے منہج کے مخالف ہے۔ اللہ کی راہ میں دین کی دعوت کا کام کرنے کے

لیے ایک عالم نکلتا ہے اور جو اس علم کے ساتھ نکلیں تو ان کو چاہیے کہ اپنے گھروں میں رہیں اور اپنی مساجد میں بیٹھ کر علم دین حاصل کریں۔ یہاں تک کہ ان میں سے علماء تیار ہو جائیں۔ وہ اپنے معاشرے میں دین کے کام کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ جب معاملہ اس طرح سے چل رہا ہو تو دین کے طالب علم پر لازم ہے کہ وہ لوگوں کو دعوت دے کہ وہ اپنے گھروں میں ہی کتاب وسنت کی تعلیم حاصل کریں اور لوگوں کو اس کی دعوت دیں۔ تبلیغی جماعت والے کتاب وسنت کی طرف دعوت نہیں دیتے بلکہ وہ فرقہ واریت کی دعوت دیتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے ان کی جماعت اخوان المسلمون کی جماعت کے زیادہ مشابہ ہے۔

دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ان کی دعوت کتاب وسنت پر قائم ہے لیکن یہ صرف باتیں ہیں۔ وہ ایک عقیدہ پر بھی آپس میں جمع نہیں ہوتے۔ ان میں ماتریدی عقیدہ والے بھی ہیں۔ اسی طرح سے اشعری اور صوفی بھی شامل ہیں کہ جن کا کوئی مذہب ہی نہیں ہے، کیونکہ ان کے دعوت کی بنیاد ہے کہ یکجا ہونا، لوگوں کو جمع کرنا سب کو ایک طرح لباس پہنانا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی کوئی ثقافت نہیں ہے۔ ان کو آدھی صدی سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے آج تک ان میں کوئی عالم دین ظاہر نہیں ہوا۔

ہم کہتے ہیں کہ ثقافت ہر ایک کی اپنی اپنی صحیح لیکن عقیدہ توحید پر سب کو جمع کرو۔ کیونکہ عقیدہ توحید ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جس پر لوگ بغیر اختلاف کیے جمع ہو سکتے ہیں۔ تبلیغی جماعت والے اس زمانے کے صوفی ہیں' یہ صرف اخلاقیات کی دعوت دیتے ہیں۔ عوام کے عقیدے کی اصلاح نہیں کرتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح سے لوگ منتشر ہو جائیں گے۔ اس لیے اس کو ساکن رہنے دیتے ہیں' حرکت نہیں دیتے۔ جناب سعد الحصین کا تبلیغی جماعت کے امام کے ساتھ کہ جو ہندوستان یا پاکستان میں رہتے ہیں ان کے ساتھ تحریری طور پر مناظرہ ہوا ہے کہ جس سے یہ واضح ہو گیا کہ یہ لوگ وسیلہ کے قائل ہیں' اسی طرح غیر اللہ سے مدد طلب کرنے کے قائل ہیں اور بھی اس طرح کی

غیر شرعی چیزیں ان کے عقائد کا جزلاینفک بنی ہوئی ہیں۔ یہ لوگ اپنی جماعت میں شامل ہونے والے افراد سے چار چیزوں پہ بیعت لیتے ہیں۔ان میں ایک یہ ہے کہ نقشبندی طریق پر بیعت لیتے ہیں۔ ہر تبلیغی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان چیزوں پہ بنیادی طور پر بیعت کرے۔ بسا اوقات لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ جی ان کی جماعتی کوششوں سے اتنے اتنے لوگ مسلمان ہوگئے ہیں یا فلاں جگہ پر اتنے لوگ دنیا چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کر چکے ہیں۔تو کیا یہ چیزیں کافی نہیں ہیں، ان کے سچا ہونے کے لیے اور ہمارے ان کے ساتھ ان کے لیے جواز کے طور پر؟

ہم یہ جواب دیتے ہیں کہ اس طرح کی باتیں ہم بھی بہت زیادہ سنتے رہتے ہیں لیکن ہم تو ایسے بہت سارے لوگوں کو جانتے ہیں کہ جو ذاتی طور پہ صوفی ذہن کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہاں ایک شخص اس طرح کا موجود ہے کہ جو سنت میں سے کچھ بھی نہیں جانتا' اس کا عقیدہ بھی فاسد ہے' باطل طریقہ سے لوگوں کے مال کھاتا ہے لیکن اس کے باوجود بہت سارے فاسق لوگ اس کے ہاتھ پر مسلمان ہوتے ہیں۔ کوئی بھی جماعت کہ جو لوگوں کو خیر کی دعوت دیتی ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے پاس کوئی اسوہ ہو یا قدوہ ہونا چاہئے کہ جس کے منہج پر یہ لوگ چلیں لیکن ہم ان کی طرف بنظر غائر دیکھتے ہیں کہ یہ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟

کیا یہ لوگ کتاب اللہ اور سنت رسول اور سلف صالحین کے عقیدہ کی دعوت دیتے ہیں؟ کسی مذہب کے بارے میں عصبیت رکھے بغیر اور سنت کے اتباع کی دعوت دیتے ہیں جہاں بھی ہوں اور جس جماعت کے ساتھ ہوں؟

تبلیغی جماعت کا کوئی عملی منہج نہیں ہے بلکہ ان کا منہج وہی ہے کہ جس جگہ پہ یہ لوگ رہتے ہیں' وہیں کی چیز اپناتے ہیں۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔

علم استدلال نقلیہ اور اصول فقہ کے مسائل

سوال کیا شرعی تعلیمات حاصل کرنے والے طالب علم پر لازم ہے کہ عربی زبان سیکھے اور عربی میں بات کرے؟ [فتاویٰ :"الامارات :٥٦]

جواب عربی زبان سیکھنا اس طالب علم پر واجب ہے کیونکہ علماء ایک قاعدہ بیان کرتے ہیں: ((ھالایقوم الواجب الابہ فھو واجب))

واجب جس چیز کے ذریعہ پورا ہوسکتا ہو تو اس ذریعہ کا حکم بھی وجوب کا ہے۔

طالب علم کے لیے ممکن نہیں کہ عربی زبان سیکھے بغیر قرآن وحدیث کو سمجھ سکے۔

باقی رہا عربی زبان میں تکلم کرنا تو یہ مستحب ہے کیونکہ اس کو واجب کرنے والی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔

سوال کیا طالب علم کے لیے قرآن کریم حفظ کرنا واجب ہے؟

[فتاویٰ : الامارات :٥٣]

جواب قرآن کریم حفظ کرنا فرض کفایہ ہے کہ جب اس کو کچھ ادا کردیں تو دوسروں سے اس کی ادائیگی ساقط ہوجاتی ہے۔ ہر مسلمان کے لیے قرآن کریم حفظ کرنا واجب نہیں ہے کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہیں آئی۔

سات قرأتوں کا معنی:

سوال سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قرآن سات حروف پر پڑھو جو کہ کافی وشافی ہیں۔'' اس کا مطلب واضح کیجیے؟

جواب یہ حدیث صحیح ہے دیکھیں [سلسلہ الصحیحہ :١٥٨١ ٢]

اس حدیث میں سات حروف سے مراد ایک حرف اور ایک کلمہ میں سات لغات

ہیں۔جن کے الفاظ مختلف اور معنی متفق ہو۔ جیسا کہ اس کی مفید شرح وتفصیل امام طبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں بیان کی ہے۔انہوں نے وضاحت کی کہ امت باقی چھ حروف کے علاوہ ایک حرف پر ثابت ہے جس میں کوئی نسخ یا ضیاع نہیں ہے اور آج تک سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عمدہ مضبوط کلام پر مبنی مصحف جس پر انہوں نے لوگوں کو جمع کیا' سے قرأت ہو رہی ہے۔

آپ مزید تفصیل کے لیے ''تفسیر طبری'' کا مطالعہ کیجئے۔وہ اس مسئلہ میں بہت مفید ہے۔[نظم الفرائد : ۱/ ۱۲۰]

سوال ''عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ من بعدی''...... کیا اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین کے افعال بھی حجت ہیں؟

[فتاویٰ الامارات: ۷۱]

جواب بلاشبہ اگر خلفاء راشدین کا عمل ایک چیز پہ متفق ہو جاتا ہے اور سنت کے مخالف نہ ہو تو بلاشبہ ان کا یہ عمل حجت ہے لیکن بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ حدیث چاروں خلفاء میں سے کسی ایک کے قول کی حجیت ہونے پر دلالت کرتا ہے۔تو آپ علیہ السلام کے فرمان ''فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ''۔

اس میں یا تو مضاف کو محذوف ماننا پڑے گا کہ لفظ ''احد'' مضاف محذوف ہے۔ یوں کہا جائے گا ''وسنة احد الخلفاء الراشدين'' یا پھر خلفاء الرشدین سے پہلے لفظ مجموع کو مضاف مقدر ماننا پڑے گا۔ پہلا معنی اگر لیں تو اس کا مطلب ہوگا کہ خلفاء راشدین میں سے ایک اگر منفرد ہو جائے تو اس کی بات حجت ہوگی اور دوسرے معنیٰ سے یہ مراد ہے کہ چاروں خلفاء راشدین کا ایک رائے پر جمع ہونا حجت ہوگا اور صحیح بھی یہی معنیٰ ہے۔

نبی علیہ السلام نے اس حدیث میں جن الفاظ کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔یہ اقتباس گویا کہ قرآن کریم سے اخذ کردہ ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ

الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾ [النساء:١١٥]

''جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے گا' مومنوں کے راستہ کے علاوہ کسی راستہ کی تابعداری کرے گا تو ہم اسے پھیر دیں گے جس طرف بھی وہ پھرتا ہے اور ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔''

''يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ'' ان الفاظ پر کوئی شخص اعتراض کر سکتا ہے کہ مؤمنین سے پہلے احد کو مقدر مانو کسی ایک مومن کی مخالفت ہوگی' اس آیت میں دوسرا مطلب یہ بھی بن سکتا ہے کہ جو تمام مومنوں کے راستہ کی مخالفت کرے گا اور اصل مقصود بھی یہ ہے۔

اس لیے متقدمین میں سے امام شافعی رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ اس آیت سے مسلمانوں کے اجماع کی حجیت کی دلیل ملتی ہے۔

سوال کیا سلف صالحین کے قول پر مطلقاً عمل جائز ہے؟ بشرطیکہ صحیح ہوں۔

[فتاویٰ :المدینہ : ٦١]

جواب اس بارے میں کوئی خاص قاعدہ وقانون تو نہیں ہے لیکن اس کے لیے بعض شرطیں رکھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ایک مسئلہ میں صحابی کا قول موجود ہو جو کتاب اللہ کی کسی نص یا نبی علیہ السلام کے کسی فرمان کے مخالف نہ ہو اور یہ قول یا فعل صحابہ کے درمیان مشہور ہو اور کسی صحابی کی طرف سے اس کے خلاف قول منقول نہ ہو۔ تو ایسی صورت میں صحابی کے قول وفعل کو لینے پر دل مطمئن ہے۔ بعض لوگ غلو کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ بھی بندے تھے اور ہم بھی بندے ہیں۔ جب ایک صحابی اس معاملہ کو جائز سمجھتا ہے تو کیا ہوا؟ میں اس کو حرام سمجھتا ہوں۔

تو ایسے شخص کو ہم اس طرح جواب دیتے ہیں کہ بھائی تم صحابہ کی نسبت کیا ہو؟ اور تمہاری علمی حیثیت اور فقاہت اللہ کے رسول کے صحابی کے مقابلہ میں کیا ہے؟

اس لیے ہم پر واجب ہے کہ ہم اپنی آراء کے اندر بھی نرمی سے کام لیں اور ہم

تکبر نہ کریں۔ اور ہمیں چاہیے کہ ہم سلف صالحین کے حقیقی طور پر پیروکار بنیں اور ان کے برابر چلیں اور ہم ان کی مخالفت نہ کریں۔ ماسوائے اس کے کہ جو کتاب وسنت سے ثابت ہو۔

سوال جب نبی علیہ السلام کا قول فعل کے مخالف ہو تو ان میں سے کون سا لیا جائے گا؟

[فتاوی الامارات:۱۶۹]

جواب جب نبی علیہ السلام کا قول فعل کے مخالف ہو تو قول کو فعل پر مقدم کیا جائے گا۔ قول کو فعل پر مقدم کرنے کا سبب یہ ہے کہ نبی علیہ السلام فرمان امت کے لیے شریعت ہے۔ نبی علیہ السلام کا فعل اگرچہ حقیقت میں تو یہ بھی عام شریعت ہے، لیکن بسا اوقات نبی علیہ السلام کے فعل کا حکم خاص ہوتا ہے جبکہ عام لوگوں کے فعل کا حکم اس کے برخلاف ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ امت کے لیے حکم ایک ہوتا ہے جبکہ نبی علیہ السلام کا فعل کسی حاجت کی وجہ سے اس کے برخلاف صادر ہوتا ہے۔ اس صورت میں اصل تو اعتبار آپ کے قول کا ہوگا' اس میں تعارض نہیں سمجھا جائے گا۔

مثلاً نبی علیہ السلام کی حدیث ہے:

"انماجعل الامام لیؤتم به......وفیه واذا صلیٰ قاعداً فصلوا قعوداً اجمعین۔"

امام اس لیے بنایا گیا ہے تا کہ اس کی اقتدا کی جائے......ایک اور راویت میں ہے......کہ جب امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر پڑھا کرو۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ

((وَإِذَا صَلَّى جَالِسًا فَصَلُّوا جُلُوسًا أَجْمَعِينَ۔))۔

اس حدیث میں ہے کہ جو کسی عذر کی وجہ سے بیٹھے ہوئے امام کے پیچھے نماز پڑھے تو وہ مقتدی بھی بیٹھ کر نماز پڑھے۔ اس کی امام کی متابعت کرتے ہوئے۔ جبکہ اس کے معارض وہ دوسری حدیث ہے کہ جس میں آپ نے اپنی بیماری میں بیٹھ کر نماز

پڑھائی اور لوگ پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ اس لیے بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ فعلی حدیث پہلے والی قولی حدیث کے لیے ناسخ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شرعی دلیل ہونے کے لحاظ سے فعل میں اتنی قوت نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ نبی علیہ السلام کے جاری شدہ فرمان کو منسوخ کیا جا سکے۔ بلکہ قول وفعل میں تطبیق ضروری ہے۔ تطبیق کی صورت یہی ہے کہ آپ علیہ السلام کے قول کو فعل پر مقدم کیا جائے گا۔ نبی علیہ السلام کی طرف سے امت کے لیے جب ایک فرمان جاری ہو جائے تو وہ فرمان صرف اس کے برخلاف فعل کی وجہ سے منسوخ نہیں ہو سکتا۔

بعض سابقہ آئمہ نے آپ ﷺ کے اس واقعہ میں اور "فَصَلُّوا جُلُوسًا اجمعین" کے درمیان حدیث کو ایک قاعدہ کے مطابق بیان کیا اور فعل حدیث کو ایک واقعہ کے ساتھ محدود کر دیا۔ اور دوسری صورتیں اس کے ساتھ نہیں ملائیں۔

فرماتے ہیں کہ جب امام بیٹھ کر نماز کی ابتدا کرے تو مقتدیوں پر بھی لازم ہے کہ وہ بیٹھ کر نماز پڑھیں لیکن جب امام کھڑا ہو کر نماز پڑھائے شروع سے 'پھر کسی سبب سے اس کو بیٹھنا پڑے تو مقتدی اس کے پیچھے اپنی نماز جاری رکھیں۔ یہ امام احمد رحمہ اللہ کی سمجھ کی باریکی ہے۔ کیونکہ یہ واقعہ ایسے ہی ہوا۔ بے شک نبی علیہ السلام نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا وکیل بنایا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں جیسا کہ فرمایا "مروا ابابکر فلیصل بالناس" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دو وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھائی۔ جب نبی ﷺ نے لوگوں کی طرف جھانک کر دیکھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹ گئے اور نبی علیہ السلام نے لوگوں کو بیٹھ کر امامت کروائی۔ اس طرح ان کی نماز پوری ہو گئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نماز کی وجہ سے۔

یہ جائز نہیں کہ یہ کہا جائے یہ فعلی حدیث نے قولی حدیث کو منسوخ کر دیا۔ کیونکہ قولی حدیث چھوڑنے کے بجائے جمع کی صورت ممکن ہے۔ ایک جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ فعلی حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ قولی حدیث پہ عمل واجب نہیں ہے بلکہ اس قولی

حدیث کو استحباب پر محمول کریں گے۔ تو لہٰذا حدیث اپنی جگہ پر محکم وثابت رہے گی۔ منسوخ نہیں ہوگی۔ یہ سابقہ جمع کی شکل اس وقت توسمجھ آتی ہے کہ جب فعلی حدیث متاخر ہوتی قولی حدیث سے لیکن قولی حدیث سے متاخر ہونا معلوم نہیں ہے۔ بہرحال جس بات پر ہمارا دل مطمئن ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ امام کے ساتھ مقتدیوں کے بیٹھنے کے لیے جو امر کا صیغہ آیا ہے یہ تو وجوب کے لیے ہے۔ باقی رہی فعلی حدیث اس کے بارے میں ہمیں یہ معلوم نہیں کہ یہ قولی حدیث کے بعد کی ہے۔

مصنف عبدالرزاق میں صحیح سند کے ساتھ ایک تابعی سے مروی ہے کہ نبی علیہ السلام کے بیٹھ کر نماز پڑھانے کے واقعہ کے بارے میں اس طرح حدیث آئی ہے۔

((إِذَا صَلَّى الْإِمَامُ فَصَلُّوا قِيَامًا وَإِذَا......))

جب امام نماز پڑھائے تو تم کھڑے ہو کر پڑھا کرو۔ یہ حدیث اگرچہ مرسل ہے۔ لیکن اس بات پہ دلالت کرتی ہے کہ حدیث میں جو چیز مذکور ہے وہ یہی ہے کہ اس معاملہ کو اپنی اصل پر باقی چھوڑنے کے بارے میں ہے کیونکہ ہمارے پاس کوئی بھی ایسی دلیل نہیں ہے کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ فعلی حدیث قولی حدیث سے منافر ہے۔ قولی حدیث کے منسوخ نہ ہونے کی تائید میں شیخ الاسلام حضرت ابن تیمیہؒ نے بھی ایک مسلم کی حدیث ذکر کی ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:

((عَنْ جَابِرٍ قَالَ اشْتَكَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلَّيْنَا وَرَاءَهُ وَهُوَ قَاعِدٌ وَأَبُو بَكْرٍ يُسْمِعُ النَّاسَ تَكْبِيرَهُ فَالْتَفَتَ إِلَيْنَا فَرَآنَا قِيَامًا فَأَشَارَ إِلَيْنَا فَقَعَدْنَا فَصَلَّيْنَا بِصَلَاتِهِ قُعُودًا فَلَمَّا سَلَّمَ قَالَ إِنْ كِدْتُمْ آنِفًا لَتَفْعَلُونَ فِعْلَ فَارِسَ وَالرُّومِ يَقُومُونَ عَلَى مُلُوكِهِمْ وَهُمْ قُعُودٌ فَلَا تَفْعَلُوا ائْتَمُّوا بِأَئِمَّتِكُمْ إِنْ صَلَّى قَائِمًا فَصَلُّوا قِيَامًا وَإِنْ صَلَّى قَاعِدًا فَصَلُّوا قُعُودًا))

بے شک نبی علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو ایک دن ظہر کی نماز بیٹھ کر پڑھائی کہ جب

آپ ﷺ سواری سے گر گئے تھے تو آپ ﷺ کے بازو یا کلائی میں چوٹ لگنے کی وجہ سے کھڑے ہو کر نہیں پڑھا سکتے تھے۔ تو جب بیٹھ کر پڑھائی لوگ اپنی عادت کے مطابق آپ ﷺ کے پیچھے کھڑے ہو گئے تو آپ ﷺ نے اشارے سے ان کو بیٹھنے کا کہا۔ جب سلام پھیرا تو آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: قریب تھا کہ تم بھی وہی کام کرتے کہ جو فارس والے کرتے ہیں کہ وہ اپنے بادشاہوں کے سروں کے پاس کھڑے ہو جاتے ہیں، بلکہ امام تو اس لیے بنایا گیا تا کہ تم اس کی اقتدا کرو۔

حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں شرعی علت ہے۔ مقتدیوں کے نماز میں بیٹھنے کا امام کے پیچھے نماز کا۔

اس کے باوجود کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے نماز میں کھڑے ہونے اور اہل فارس کا اپنے بڑوں کے لیے ہونا اس میں بہت بڑا فرق ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس طرح کی بن جانے والی اتفاقی صورت کو بھی نبی علیہ السلام نے پسند نہیں فرمایا کہ کہیں ہم کفار کی مشابہت اختیار نہ کریں۔ شیخ الاسلام حضرت ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حکم کی یہ ایک مضبوط علت ہے۔ منسوخ ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور جو حکم اتنا محکم ہو اس کا اتنی جلدی نبی علیہ السلام کے کسی فعل کی وجہ سے منسوخ ہونا درست نہیں۔ خصوصاً جب یہ بھی معلوم نہیں کہ یہاں آپ ﷺ کا جو ہے یہ قولی حدیث کے بعد کا ہے یا پہلے کا۔

سوال تقلید کے حرمت کی دلیل کیا ہے؟ [فتاوی المدینہ: ۳٤]

جواب تقلید کے حرمت کی دلیل مجھے معلوم نہیں ہے۔ بلکہ جس کے پاس علم نہیں ہے اس کا تقلید کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ [1]

[1] شیخ البانیؒ یہاں پر عام آدمی کے لیے تقلید ثابت کر رہے ہیں اور اس کا اقرار کر رہے ہیں جبکہ عام آدمی کے لیے بھی تقلید جائز نہیں کیونکہ تقلید کی جو تفریق کتب کے اندر ملتی ہے وہ یہ ہے کہ قائل کی بات کو بلا دلیل مان لینا تقلید کہلاتا ہے۔ اب جب ایک عام آدمی کسی عالم سے سوال کرتا ہے تو وہ عالم کے جواب کو عین قرآن وسنت سمجھ کر عمل کرتا ہے اور اپنی سوچ کے مطابق وہ اللہ کے اور اس کے

رسول ﷺ کے حکم کے مطابق عمل کر رہا ہوتا ہے اور اس کا ایسا کرنا اسے مقلد نہیں بناتا۔اب یہ بات تو عالم پر ہے کہ وہ اسے کس دلیل یا کس تقلید سے مسئلہ بتاتا ہے۔عام آدمی اس سے بری الذمہ ہے کیونکہ وہ اپنی سوچ کے مطابق عین قرآن وسنت پر عمل کر رہا ہوتا ہے۔واللہ اعلم (راشد)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ [النحل:٤٣]

”اہل علم سے سوال کرو اگر تم نہیں جانتے۔“ تو اس آیت کی بناء پر مسلمانوں کی دو قسمیں بنتی ہیں۔ایک عالم کہ جس پر واجب ہے کہ سوال کرنے والے کو جواب دے۔ دوسرا غیر عالم کہ اس پر واجب ہے کہ عالم سے سوال کرے۔ اگر ایک عام شخص آ کر عالم سے سوال کرے اور وہ عالم اس کو جواب دے تو یقیناً یہ شخص اس آیت کے حکم میں داخل ہیں۔شاید کہ سائل کا مقصود کچھ اور ہے کہ جو سوال میں مذکور نہیں ہے۔ وہ یہ ہے کہ مذاہب میں سے کسی ایک مذہب پر سختی سے عمل پیرا ہونا، پھر دوسرے مذاہب اور دیگر آئمہ کے اقوال کی طرف دیکھے بغیر یہ ہے کہ ایک مسلک کو دین سمجھ لینا یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ کتاب وسنت کے دلائل کے خلاف ہے کیونکہ اہل لوگوں کی تین قسمیں بناتے ہیں۔ ① مجتہد۔ ② دلیل کی بنیاد پر اتباع کرنے والا۔ ③ مقلد۔

یہ عام لوگوں کی حالت ہے۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہتے کہ تقلید حرام ہے لیکن جب تقلید کو ہی دین سمجھ لیا جائے پھر یہ حرام ہے۔

مطلق طور پر تقلید کو حرام کہنا جائز نہیں ہے۔

سوال مسلمان کب متبع سنت ہوتا ہے اور کب مقلد ہوتا ہے؟ اتباع اور تقلید میں فرق کیا ہے؟ [فتاوی الامارات:٢٦]

جواب اصل تو یہ ہے کہ ہر مسلمان کا موقف تو یہ ہونا چاہیے کہ ﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾ [یوسف:١٠٨]

”کہہ دیجئے کہ میرا یہ راستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، بصیرت کی بنیاد پر

میں اور جو کوئی میرا پیروکار ہوگا۔"

بلاشبہ تقلید علم نہیں ہے اور مقلد دلیل پر نہیں ہوتا۔ جس شخص کا دین ہی یہ ہو کہ وہ دوسرے کی تقلید کرے گا اور دلیل کے بغیر چلے گا، اس کا اسلام سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ تقلید کو اپنا دین سمجھے کہ جس طرح متاخرین میں سے بعض نے کسی ایک مولوی کی تقلید واجب کی۔ تو گویا اس نے بھی آئمہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید کو واجب کر دیا۔ ہم تقلید کے بارے میں وہی بات کہتے ہیں کہ جو حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے قیاس کے بارے میں کہی۔ فرماتے ہیں کہ قیاس ایک ضرورت ہے۔ اس کی طرف اس وقت جائیں گے کہ جب دلیل کتاب وسنت اور اجماع سے نہ ملے۔

ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ تقلید کو دین بنانا جائز نہیں ہے لیکن یہ ایک اس شخص کی ضرورت ہے کہ عام مسلمان ہو اور احکام دلیل کے ساتھ مستنبط کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ کہ کتاب وسنت سے دلیل کی بنیاد پر مسائل اخذ کرے اور متبع سنت ہو جائے بصیرت کے اوپر۔ یہاں ہم ایک قاعدہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ضرورتیں ممنوعات کو بھی مباح بنا دیتی ہیں۔ اپنے سے زیادہ علم والے کی تقلید اس بندے کے لیے واجب ہے، البتہ اگر کوئی تقلید کو دین بنا ڈالے تو پہلی بات یہ ہے کہ اتباع کے مرتبہ سے پھر گیا۔ اتباع یہ ہے کہ کتاب وسنت سے مسئلہ کی دلیل معلوم ہو۔ بجائے اس کے کہ وہ اجتہاد کرے کیونکہ اجتہاد کا درجہ تو اس سے کہیں بلند ہے تو یہ اللہ کے دین میں جائز نہیں ہے۔ تقلید اور اتباع میں فرق یہی ہے کہ جو ایک بینا اور نابینا میں فرق ہے۔

سوال کیا اکثریت کو اجماع معتبر کہا جاتا ہے؟ [فتاوی الامارات: ٥٥]

جواب علماء اصول کے نزدیک اکثریت کو اجماع اعتبار نہیں کہا جاتا۔ اجماع کی بہت ساری تعریفات ہیں۔ کوئی اجماع امت کہتا ہے' کوئی علماء کے اجماع کو اجماع کہتا ہے اور کوئی صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع کو معتبر سمجھتا ہے۔ اس بارے میں بہت طویل کلام

ہے۔اس پر حضرت امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''ارشاد الفحول''میں تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح صدیق حسن خان نے بھی اپنی کتاب ''تحصیل الصامول من علم الاصول'' میں اس پر بحث کی ہے۔مسائل پر اس طرح اجماع کا وقوع پذیر ہونا تو الگ بات ہے لیکن وقوع پذیر ہونے والے اجماع کا منقول ہونا ناممکن ہے۔ایک زمانے کے علماء کا اجماع کرنا کسی مسئلہ پر کیسے ممکن ہے ان کا ثابت ہونا۔اگر اجماع ثابت ہو جائے تو ان علماء سے رابطہ کی طاقت کون رکھتا ہے۔اس معاملہ کا وقوع پذیر ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ خصوصاً اس مذکورہ اجماع کے جو شخص مخالف ہو اس پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں۔

لیکن حقیقی طور پر جس شخص کے خلاف کفر کا فتویٰ لگایا جاتا ہے اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ایسا شخص کہ جو ایسے یقینی اجماع کی مخالفت کرے کہ جو علماء اصول کے نزدیک معتبر اجماع ہو کیونکہ ایسے اجماع کے مخالف شخص نے گویا اجماع کے ذریعہ سے ثابت کردہ ایک شرعی حکم سے عدولی کی ہے۔تو یہ چیز حجت قائم ہونے کے بعد اس شخص کے تکفیر کو مستلزم ہے۔ اس طرح کے یقینی قسم کا اجماع اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں داخل ہوتا ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾[النساء:١١٥]

''اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے ہدایت کے واضح ہوجانے کے بعد اور مومنوں کے راستہ کے علاوہ کی پیروی کرے ہم اسے پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے اور ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے وہ جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔''

سوال کیا صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں اجماع کا منعقد ہونا ممکن تھا؟[فتاویٰ الامارات:٥٦]

جواب صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں بھی اجماع ممکن نہیں تھا کیونکہ نبی علیہ السلام کے ہوتے ہوئے تو وہ ایک دوسرے کے قریب تھے اور آپ علیہ السلام کے بعد جب اجماع کی ضرورت تھی تو اس وقت تو صحابہ رضی اللہ عنہم ایک دوسرے سے الگ ہو چکے تھے۔فتوحات کی وجہ سے۔

تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تصور کریں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپس میں ملے اور ایک مسئلہ پر انہوں نے اجماع کیا۔ تو یہ کہاں جمع ہوئے؟ اور کون ان سے ملا؟ کہ جس نے ان صحابہ سے اجماع نقل کیا۔ تو یہ ساری باتیں ثابت ہونا ناممکن ہے۔

یہاں اس سے بھی واضح ایک بات ہے کہ اس طرح کے اجماع کے بجائے مسلمان کے لیے یہی کافی تھا کہ بعض صحابہ نے اس مسئلہ کے بارے میں یہ مؤقف اپنایا بعض صحابہ سے یہ کام ثابت ہے۔ تو یہ چیز بھی ان کے لیے دلیل بن سکتی ہے کہ جس سے وہ استدلال کریں۔ اجماع کی ایک اور قسم ہے کہ جسے اجماع سکوتی کہا جاتا ہے۔ یہ عام اجماع کو شامل نہیں ہے۔

مثلاً: بہت سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں اگر ایک شخص ایک بات کرے یا کوئی بھی کام کرے کہ جس کا شریعت سے تعلق ہو اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم اس پر خاموش رہیں تو دل تو اس طرح کے اجماع پر مطمئن ہوتا ہے' اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن یہ ایسا اجماع نہیں ہے کہ جس طرح اس کی تعریف کی جاتی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ امت کا اجماع ہے۔ یا صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے، کیونکہ یہ اجماع نسبی ہے۔

مثلاً جیسے صحیح بخاری [۱/۳۳۸] میں آتا ہے کہ:

''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اپنی خلافت کے زمانہ میں تو خطبہ میں ایک سجدہ والی آیت انہوں نے پڑھی تو منبر سے اترے اور سجدہ کیا' ان کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی سجدہ کیا۔ پھر اگلے جمعہ خطبہ ارشاد فرمایا تو اس میں سجدہ کی آیت پڑھی تو لوگ سجدہ کرنے کے لیے تیار ہوئے کہ جس طرح پہلے جمعہ میں انہوں نے کیا تھا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ تلاوت ہم پر فرض نہیں کیا۔ مگر یہ کہ ہم چاہیں۔ تو یہ ہے اجماع سکوتی، کیونکہ جمعہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین بہت سارے لوگ تھے لیکن کسی نے نہ اس کا انکار کیا اور نہ ہی ان کے خلاف کتاب وسنت میں سے کوئی دلیل پیش کی۔ تو بلاشبہ اس طرح کی مثالیں دیکھ کر دل مطمئن ضرور

ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ متاخرین کے ان میں سے جیسے احناف کہتے ہیں کہ سجدہ تلاوت واجب ہے۔اس کو چھوڑنے والا گناہ گار ہوتا ہے۔

سوال نبی علیہ السلام کا فرمان ہے ''لاتجتمع امتی علی ضلالۃ'' کا کیا مطلب ہے؟

[فتاوىٰ الامارات : ٥٤]

جواب ''لاتجتمع امتی علی ضلالۃ'' کہ میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی۔ اس حدیث سے اجماع مراد نہیں ہے۔جیسے اجماع الامۃ ایا جماع علماء الامۃ ، یا اجماع صحابہ اس حدیث کو آپ اس مثال کے ذریعہ سمجھیں،مثلاً اگر سو صحابہ کہیں پر جمع ہوں، ان پر ایک مسئلہ پیش کیا جائے ۔اس مسئلہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا آپس میں اختلاف ہو۔ ننانوے کا مؤقف ایک ہو اور ایک صحابی کا مؤقف ان سے مختلف ہو۔تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حق پر وہ اکیلا صحابی ہے۔اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غلطی پر ہیں۔اب ایسی صورت میں یہ حدیث صادق آتی ہے۔''لاتجتمع امتی علی ضلالۃ'' لیکن جب ہمارا ذہن ہی یہ ہو کہ ترجیح اکثریت کو دینی ہے تو یہ بات درست نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ حق اقلیت کے ساتھ ہو اور اکثریت والے غلطی پر ہوں۔ اگر حق یہ اکثریت ہو تو پھر امت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی اور اگر حق اکیلے بندے کے ساتھ ہو ۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''الجماعة من کان الحق ولو کان واحد۔''

''جماعت وہ ہے کہ جو حق پر ہو اگرچہ اکیلا آدمی کیوں نہ ہو۔''

سوال فقہاء کے نزدیک جمہور کا مطلب کیا ہے؟ کیا جمہور سے مراد ایک ہی زمانے کے علماء ہیں یا تمام زمانوں کے؟[فتاوىٰ الامارات : ٥٤]

جواب یہ لفظ قائل کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔حضرت امام نووی اور ابن حجر رحمہ اللہ اپنے سے پہلے والے زمانہ کے تمام علماء کو اس میں شامل سمجھتے ہیں۔تو یہ لفظ نسبت کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کی کوئی جامع ومانع تعریف کی جائے۔

جمہور سے مراد علماء کی اکثریت ہے۔ دلیل کی بناء پر جمہور کے موقف کی مخالفت درست ہے۔ بلاشبہ بغیر دلیل کے تو دل اکثریت کی بات پر زیادہ مطمئن ہوتا ہے۔ اقلیت کے مقابلہ میں۔ لیکن دلیل کی موجودگی میں تو اس دلیل پر عمل واجب ہے چاہے جمہور کی رائے کے موافق ہو یا کہ مخالف ہو۔ اور اگر کوئی شخص جمہور کی رائے کی مخالفت کرے اور اس کا دل اقلیت کے مسئلہ پر مطمئن ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جیسا کہ نبی علیہ السلام کا فرمان ہے:

"استفت قلبك وان افتاك المفتون۔"

اپنے دل سے فتویٰ پوچھ اگرچہ مفتی تجھے فتویٰ دے دیں۔ کیونکہ شریعت میں اکثریت کی بات حجت سمجھنے کے لیے کوئی نص وارد نہیں ہوئی بلکہ اس کے برخلاف ہمیں بہت ساری نصوص ملیں گی کہ جن میں اکثریت کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾

"لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔" اسی طرح حدیث میں بھی آتا ہے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

((تَفَرَّقَتِ الْيَهُودُ عَلَى إِحْدَى وَسَبْعِينَ أَوْ اثْنَتَيْنِ وَسَبْعِينَ فرقة وتفرقت النصارىٰ على اثنين وسبعين۔فرقة وستفترق امتى على ثلاث و سبعين فرقة كلهافى النار الاواحدة))

"کہ یہودیوں کے اکہتر (۷۱) فرقے بنے اور عیسائیوں کے بہتر (۷۲) فرقے بنے عنقریب میری امت کے تہتر (۷۳) فرقے بنیں گے۔ ایک کے علاوہ سب جہنم میں جائیں گے۔"

ایک حدیث ہے:

((عليكم بالجماعة ومن شذشذفى النار))

''تم جماعت کو لازم پکڑو جو شخص الگ ہوا وہ جہنم میں گیا۔'' تو اس حدیث کا پہلا حصہ تو صحیح ہے اور دوسرا حصہ ''من شذ شذفي النار'' یہ ضعیف ہے۔

حدیث میں جس جماعت کا ذکر ہے اس سے مراد سلف صالحین کی جماعت ہے۔ جیسا کہ بعض روایات میں اس کی وضاحت آئی ہے۔ ترمذی وغیرہ میں:

((كلها في النار الا واحدة قالوا من هي يارسول الله؟ قال هي الجماعة'وفي رواية اخرى۔ هي التي تكون على ماانا عليه و اصحابي))

آپ ﷺ نے فرمایا: ''ساری کی ساری جہنم میں جائیں گی' ایک کے علاوہ۔ لوگوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ وہ کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ جماعت ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے' وہ جماعت اس نہج پر ہوگی کہ جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔''

سوال عام آدمی کیا کرے کہ جب حدیث اس کے نزدیک صحیح ہو لیکن اس حدیث کا دوسری صحیح کے ساتھ تعارض کا شبہ پایا جائے؟ [فتاویٰ الامارات : ۹۵]

جواب جس طرح کہ عام فقہاء کا موقف ہے کہ ''عام شخص کا کوئی موقف نہیں ہے۔ بلکہ اپنے مفتی کا موقف ہی اس کا مؤقف ہے۔'' عام آدمی حدیث نہیں سمجھ سکتا اور نہ ہی اس کی وضاحت کر سکتا۔ حدیث سمجھنے کے لیے اتنا ہی علم کی ضرورت ہے کہ جتنا متن حدیث کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ حدیث سمجھنے کا دروازہ ہم عام آدمی کے لیے نہیں کھول سکتے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ۴۳]

''اہل علم سے سوال کرو کہ اگر تمہیں معلوم نہیں ہے۔''

تو اس آیت نے عالم اسلام کی دو قسمیں بنا دی۔ ایک عالم دین اور دوسرے غیر عالم اور جن کو دین کی تعلیمات حاصل نہیں ہیں' ان پر واجب ہے کہ وہ علماء سے سوال کریں۔ جس طرح اس عام شخص نے عالم کے ذریعہ سے صحت حدیث معلوم کر لی

تو اسی طرح اس پر یہ بھی لازم ہے کہ فقیہ کے ذریعہ سے اس حدیث کی فقاہت بھی حاصل کرے اور وہ فقیہ کتاب وسنت کا عالم ہے۔ جب اس عام آدمی نے حدیث کی صحت وفقہ کے بارے میں تعلیمات حاصل کر لیں لیکن کسی اور حدیث کی وجہ سے اس کو شبہ پڑ رہا ہے۔ تو ایسے شبہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے کہ جب اس عامی نے حدیث کی صحت وفقہ کسی عالم آدمی سے حاصل کی ہو۔ شبہ تو بسا اوقات عالم شخص کو بھی پیش آ جاتا ہے۔ عامی کے بجائے تو بہر حال اس طرح کے شبہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن شبہ قوی ہو اور معاملہ دونوں حدیثوں کی فقہ کے درمیان دور ہو جائے۔ تو اسی صورت میں کہا جائے گا کہ سوال کرو یہاں تک کہ آپ کا دل مطمئن ہو جائے۔ اگر آپ کو اطمینان حاصل نہ ہو تو یہاں پر نبی علیہ السلام کا یہ فرمان ملاحظہ رکھ لیں:

"استفت قلبك وان افتاك المفتون"

سوال کیا مکروہ کی کراہت ثابت کرنے کے لیے دلیل ضروری ہے؟ یا یہ خلاف اولیٰ سے ثابت ہو جاتی ہے؟ [فتاویٰ الامارات: ٤٦]

جواب کراہت ثابت ہونے کے لیے خلاف اولیٰ ہی کافی ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ خاص دلیل ضروری ہے کہ جو اس چیز کی کراہت کا تقاضا کرے۔

سوال نبی علیہ السلام کی حدیث "مامررت لیلة اسری بی بملاء من الملائکة الا قالوا یا محمد مرامتك بالحجامة" تو کیا اس حدیث میں لفظ "مُر" وجوب پہ دلالت کرتا ہے؟

جواب نہیں۔ بلکہ اس سے مراد ارشاد یا استحباب ہے امر وجوبی نہیں ہے۔ واللہ اعلم

غیب کے مسائل

سوال: کیا نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟[فتاوی الامارات :٤٧]

جواب: راجح بات یہ ہے کہ نبی علیہ السلام نے اپنے رب کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ بلکہ اپنی بصیرت اور دل کے ساتھ دیکھا ہے۔ اس کی صریح دلیل یہ ہے کہ نبی علیہ السلام سے ایک بار سوال کیا گیا:

”هل رایت ربك؟قالا لو رانی أراه“

کہ کیا آپ ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا؟ فرمایا نہیں۔ وہ نور ہے میں اس کو کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے وضاحت فرمادی کہ آپ ﷺ نے نور دیکھا کہ جس نے ان کو اللہ تعالیٰ کو دیکھنے سے روک دیا۔ ایک اور حدیث میں ہے:

((حِجَابُهُ النُّورُ لَوْ كَشَفَهُ لَأَحْرَقَ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ مَا انْتَهَى إِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ))

”بے شک اللہ تعالیٰ کا حجاب نور ہے اگر یہ حجاب نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے چہرے کے نور سے سب کچھ جل جاتا“ یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم میں ہیں۔

بخاری(مع الفتح ٤٧٦/٨) مسلم(١٥٩/١) دونوں میں حضرت مسروق رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے۔

انه قال لام المؤمنين عائشه رضی اللہ عنہا یاام المؤمنين هل رأى محمد ربه؟ فقالت لقدقف شعرى مماقلت قال یاام المؤمنين ارحمینی ولاتعجلی علی الیس يقول الله تعالىٰ في كتابه ”ولقد راه نزلة اخرىٰ عندسدرة المنتهى؟ قالت انا اعلم الناس بذالك لقد سالت رسول الله ﷺ

فقال رایت جبریل في صورته التي خلق فيها مرتين وله ستمائة جناح وقدسدالافق ثم قالت ثلاث من حدثكموهن فقداعظم على الله الفرية ' من حدثكم ان محمد رأى ربه فقد اعظم على الله الفرية ثم تلت"وما كان بشران يكلمه الله الاوحياأو من وراء حجاب اويرسل رسولا" وقوله تعالى:"لاتدركه الابصار وهويدرك الابصار۔"

حضرت مسروق رضی اللہ عنہ نے ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ اے ام المؤمنین کیا محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ تو فرمانے لگیں کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ جو تم نے کہا۔ پھر فرمانے لگے ام المؤمنین مجھ پر رحم کیجئے اور جلدی نہ کیجئے کہ کیا اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں نہیں فرماتے؟

﴿وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَى ○ عِندَ سِدْرَةِ الْمُنتَهَى○﴾ [النجم:١٣'١٤]

"البتہ تحقیق اس نے اس کو دیکھا ہے دوسری مرتبہ۔ اس سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔"

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمانے لگیں۔ اس چیز کو سب سے زیادہ میں ہی جانتی ہوں۔ تحقیق اس بارے میں میں نے نبی علیہ السلام سے سوال کیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے حضرت جبریل علیہ السلام کو اپنی اصل صورت میں دوبار دیکھا ہے۔ اس کے چھ سو پر ہیں اور اس نے افق کو ڈھانپ رکھا ہے۔ پھر فرمانے لگیں، تین ایسی چیزیں ہیں جس نے وہ تمہیں بیان کیں۔ تو تحقیق اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا۔ جس نے تمہیں یہ بات بتائی کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے تو تحقیق اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا۔ پھر یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا﴾

"کسی بشر کے لیے یہ لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے بات کرے مگر وحی کے

ذریعہ سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیج کر۔"

اور دوسری یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ﴾

"اس اللہ کو لوگوں کی نظریں نہیں پاسکتی حالانکہ وہ اللہ ان نظروں کا ادراک کر لیتا ہے۔"

پھر فرمانے لگیں اور جس نے تمہیں یہ بات بیان کی کہ حضرت محمد ﷺ غیب جانتے ہیں تو تحقیق اس نے بھی اللہ پر جھوٹ باندھا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ﴾[النمل:٦٥]

"کہہ دیجئے زمین وآسمان میں غیب کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔"

پھر فرمانے لگیں اور جس نے تمہیں یہ بات بیان کی کہ حضرت محمد ﷺ پر جتنا کچھ اللہ کی طرف سے تبلیغ کے لیے اترا اس میں سے کچھ اس نے چھپالیا تو تحقیق اس نے بھی اللہ پر جھوٹ باندھا۔ پھر یہ آیت پڑھی:

﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ [المائدہ:٦٧]

"اے رسول لوگوں کو پہنچا جتنا کچھ بھی تیری طرف اتارا گیا اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تم نے رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔"

سوال کیا معراج واسراء کا واقعہ نبی علیہ السلام کے ساتھ بیداری میں پیش آیا یا خواب میں؟[فتاویٰ الامارات:٤٦]

جواب اسراء ومعراج بیداری کی صورت میں ہوا ہے۔ اگر چہ اس حوالہ سے کچھ مرجوح اقوال ملتے ہیں کہ جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یا تو خواب میں آپ ﷺ کو معراج کروایا گیا یا بیداری اور خواب کی درمیانی شکل تھی۔ بلاشبہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ واقعہ بیداری کی صورت میں پیش آیا ہے۔ کیونکہ اگر یہ واقعہ خواب کا ہوتا تو یہ کوئی معجزہ نہ ہوتا بلکہ بعض کمزور ایمان والے لوگ دین میں شک کرنے لگ جاتے اور مشرکین

کو نبی علیہ السلام کا مذاق اڑانے کا موقعہ نہ ملتا۔

نبی اکرم ﷺ کا وہ چیزیں سننا جو دوسرے نہیں سن سکتے

سوال: کیا نبی اکرم ﷺ وہ سن لیتے ہیں جو دوسرے لوگ نہیں سن سکتے؟ دلائل سے وضاحت کریں۔

جواب: نبی اکرم ﷺ کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ بھی سن لیتے ہیں جو دوسرے نہیں سن سکتے۔ جیسا کہ وہ جبریل علیہ السلام کو دیکھتے اوران سے کلام کرتے تھے۔ جبکہ لوگ حضرت جبریل علیہ السلام کو دیکھتے ہیں' نہ ہی ان کو سن سکتے ہیں۔

صحیح البخاری میں حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک دن سیدہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا:

((ھذا جبریل یقرئك السلام))

''یہ جبریل علیہ السلام آپ کو سلام کہہ رہے ہیں۔''

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''ان پر بھی سلام ہو۔اے اللہ کے رسول! جو آپ دیکھتے ہیں' ہم نہیں دیکھ سکتے۔''

لیکن یہ خصوصیات نبی ﷺ صحیح نص (دلیل) سے ثابت ہوں گی' نہ کہ ضعیف روایات، قیاس وآراء کے ذریعے۔

اور موجودہ دور میں لوگ اس مسئلہ میں مخالف سمتوں پر ہیں کہ ایک تو آپ ﷺ کی صحیح احادیث سے ثابت شدہ خصوصیات تک کا اس وجہ سے انکار کردیتے ہیں کہ یہ احادیث متواتر نہیں ہیں' یا یہ عقل کے خلاف ہیں اور دوسرے آپ ﷺ کے لیے وہ ثابت کرنے پر تل جاتے ہیں۔ جو ثابت ہی نہیں۔ مثلاً

یہ کہ نبی اکرم ﷺ اول مخلوق ہیں۔

آپ ﷺ کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا' یا جب آپ ﷺ ریت پر چلتے تو ریت پر

آپ ﷺ کے قدموں کے نشان نہیں آتے تھے۔ یا کسی چٹان پر پاؤں رکھتے تو اس پر نشان پڑ جاتے۔ یہ سب باطل و من گھڑت ہیں۔

معتدل قول:

اس بارے میں یہ ہے کہ قرآن وحدیث اور اجماع امت کے مطابق نبی اکرم ﷺ ایک بشر ہیں۔ انہیں کتاب وسنت کے دلائل سے ثابت صفات وخصوصیات سے ہی متصف کیا جائے اور جب وہ ثابت ہو جائیں تو انہیں تسلیم کرنا واجب ہے اور انہیں کسی عقل نقلی فلسفہ کی وجہ سے رد کرنا جائز نہیں۔ ①

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ موجودہ دور میں بعض لوگوں کے معمولی سے شبہ کی وجہ سے موجودہ دور میں صحیح احادیث کو رد کرنے کا فتنہ پھیل رہا ہے۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ تو نبی اکرم ﷺ کی احادیث کے ساتھ دیگر غیر معصوم لوگوں کی باتوں کا سا معاملہ اختیار کرتے ہوئے، جسے چاہتے ہیں لے لیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں چھوڑ دیتے ہیں۔

انہی میں کچھ تو بزعم خود عالم ہیں اور بڑی اہم شرعی منصوبہ بندی پر بھی براجمان ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں اوپر ذکر کردہ دونوں باطل اور غالی گروہوں سے محفوظ فرمائے۔ آمین [نظم الفرائد: ۱/۱۵۲۔۱۵۱]

---

① یہاں یہی بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ نبی علیہ السلام بھی ایک بشر اور انسان تھے۔ لہٰذا انسان ہونے کے لحاظ سے سب انسانوں جیسے تھے، لیکن نبی ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بہت سی خصوصیتوں سے نوازا تھا۔ جہاں تک تعلق ہے مخفی باتوں یا آوازوں کے سن لینے کا تو اس بارے میں میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کلی طور پر اس صفت سے متصف نہیں تھے بلکہ جو بات اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو سنوانا چاہتے تھے وہ آپ ﷺ سن لیتے تھے اور باقی حالت میں آپ ﷺ اپنی مرضی سے ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ واللہ اعلم (راشد)

نبی اکرم ﷺ تک درود پہنچنا

(سوال) اگر کوئی شخص نبی اکرم ﷺ پر درود وسلام بھیجے تو کیا آپ ﷺ اسے سنتے ہیں؟

(جواب) کچھ لوگ اس بارے میں ایک حدیث پیش کرتے ہیں کہ:

((من صلی علی عندقبری' سمعته 'ومن صل علی نائبا' وکل بهاملك یبلغنی' وکفی بها مردنیاه وآخرته'وکنت له شهیداً أوشفیعاً))

''جس نے میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھا تو اسے میں سنتا ہوں اور جس نے دور سے مجھ پر درود بھیجا تو اس کے ساتھ مقرر فرشتہ مجھ تک پہنچا دیتا ہے اور ایسے شخص کے دنیا اور آخرت کے معاملات میں کفایت کی جاتی ہے اور میں (روزِ قیامت) اس کے لیے شہید و شفیع ہوں گا۔''

یہ حدیث موضوع ہے۔ تفصیل [الضعیفه ۱۰۳۱] میں ملاحظہ فرمائیں۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ [الرد علی الاخنائی: ص ۲۱۱'۲۱۰] میں فرماتے ہیں:

''اگر یہ حدیث صحیح ثابت بھی ہو جائے تو اس میں یہ ہے کہ دور سے بھیجا جانے والا درود نبی اکرم ﷺ تک پہنچایا جاتا ہے' نہ کہ آپ بذاتِ خود اسے سنتے ہیں۔ جیسا کہ معترض (الاخنائی) نے نقل کیا ہے اور اہل علم میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں اور اس بارہ میں کوئی حدیث معروف نہیں۔

یہ صرف بعض جاہل متاخرین ہی کا کہنا ہے کہ:

''نبی اکرم ﷺ جمعہ کے دن اور رات اپنے کانوں سے درود سنتے ہیں۔''

یہ کہنا کہ آپ ﷺ خود درود پڑھنے والوں سے سنتے ہیں، باطل ہے، کیونکہ اس بارے میں معروف احادیث ہیں کہ وہ درود وسلام آپ ﷺ تک پہنچایا جاتا ہے اور فرشتے پہنچاتے ہیں۔'' (ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کلام ختم ہوا)

قلت: ان جاہلوں کے قول کا بطلان نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان سے بھی ہوتا

ہے کہ:

((اکثروا علی من الصلاۃ یوم الجمعۃ فان صلاتکم تبلغنی۔))۔

”تم مجھ پر جمعہ کے دن کثرت سے درود پڑھا کرو یقیناً تمہارا درود مجھ تک پہنچ جاتا ہے۔“

یہ حدیث صحیح اور صریح ہے کہ جمعہ کے دن کا درود آپ ﷺ خود نہیں سنتے بلکہ آپ ﷺ تک پہنچایا جاتا ہے اور فرشتے پہنچاتے ہیں۔(نظم الفرائد ۱/ ۱۵۴۔۱۵۳)

نبی اکرم ﷺ کے بعد نبوت اور وحی:

سوال کیا ابھی تک نبوت اور وحی کا سلسلہ جاری ہے؟

جواب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز فجر سے فارغ ہو کر ارشاد فرمایا:

((ھل رای احدمنکم اللیلۃ رؤیا؟ ویقول لیس یبقی بعدی من النبوۃ الا الرؤیا الصالحۃ))

”کیا تم میں سے کسی نے آج رات کوئی خواب دیکھا ہے؟ اور فرماتے: میرے بعد نبوت میں سے صرف اچھے خواب ہی باقی رہیں گے۔“

[سلسلہ الصحیحہ:۱۴۷۳]

یہ حدیث اس بارے میں نص ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد نبوت اور وحی کا کوئی سلسلہ نہیں سوائے اچھے خوابوں کے اور یہ نبوت کا چھیالیسواں (۴۶) حصہ ہے۔

اور ایک جماعت جو کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد نبوت کے بقاء اور جاری رہنے کی دعوے دار ہے نے اس حدیث اور دیگر احادیث کی تاویل کرتے ہوئے انہیں بیکار قرار دیا ہے۔

جیسا کہ انہوں نے اللہ کے فرمان:

﴿وَلَكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ [الاحزاب:۴۰]

کی تحریف کرتے ہوئے ''خاتم النبیین'' کو ''زینة النبیین'' قرار دیا ہے۔
کبھی کہتے ہیں کہ تشریعی نبوت ختم ہوگئی' غیر تشریعی نبوت باقی ہے۔

قابل افسوس بات تو یہ ہے کہ انہی میں سے کسی نے الشیخ محی الدین بن عربی کی کتاب ''الفتوحات المکیة'' سے جھوٹی نبوت پر دلالت کرنے والے چند کلمات پر مشتمل ایک پمفلٹ ترتیب دے کر اسے لوگوں میں نشر کیا ہے۔ بڑے بڑے مشائخ میں سے کوئی بھی ان کارد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ حالانکہ اس سے قبل وہ ان جھوٹی نبوت کے دعویداروں کے رد میں کئی رسائل لکھ چکے ہیں، لیکن وہ اس پمفلٹ کا جواب اس لیے لکھنے سے باز ہیں کہ اس پمفلٹ کے جامع نے ابن عدی کے کلام جو کہ ان کی گمراہی کا مؤید ہے کے سوا' اس میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ تو یہ اس کی ایک چال ہے کہ اگر یہ مشائخ اس پمفلٹ کا جواب دیتے ہیں تو درحقیقت وہ شیخ اکبر ابن عربی کارد کر رہے ہیں اور اتنی جرأت ان میں نہیں کہ وہ شیخ اکبر کارد کرسکیں۔ اگر وہ اسے زندیقیت (بے دینی) نہیں سمجھتے تو اور بے دینی کیا ہے؟

تو گویا کہ ان مشائخ کا یہ عقیدہ ونظریہ ہے کہ باطل بھی محل اور مقام کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اگر یہ ایسے شخص کے خلاف کھڑے ہوئے ہیں' جسے یہ کافر سمجھتے ہیں تو (اس کی بات 'نظریات) باطل ہیں اور جب ایسے شخص کے مدمقابل ہوں جسے یہ مسلم بلکہ ولی تسلیم کرتے ہیں۔ تو (اس کے نظریات باطل ہونے کے باوجود) حق ہیں۔ واللہ المستعان۔ (یعنی باطل وحق کو پرکھنے کے لیے شخصیات کو معیار سمجھنے سے یہی ہوتا ہے کہ ناپسندیدہ شخصیت کی بات کفر اور پسندیدہ کی حق قرار پاتی ہے۔)

اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ فوت ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''یقیناً اس (میرے بیٹے) کے لیے جنت میں دودھ پلانے والی ہے۔ اگر وہ زندہ رہتا تو سچا نبی ہوتا۔''

یہ روایت ضعیف ہے۔[الضعیفہ: ۲۲۰]

اس حدیث کا دوسرا جملہ حضرت عبداللہ ابن ابی روفی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی ہے کہ جب ان سے کہا گیا کہ آپ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے متعلق کیا خیال ہے تو فرمایا:

''وہ بچپن میں ہی فوت ہوگیا' اگر یہ بات مقرر ہوتی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہوگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا زندہ رہتا لیکن آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے ''صحیح بخاری ۱۰/۴۷۶'' اورابن ماجہ :۱/۴۵۹'' نے روایت کیا ہے اور احمد ''۴/۳۵۳'' کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

((ولو کان بعدالنبی صلی اللہ علیہ وسلم نبی مامات ابنہ ابراھیم))

''اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی نے آنا ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ فوت نہ ہوتا۔''

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

''حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو' اگر وہ زندہ رہتا تو سچا نبی ہوتا۔''

[مسند احمد ۳/۱۳۳' ۲۸۰۔۲۸۱]

اس کی سند مسلم کی شرط پر صحیح ہے اور اس میں یہ زائد الفاظ ہیں کہ:

''لیکن وہ باقی (زندہ) نہ رہا' اس لیے کہ تمہارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔''

حضرت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (۱۰/۴۷۶) نے اسے ذکر کر کے ''صحیح'' کہا ہے۔

اور یہ روایات اگرچہ موقوف ہیں (لیکن) حکماً مرفوع ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق انہی امور سے ہے۔ جہاں رائے' عقل کا کوئی تعلق نہیں۔ جب یہ بات آپ کو سمجھ آ گئی تو اس سے آپ کو قادیانیوں کی گمراہی واضح ہو جائے گی کہ ان کا اس جملہ:

''اگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ زندہ رہتا تو نبی ہوتا'' سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کے باقی وجاری رہنے پر استدلال باطل ہے۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح بالکل

ثابت نہیں۔

اگر وہ اسے آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے قوی کرنا چاہیں' جیسا کہ ہم نے کیا ہے تو یہ بات انہیں خاموش کرانے کے لیے کافی ہے اور ان کی دلیل انہی کے خلاف جائے گی۔ وہ اس طرح کہ آثار صحابہ رضی اللہ عنہم میں اس بات کی تصریح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی نہ ہونے کے سبب وہ بچپن میں فوت ہوئے۔ (اور یہ بات ان کے خلاف ہے) کبھی کبھی وہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر مجادلہ کا مناظرہ کرتے ہوئے' ان آثار سے استدلال کمزور کرنے اور انہیں موقوف ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے ان کی اس دلیل کو جن دلائل سے کمزور ثابت کیا ہے' اس سے چھٹکارا ان کے لیے جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً صراحت سے یہ حدیث صحیح ثابت نہیں۔ (نظم الفرائد ۱/۱۵٦۔۱۵٤)

کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھول ناممکن ہے؟

سوال کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھول ناممکن ہے؟ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ:

((اما انی لاانسی ' ولکن انسی لاشرح))

"خبردار! یقیناً میں نہیں بھولتا اور مجھے بھلا دیا جاتا ہے' تاکہ میں شریعت کی وضاحت کروں۔"

جواب یہ روایت باطل ہے اس کی کوئی اصل بنیاد نہیں۔ (الضعیفہ: ۱۰۱)

اس سے ظاہر تو یہ ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بتقصائے بشریت نہیں بھولتے' اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شریعت سازی کرنے کے سبب بھلا دیتا ہے۔

جبکہ یہ بخاری و مسلم کی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث کے خلاف ہے کہ:

((إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ أَنْسَى كَمَا تَنْسَوْنَ فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي))

”میں تو صرف ایک بشر ہوں جیسے تم بھولتے ہو اسی طرح میں بھی بھول جاتا ہوں' پس جب میں بھول جایا کروں تو مجھے یاد دلا دیا کرو۔“

اور آپ ﷺ کے بھول پر بیان و تعلیم کے فوائد اور حکمتوں کا حصول اس کے منافی نہیں۔ اور بشری تقاضے کے مطابق آپ ﷺ سے بھول کی نفی کو اس حدیث سے ثابت کرنا' اوپر ذکر کردہ صحیح حدیث کے مخالف و معارض ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔

[نظم الفرائد: ١/ ١٦٣]

سوال: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بہت ساری جنتوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً جنت الفردوس ہے' جنت عدن اور جنت الماویٰ ہے تو کیا ”سدرۃ المنتہیٰ سب سے اعلیٰ مرتبہ والی ہے۔ آسمانوں میں؟ اور جس جنت کی مسلمان دعا کرتا ہے وہ کون سی ہے؟

[فتاویٰ الامارات: ٤٥]

جواب: نبی ﷺ نے فرمایا:

((اذا سالتم اللہ الجنة فاسئلو االفردوس الاعلیٰ فانها اعلیٰ درجات الجنة))

”جب تم اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرو تو جنت الفردوس کا سوال کیا کرو کیونکہ یہ سب سے اعلیٰ جنت ہے۔ تو معلوم ہوا کہ جنتیں بہت ساری ہیں۔ سدرۃ المنتہیٰ تو اسراء و معراج کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنت نہیں بلکہ کوئی دوسری چیز ہے۔

سوال: ”شرح عقیدہ طحاویہ“ میں آپ نے یہ بات ذکر کی ہے کہ آگ کی دو قسمیں ہیں اس سے کیا مراد ہے؟ [فتاویٰ المدینة: ٩٣]

جواب: دونوں ہی آگیں مقصود ہیں۔ ایک سے مراد یہ ہے کہ ہمیشگی والی آگ جس میں کفار ہمیشہ رہیں گے۔ دوسری وہ آگ جو ہمیشگی والی نہیں ہے جس میں ہر امت کے وہ موحدین جائیں گے کہ جتنی سزا کے مستحق ہوں گے وہ سزا پا کر اس سے نکال لیے جائیں گے۔

سوال: کیا مردے سنتے ہیں؟ [فتاویٰ الامارات: ٣٤]

(جواب) غزوہ بدر میں جب اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے سرداروں کو مارا تھا اور ان کو بدر کے کنویں میں پھینکا گیا تھا۔ تو نبی علیہ السلام لڑائی ختم ہونے کے بعد کنویں پر آ کر کھڑے ہو کر ان مرے ہوئے کفار کے لوگوں کو نام لے لے کر پکار رہے تھے اور فرما رہے تھے:

((لقد وجدت ماوعدني ربي حقافهل وجدتم ماوعدربكم حقا؟
فقال عمر يارسول الله انك لتنادي اجساداً لاارواح فيها))

''تحقیق میں نے برحق پایا جو مجھ سے میرے رب نے وعدہ کیا تھا۔ کیا تم نے بھی اپنے رب کے وعدے کو سچا پایا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے اجسام سے مخاطب ہیں کہ جن میں روحیں نہیں ہیں'' تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس چیز کے بارے میں خبر دے رہے ہیں کہ جو چیز انہوں نے نبی علیہ السلام کی تربیت سے پائی تھی کہ مردے نہیں سنتے اور مزید یہ کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہی کافی ہے:

﴿إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ﴾ [النمل:٨٠]

''بے شک آپ مردوں کو اپنی بات نہیں سنوا سکتے اور نہیں آپ بھرے کو اپنی پکار سنوا سکتے۔''

اور دوسرا فرمان:

﴿وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ﴾ [فاطر:٢٢]

''جو قبروں میں ہیں آپ ان کو نہیں سنا سکتے۔''

اسی لیے نبی علیہ السلام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((ماانتم باسمع لمااقول لهم))

''کہ جو میں ان سے کہہ رہا ہوں وہ بات یہ لوگ تم سے زیادہ اچھی طرح سن رہے ہیں۔'' یہ نبی علیہ السلام کا معجزہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان مُردوں کو آپ علیہ السلام کی آواز سنوا

دی۔اس مفہوم کی مزید تاکید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جیسے حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی صحیح سند کے ساتھ مسند احمد میں روایت کیا ہے۔اس اضافہ کے ساتھ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جو جواب دیا وہ سابقہ حدیث میں گزر چکا ہے۔تو مطلب اس حدیث کا یہ ہوا کہ نبی علیہ السلام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس عبارت پر برقرار رہنے دیا کہ جو صحیح تھی لیکن اس میں ایک قید کا اضافہ کر دیا کہ یہ مُردے ابھی ان سے مستثنیٰ ہیں۔اس لیے ''صحیح بخاری'' میں اسی قصہ میں یہ بات آئی ہے۔ اس طریق سے ''قتادہ عن انس بن مالک قتادہ فرماتے ہیں۔ان مُردوں کو اس وقت نبی علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ نے زندہ کر دیا تھا تاکہ ان کو نبی علیہ السلام کی آواز سنوائی جائے۔ذلیل کرنے اور حقیر کرنے کے لیے۔

ایک اور حدیث بھی ''صحیح بخاری'' میں آتی ہے کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((اذاوضع المیت فی قبره وانصرف الناس عنه انه لیسمع قرع نعالهم وهم عنه مدبرون))

کہ جب مردے کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور لوگ واپس پلٹتے ہیں تو البتہ وہ مردہ ان لوگوں کے جوتوں کی آواز سن رہا ہوتا ہے جبکہ وہ لوگ واپس جا رہے ہوتے ہیں۔ تو عام قاعدے سے اس کو مستثنیٰ کر دیا کہ مردے صرف اس وقت سنتے ہیں کہ جب لوگ پلٹ کر جا رہے ہوتے ہیں۔فقط۔اور اس مسئلہ کا تعلق بھی غیبی امور کے ساتھ ہے۔ تو اس میں زیادہ بحث نہیں کی جا سکتی۔

سوال کیا جس طرح کافر آدمی کو قبر میں عذاب ہوتا ہے اور فرشتے اس کو مارتے ہیں یہی صورت حال ایک نافرمان مسلمان کے ساتھ بھی ہوتی ہے؟

[فتاوی الامارات : ٤٤]

جواب یہ ایسی چیز ہے کہ جس کے بارے میں ہم اتنا زیادہ نہیں جانتے۔کیونکہ احتمال ہے کہ اس طرح کے عذاب میں کافر کے ساتھ ساتھ منافق یا مسلمانوں میں سے فساق شریک ہوتے ہیں کہ جس طرح کہ ایک صریح حدیث ہے:

((استنزھوا من البول فان عامة عذاب القبر منه))

کہ پیشاب کے چھینٹوں سے بچو' بے شک عام طور پہ عذاب قبر اس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان کو قبر میں عذاب ہوتا ہے لیکن اس عذاب کی نوعیت کیا ہوتی ہے یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اس معنی کی تائید میں ایک اور حدیث بھی ہے کہ "بخاری ۱/۸۹'۹۰" و مسلم ۱/۱۴۰" میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں:

((انَّ مَرَّ نَبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَبْرَيْنِ فَقَالَ إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُه۔ وفي لَا يَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ))

"نبی علیہ السلام دو قبروں کے پاس سے گزرے کہ ان کو عذاب ہو رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو کسی بڑی چیز کی وجہ سے عذاب نہیں ہو رہا۔ ان میں سے ایک پیشاب کے چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چغل خوری کرتا تھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ تر ٹہنی لائی جائے۔ اس ٹہنی کو چیر کر دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔ دونوں قبروں پر گاڑ دیں۔ لوگوں نے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شاید کہ اللہ تعالیٰ ان کے عذاب میں تخفیف کر دے کہ جب تک یہ دونوں تر رہیں گی۔"

"صحیح مسلم" میں ایک روایت ہے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے آپ نے فرمایا:

((لعل الله ان يخفف عنهما بشفاعتي))

شاید کہ اللہ تعالیٰ میری سفارش کی وجہ سے ان کے عذاب میں تخفیف کر دے۔

گناہ گار موحد کے عذاب کی کیفیت

سوال جو لوگ توحید والے ہیں' لیکن گناہوں کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔ کیا انھیں جہنم کی گرمی ایسے محسوس ہوگی' جیسے گرم حمام میں بوقت غسل ہوتی ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب اس حوالے سے ایک موضوع حدیث لوگوں میں مشہور ہے کہ:

((انما حر جهنم علی امتی كحر الحمام))

"میری امت پر جہنم کی گرمی' حمام کی گرمی جیسی ہے۔" [سلسلہ الضعیفہ: ۷۰۹۱]

اس جیسی باطل روایت کو محمد الواقدی اور شعیب بن طلحہ جیسے کذاب راوی کرتے ہیں۔ یہ روایت شریعت کے تربیتی واصلاحی پروگرام کے خلاف ہے کہ بے شمار آیات و احادیث میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے گناہ گاروں' نافرمانوں کے لیے ایسی بھڑکتی ہوئی آگ کی وعیدیں بیان کی گئی ہیں جو کہ:

﴿الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ﴾ [الهمزة:۷]

"دلوں تک جھانکتی ہے۔"

اور صحیح احادیث جو کہ کثیر تعداد میں ہیں' ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

① "تین شخص ایسے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ ان سے کلام کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ① اپنا پجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والا۔ ② دے کر احسان جتلانے والا۔ ③ جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا مال بیچنے والا۔" [صحیح مسلم' ارواء الغلیل: ۸۹۲]

② تین شخص ایسے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے کلام کرے گا' ان کا تزکیہ کرے گا' نہ ہی ان کی طرف دیکھے گا۔ ① بوڑھا زانی۔ ② جھوٹا حکمران۔ ③ متکبر فقیر۔ [مسلم]

③ نبی اکرم ﷺ نے حدیث شفاعت میں ارشاد فرمایا:

"یہاں تک کہ اللہ جب اپنے بندوں کے فیصلے سے فارغ ہوگا اور لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دینے والوں میں سے جسے آگ سے نکالنا چاہے گا تو اللہ فرشتوں کو انہیں نکالنے کا حکم دے گا۔ فرشتے انہیں سجدوں کے نشانات سے پہچانیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ آگ پر ابن آدم کے سجدوں کے نشان والی جگہ کو کھانا (جلانا) حرام قرار دیا ہے۔ فرشتے

انہیں اس حالت میں نکالیں گے کہ ان کی جلد جل کر ہڈیاں ظاہر ہو چکی ہوں گی۔

اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ ہیں:

''پس فرشتے ایک کثیر تعداد کو نکالیں گے کہ آگ نے انہیں نصف پنڈلی اور گھٹنوں تک جلا دیا ہوگا۔'' [صحیح مسلم]

یہ تمام واضح احادیث اس روایت کا باطل ہونا واضح کر رہی ہیں کہ جہنم کا عذاب تو تکلیف دہ ہوگا نا کہ حمام کی گرمی' تپش جیسا' بلکہ یہ ہو بھی نہیں سکتا کہ آگ نے انہیں جلا کر ان کا گوشت کھا کر ان کی ہڈیاں بھی ظاہر کر دی ہوں اور انہیں حمام کی سی گرمی محسوس ہو۔

خلاصہ کلام:

یہ کہ اس روایت کا معاملہ بہت خراب ہے کہ یہ لوگوں کو محرمات کے ارتکاب پر دلیر کر رہی ہے کہ جہنم میں عذاب تو صرف ہلکا ہوگا' حمام کی گرمی جیسا۔ (لہٰذا اسے پیش کرنا جائز نہیں۔) [نظم الفرائد ۱/۹۸-۹۶]

عذاب قبر

سوال کیا قبر میں عذاب ہوتا ہے؟

جواب سیدنا ابوسعید خدری' سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

''ہم قبیلہ بنونجار کے ایک باغ میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے اور آپ ﷺ خچر پر سوار تھے' اچانک وہ خچر اس طرح بدکا کہ نبی اکرم ﷺ کو گرادیتا' (وہاں دیکھا تو) چار' پانچ یا چھ قبریں تھیں۔

ارشاد فرمایا: ان قبر والوں کو کون جانتا ہے؟ ایک شخص نے کہا: میں جانتا ہوں' پوچھا: یہ کب فوت ہوئے؟

تو بتایا گیا کہ یہ شرک پر مرے ہیں۔ تو ارشاد فرمایا:

''یہ امت اپنی قبروں میں آزمائی جاتی ہے۔ اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہو کہ تم مردے دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ وہ تمھیں وہ عذابِ قبر سنوادے جو میں سنتا ہوں۔''

سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر نبی اکرم ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

''تم آگ کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ہم جہنم کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

ارشاد فرمایا: ''قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ''ہم عذابِ قبر سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔''

ارشاد فرمایا: ''اللہ کی ظاہری اور پوشیدہ فتنوں سے پناہ مانگو۔''

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ''ہم ظاہری اور پوشیدہ فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔''

ارشاد فرمایا: ''دجال کے فتنہ سے بھی اللہ کی پناہ مانگو۔''

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ''ہم دجال کے فتنہ سے بھی اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔''

[سلسلة الصحيحه: ١٥٩]

اس حدیث سے:

① عذاب قبر کا ثبوت ہے اور اس بارے میں احادیث متواتر ہیں اور اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ خبر واحد ہیں۔

اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ یہ خبر واحد ہیں تو انہیں قبول کرنا واجب ہے' اس لیے کہ قرآن اس کا شاہد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

﴿وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ ۝ النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ [غافر: ٤٥، ٤٦]

''اور آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا جو آگ ہے' اس پر صبح وشام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی' آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔''

اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ قرآن میں عذاب قبر کی احادیث کا شاہد نہیں' یعنی ان کی تائید نہیں ہوتی' تو بھی صرف یہ احادیث ہی اس عقیدہ کے اثبات کے لیے کافی ہیں اور یہ نظریہ کہ صحیح خبر واحد سے عقیدہ ثابت نہیں ہوتا۔ ایسا باطل نظریہ ہے جو اسلام میں شامل کر دیا گیا ہے۔ ائمہ دین' ائمہ اربعہ وغیرہم رحمہم اللہ بھی اس کے قائل نہیں۔

بلکہ بعض علمائے کرام بغیر دلیل وبرہان کے یہ نظریہ لے کر آئے ہیں۔ اور ہم نے اس اہم موضوع پر مستقل کتاب لکھی ہے۔ (کہ خبر واحد حجت ہے)

قبر میں فرشتوں' منکر نکیر کا سوال کرنا حق وثابت ہے۔ اس بارے میں بھی متواتر احادیث ہیں۔ اس لیے اس پر یقین رکھنا بھی فرض ہے۔ [نظم الفرائد: ١/ ٨٩-٨٨]

سوال کیا موت کے فرشتہ کا نام عزرائیل صحیح ہے؟[فتاویٰ الامارات:۱۱۱]

جواب نبی کریم علیہ السلام سے کسی صحیح حدیث میں یہ نہیں آیا کہ ملک الموت کا نام عزرائیل ہے۔[1]

سوال یہ توفیق کیسی دی جاسکتی ہے کہ ایک شخص مومن ہے اور اس کی روح پاک ہے، پاک روح کا آرام سے نکلنا اور اس بندے کے لیے قبر میں وسعت کا ہونا اور دوسری بات کہ مُردے کو بعض گناہوں کی وجہ سے عذاب بھی ہوتا ہے؟[فتاویٰ الامارات:۵۱]

جواب اس طرح کی کوئی حدیث موجود نہیں ہے کہ جس میں اس طرح کی دو متضاد چیزوں کے درمیان مطابقت بیان کی گئی ہو کہ جو چیزیں سوال میں مذکور ہیں۔ ایک تو وہ شخص ہے کہ جسے عذاب دیا جائے گا جیسے آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((استنزھوا من البول فان عامة عذاب القبر منه))

کہ پیشاب سے بچو کیونکہ عام طور پہ عذاب پیشاب کے چھینٹوں سے نہ بچنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس طرح کے آدمی کی روح کے بارے میں نہیں آیا کہ اس کی روح کو ریشم کے کپڑے میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ ان معاملات کا تعلق غیب سے ہے۔ اس میں زیادہ اندر نہیں گھسنا چاہیے۔ کیونکہ یہ مسئلہ ایمانیات سے تعلق رکھتا ہے۔ احکام سے تعلق نہیں رکھتا۔

[1] یہ بات درست ہے کہ موت کے فرشتے کا نام عزرائیل قرآن وسنت سے کہیں ثابت نہیں ہے۔ بعض سلف نے اس کا یہ نام ذکر کیا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لہٰذا ملک الموت کا عزرائیل نام درست نہیں اور موت کے فرشتے کو ملک الموت کہنا چاہیے۔ (راشد)

طہارت کے مسائل

سوال جاری پانی کا کیا حکم ہے؟ کہ جس کے ساتھ بعض کیمیائی مادے بھی مل جائیں اور کھیتوں کو اس کے ذریعہ سیراب کیا جاتا ہے کہ جب کپڑے کو لگ جائے تو کیا کپڑے کو پلید کر دیتا ہے؟ اور اس سے وضو کرنے کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ الامارات: ۱٦۸]

جواب نجس پانی جب بہہ جائے اور اپنی حقیقت سے نکل جائے تو دوسری حقیقت کا حکم اس پہ لاگو ہوتا ہے۔ پانی پلید تب ہوتا ہے کہ جب اس کے اوصاف ثلاثہ ذائقہ رنگ اور بو میں سے کوئی ایک بدل جائے پلیدی کی وجہ سے۔

پاک پانی وہ ہے کہ جس رنگ ذائقہ اور بو تبدیل نہ ہو۔ جس طرح کہ حدیث میں ہے:

((الماء طهور لا ينجسه شئى))

پانی پاک ہے اسے کوئی چیز پلید نہیں کرتی اور یہی قلتین والی حدیث کے لیے بھی فیصل ہے۔ ①

اگر پانی دو قلوں سے کم ہو اور اس میں نجاست گر جائے اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی بھی وصف متغیر نہ ہو تو وہ پانی قاعدے کے مطابق پاک ہے۔

سوال چاردیواری یا چاردیواری کے بغیر قضائے حاجت کرتے وقت قبلہ رخ ہونے کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ الامارات: ۱۳۰]

جواب راجح بات یہ ہے کہ چاردیواری میں یا میدان قبلہ رخ ہو کر قضائے حاجت

① قلتین سے مراد یہاں قلہ حجر حجاز کے مٹکے ہیں جن میں ایک محتاط اندازے کے مطابق 5 من 27 کلو پانی آتا ہے۔یعنی اتنا پانی ہو تو تھوڑی بہت نجاست اسے نقصان نہیں دیتی جب تک کہ اس کے اوصاف ثلاثہ سے کچھ بدل نہ جائے۔(راشد)

کرنا جائز نہیں ہے۔

بخاری ومسلم کی حدیث ہے۔حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

((أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا أَتَيْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوهَا وَلَكِنْ شَرِّقُوا أَوْ غَرِّبُوا قَالَ أَبُو أَيُّوبَ فَقَدِمْنَا الشَّامَ فَوَجَدْنَا مَرَاحِيضَ بُنِيَتْ قِبَلَ الْقِبْلَةِ فَنَنْحَرِفُ وَنَسْتَغْفِرُ اللَّهَ تَعَالَى))

کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم قضائے حاجت کے لیے آؤ تو قبلہ کی طرف نہ اپنا چہرہ کرو اور نہ ہی اس کی طرف اپنی پیٹھ کرو لیکن مشرق کی طرف منہ کرلو یا مغرب کی طرف منہ کرلو۔حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب ہم شام گئے تو وہاں جو بیت الخلاء تھے ان کے منہ کعبہ کی طرف تھے۔تو ہم ان میں پھر کر بیٹھتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے تھے۔حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے جو راوی الحدیث ہیں وہ اس حدیث کو عام معنی پر محمول کرتے تھے۔اس لیے تو استغفار کیا کرتے تھے۔

اسی طرح اور بھی استنباطی دلائل ہیں کہ جو اس قول کو مزید مضبوط کرتے ہیں۔مثلاً ایسی احادیث بھی ہیں کہ جن میں مسلمان شخص کو قبلہ رخ تھوکنے سے منع کیا گیا ہے۔ آپ علیہ السلام نے مسجد میں ایک آدمی کو دیکھا کو جو قبلہ رخ ہو کر تھوک رہا تھا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منع کر دیا۔جبکہ وہ چاردیواری والی مسجد میں ہی نماز پڑھ رہا تھا۔ ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ قبلہ رخ تھوکنا جو ہے یہ قبلہ رخ ہو کر قضائے حاجت کرنے اور پیشاب کرنے سے چھوٹا عمل ہے۔کہ جب نبی علیہ السلام نے قبلہ رخ تھوکنے سے منع فرمایا،کیا وہ قبلہ رخ پیشاب کرنے سے نہیں روکیں گے۔

سوال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ جس کے مطابق آپ رضی اللہ عنہا نے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے سے منع فرمایا پھر خود کھڑے ہو کر پیشاب کیا ہے۔اس میں کیا تطبیق ہے؟ [فتاوی المدینہ :١٠٤]

جواب کھڑے ہو کر پیشاب کرنے سے منع کی حدیث ثابت نہیں ہے۔ نہ حضرت

عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور نہ کسی اور سے ثابت ہے۔''سنن ابن ماجہ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے''لاتبل قائما'' کھڑے ہوکر پیشاب نہ کرو لیکن یہ حدیث ضعیف ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث اس طرح کے منع والی روایات میں کہیں بھی نہیں ہے سوال میں۔ ہر معاملہ تو وہ نہیں جانتی تھی۔ اس کو معلوم نہیں تھا کہ آپ علیہ السلام نے کھڑے ہوکر پیشاب کیا۔ اس لیے کہتی ہے:

((من حدثکم ان النبی بال قائما فلا تصدقوہ))

کہ جس نے تمہیں یہ کہا کہ نبی علیہ السلام کھڑے ہوکر پیشاب کرتے تھے تو تم اس کی تصدیق نہ کرو۔ لیکن یہ بات بھی تو اسے کسی طرح سے معلوم ہوئی ہے جبکہ بخاری ومسلم میں حذیفہ کی حدیث ہے:

((انہ اتیٰ سباطۃقوم خبال قائما))

اس طرح کی دو حدیثیں اگر ٹکرائیں تو علماء فرماتے ہیں ایک اگر مثبت ہو اور دوسری حدیث منفی ہو تو مثبت کو مقدم کریں گے منفی پر، کیونکہ یہ اس کا علم ہے کہ جسے جو منفی کو معلوم نہیں ہے۔

سوال کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کا حکم کیا ہے؟

جواب شرع میں ایسی کوئی نص موجود نہیں ہے کہ جو کھڑے یا بیٹھ کر پیشاب کرنے کی فضیلت بیان کرے۔ لیکن لائق یہ ہے کہ قضائے حاجت کے لیے نکلتے وقت اپنے آپ کو پیشاب کے چھینٹوں سے دور رکھے۔ یہاں ایک کیفیت کی دوسری کیفیت پر فضیلت دینا بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر بلکہ اصل یہ ہے''استنزہوا من البول''

پیشاب کے چھینٹوں سے بچو۔ یعنی پیشاب ایسی حالت میں نہ کرو کہ جس سے آپ پر چھینٹیں پڑیں۔

یہ کہنا کہ ہم نے کسی صحابی کے بارے میں اس طرح کا اثر نہیں سنا کہ اس نے کھڑے ہوکر پیشاب کیا ہو۔ جبکہ نبی علیہ السلام کے بارے میں مروی ہے کھڑے ہوکر

پیشاب کرنا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ آپ نے اس صرف واقعہ کے وقت پیشاب کیا اور صحابہ کی طبیعت بھی ایسی نہیں تھی کہ ہر وقت آپ علیہ السلام کے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی وجہ سے آپ کی اسی میں متابعت کرتے رہے۔ ہم کہتے ہیں کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے کھڑے ہو کر پیشاب کرنا ثابت ہو گیا ہے۔ لیکن ہم اس کا انکار بھی نہیں کرتے کہ آپ نے دوسری مرتبہ پیشاب کیا یا اس کیفیت میں نہیں کیا۔

سوال کیا خون سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ [فتاویٰ المدینہ: ۱۱۱]

جواب اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے' چاہے خون تھوڑا ہو یا زیادہ اور یہ احناف کا مؤقف ہے۔

بعض کا موقف اس کے برخلاف ہے۔ یعنی خون ناقض وضو نہیں ہے۔ تھوڑا ہو چاہے زیادہ۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف ہے۔

اور بعض نے درمیانہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ اگر خون زیادہ ہوگا تو ناقض وضو ہوگا' اگر خون کم ہوگا تو ناقض وضو نہیں ہوگا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ خون مطلق طور پر ناقض وضو نہیں ہے۔ چاہے تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔ ہماری دلیل کہ براءۃ اصلیہ۔ یعنی ہر چیز اپنے اصل پر ہوگی کہ جب تک شرع سے کوئی نص نہ آجائے۔ دوسری بات "سنن ابی داؤد" وغیرہ۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی علیہ السلام کے ساتھ ایک غزوہ کیا۔ ہم نے ایک مشرک عورت کے ساتھ جماع کیا کہ جس کا شوہر غائب تھا۔ جب اس عورت کا شوہر آیا اور اسے یہ خبر ملی تو اس نے قسم کھائی کہ میں گھر نہیں آؤں گا جب تک کہ بدلہ نہ لے لوں۔ وہ قوم کے پیچھے تلاش میں نکلا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایک وادی میں شام ہو چکی تھی۔ تو انہوں نے ایک وادی میں پڑاؤ ڈالا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج رات پہرہ کون دے گا؟ تو انصار کے دو نوجوان کھڑے ہوئے کہنے لگے کہ ہم پہرہ دیں گے' اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم گھاٹی کے منہ پر کھڑے ہو جاؤ تو وہ دونوں گئے۔ انہوں نے طے کیا کہ باری باری پہرہ دیں گے۔

ایک کھڑا ہو گیا دوسرا پہرہ دینے لگا۔ ساتھ نماز شروع کردی۔ مشرک قوم کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچ گیا۔ مشرک نے دیکھا کہ پہرہ دینے والے نے نماز شروع کی تو اس نے اپنے ترکش سے تیر نکالا اور کمان میں رکھ کر اس صحابی کی طرف پھینکا تو وہ صحابی کو پنڈلی میں جا لگا۔ تو وہ نوجوان گر گیا لیکن نماز جاری رکھی۔ پھر اس مشرک نے دوسری اور تیسری بار تیر پھینکا ہر بار پنڈلی میں مارتا رہا لیکن صحابی نے نماز جاری رکھی۔ اس قصہ میں محل شاہد یہ ہے یہاں تک کہ دو رکعتیں نماز پڑھ لی، پھر اپنے ساتھی کو بیدار کیا۔ جب اس نے اس کے زخم دیکھے تو اسے یہ معاملہ بڑا خطرناک لگا۔ حضرت جریج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں ایسی سورت پڑھ رہا تھا کہ اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ میں اس سوراخ کی وجہ سے ضائع نہ ہو جاؤں جبکہ نبی علیہ السلام نے مجھے اپنے پہرے پر مقرر کیا تھا۔

اس نوجوان کا موقف یہ ہوتا کہ خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ تو یہ شروع میں ہی نماز توڑ دیتا۔ تو یہ ایک عملی دلیل ہے کہ بے شک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی علیہ السلام سے یہی چیز سیکھی ہے کہ خون ناقض وضو نہیں ہے۔

لیکن اس موقف کے جو مخالفین ہیں وہ اس حدیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس چیز کی اطلاع نہیں ملی تھی جو واقعہ صحابی کے ساتھ پیش آیا۔

تو لہٰذا یہ دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ موقوف ہے۔

اس طرح کا جواب یہ لوگ کئی ایک اختلافی مسائل میں دیتے ہیں لیکن لاعلمی کی حد ہے کہ اس طرح کے واقعہ سے حجت نہ پکڑی جائے کہ ایسا واقعہ نبی علیہ السلام کے دور میں پیش آیا اور آپ کو اس کی اطلاع نہ ہوئی ہو۔

کیونکہ اگر تو آپ کو خبر ہو جاتی اور آپ اس کو برقرار رکھتے تو پھر تو یہ حجت ہوتا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کی خبر اپنے نبی کو دی ہوگی۔ کیونکہ اس میں کوئی چیز شریعت کے خلاف ہوتی تو ضرور آسمان سے اس کا حکم نازل ہوتا۔ ایک اثر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ

کی طرف منسوب ہے کہ انہوں نے فرمایا:

((مازال اصحاب النبی ﷺ یصلون فی جراحاتھم))

''یعنی نبی علیہ السلام کے ساتھی زخموں میں نماز پڑھتے رہے۔''

علماء کے صحیح کے قول کے مطابق یہی ہے کہ خون مطلق طور پر ناقض وضو نہیں ہے۔

سوال جس کپڑے کو منی' مذی یا ودی لگی ہو اس میں نماز جائز ہے؟

[فتاویٰ المدینہ:۱۱٦]

جواب منی کی نجاست کے بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس بارے میں ابن قیم نے اپنی کتاب ''اعلام الموقعین'' میں ایک لمبی فصل لکھی اور اس میں انہوں نے نجاست منی کے دعویداروں کے دلائل کا مناقشہ کیا ہے۔ جو منی کے پاک ہونے کے قائل ہیں۔ ان کا موقف واضح ہے کہ یہ پاک ہے۔ اس بناء پر یہ ثابت ہوا کہ جس کپڑے کو منی لگی ہو تو نماز جائز ہے لیکن عملی سنت کی اتباع کرنا زیادہ بہتر ہے۔ کبھی کبھار نبی علیہ السلام نماز پڑھتے تھے' ایسے کپڑے میں کہ جسے منی لگی ہوتی تھی لیکن اگر خشک ہو تو اسے کھرچ دینا چاہئے اور اگر منی تر ہوتی تو اسے اذخر گھاس یا کسی اور چیز کے ساتھ صاف کر دیا کرتے تھے۔

مذی اور ودی یہ دونوں پلید ہیں۔ کپڑے کو پاک کرنا واجب ہے یہ پیشاب کی طرح ہیں۔

سوال کیا حکم ہے اس شخص کا جو بیدار ہو تو کپڑے پہ تری دیکھے لیکن اسے احتلام یاد نہ ہو؟[فتاویٰ الامارات: ۹۰]

جواب جب وہ تری دیکھے تو اس پر غسل واجب ہے' چاہے احتلام اسے یاد ہو یا نہ ہو۔

سوال ''لایمس القرآن الا طاھر'' اس حدیث کا کیا معنی ہے؟[فتویٰ الامارات: ۷۷]

جواب یہ حدیث سلسلہ احادیث صحیحہ میں تخریج کے ساتھ موجود ہے۔ یہ حدیث تمام طرق کے مجموعہ کے ساتھ صحیح ہے۔

صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ نبی علیہ السلام صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کے پاس آئے ان میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ایک دوسری روایت میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ تھے۔

((فانسل ابوهريرة من المجلس ثم جاء وراسه يقطر ماء فسأله الرسول عن سبب انسلاله فقالا يارسول الله اني كنت جنبا كانه يقصد يقول إني استحييت ان اجلس معك اوان اصافحك وانا جنب فقال سبحان الله ان المؤمن لاينجس))

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مجلس سے کھسک کر چلے گئے پھر دوبارہ تو ان کے سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔تو ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کھسکنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں جنبی تھا گویا کہ وہ یہ کہنا چاہ رہا تھا میں ڈر گیا کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھوں یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مصافحہ کروں جبکہ میں جنبی ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سبحان اللہ' مومن پلید نہیں ہوتا۔''

تو نبی علیہ السلام کا فرمان: ''لايمس القرآن الاطاهر'' طاہر سے مراد مومن ہے، چاہے اسے حدث اکبر ہو یا اصغر۔کوئی بھی یہاں نص صریح اور صحیح موجود نہیں ہے کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ بغیر وضو کے قرآن کو چھونا جائز نہیں ہے' چاہے حدث اصغر ہو یا حدث اکبر ہو۔

سوال کیا کسی مرد وعورت کے لیے قرآن کو چھونا بغیر وضو جائز ہے؟

[فتاویٰ المدینہ:۱۵۹]

جواب بغیر وضو قرآن پڑھنا جائز ہے۔کیونکہ اس کے برخلاف کتاب وسنت میں کوئی نص نہیں ہے۔مرد وعورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔اسی طرح سے باوضو مرد اور بغیر وضو والے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔اسی طرح حائضہ اور غیر حائضہ عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔اس کے دلائل میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے، مسلم میں:

((ان النبی ﷺ کان یذکر اللہ فی کل احوالہ))

"بے شک نبی علیہ السلام ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔" حائضہ کے بارے میں شرعی طور پر یہ حکم موجود ہے کہ وہ نماز نہیں پڑھ سکتی۔ اس کا نماز نہ پڑھنے کا حکم یہ ایک حکم تعبدی ہے۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اس کی حکمت ہمیں معلوم نہیں ہے۔تو ہمارے لیے جائز نہیں ہے کہ ہم اس کا دائرہ تنگ کریں کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے یہاں تک وسعت دی ہے ۔ وسعت اختیار کریں بھی ان کے لیے وسعت پیدا کریں کہ جس قدر اللہ نے لوگوں کے لیے وسعت پیدا کی ہے۔

اس مناسبت سے اکثر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حج کا جو واقعہ ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ حج کے لیے جارہی تھی تو مکہ کے قریب "سرف" نامی جگہ پر پہنچ کر حیض کی وجہ سے رونے لگی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((اصنعی مایصنع الحاج غیر الاتطوفی بالبیت ولاتصلی))

حاجی جو کام کرتے ہیں تم بھی وہی کام کرتی جاؤ۔صرف بیت اللہ کا طواف نہیں کرنا اور نماز نہ پڑھنا۔ تو یہاں اس کو قرآن پڑھنے اور مسجد میں داخل ہونے سے آپ ﷺ نے منع نہیں کیا۔

سوال کیا غسل شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب ہے؟[فتاویٰ الامارات:١٤٠]

جواب جی ہاں غسل کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔ کیونکہ غسل وضو کا قائم مقام ہے جس نے وضو کے شروع میں بسم اللہ نہ پڑھی تو اس کا وضو نہیں ہوتا۔

سوال کیا ناک میں پانی چڑھانا اور کلی کرنا غسل میں واجب ہے؟

[فتاویٰ الامارات:١١٩]

جواب غسل میں کلی کرنا، ناک میں پانی چڑھانا واجب نہیں کیونکہ غسل میں وضو واجب نہیں ہے۔ بلکہ وضو تو غسل سے پہلے ہوتا ہے۔سنت طریقہ یہی ہے۔ کیونکہ "صحیح مسلم" میں حدیث ہے کہ:

((سُئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الاغتسال کیف ھو؟ فقال اما انا فاحثو علی راسی ثلاث حثیات فاذا انا طاھر))

"نبی علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ غسل کیسے کیا جائے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اپنے سر پر تین چلو اپنے ہاتھ سے پانی ڈالتا ہوں تو میں پاک ہو جاتا ہوں جنابت سے۔ کلی کرنا اور ناک میں پانی چڑھانا وضو میں واجب ہے کیونکہ کئی ایک حدیثوں میں ثابت ہے۔

سوال جمعہ کے دن غسل کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ الامارات : ۳۷]

جواب اس مسئلہ میں دو طرح کی حدیثیں ہیں۔ ایک تو وہ کہ جن سے وجوب ثابت ہوتا ہے۔ دوسری احادیث جن سے صرف فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ بسا اوقات وہ وجوب کی نفی بھی کر رہی ہوتی ہے۔ جس احادیث سے وجوب ثابت ہوتا ہے اس طرح کی بہت ساری احادیث ہیں۔ مثلاً "غسل یوم الجمعة واجب علی کل محتلم"

"کہ جمعہ کے دن کا غسل ہر بالغ پر واجب ہے۔"

((من اتی الجمعة فلیغتسل))

"جو شخص جمعہ کی نماز کے لیے آئے وہ غسل کرے۔"

((حق علی کل مسلم ان یغتسل فی کل سبعة ایام))۔

"ہر مسلمان پہ لازم ہے کہ سات دن میں ایک بار غسل کرے۔"

وہ احادیث کہ جن سے افضیلت ثابت ہوتی ہے۔ یہ ہیں۔ ایک معروف حدیث کہ جو سنن اور مسانید میں ہے۔

((من توضا یوم الجمعة فبھا ونعمت ومن اغتسل فالغسل افضل))

جو شخص جمعہ کے دن وضو کرے تو یہ کافی ہے۔ اچھا ہے لیکن جو غسل کرے تو غسل افضل ہے۔ تو بعض علماء "فالغسل افضل" سے استدلال کرتے ہیں کہ غسل واجب ہے۔ جبکہ حقیقت میں حدیث اس پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ غسل کا جمعہ کے دن افضل ہونا یہ صادق آتا ہے۔ مستحب یہ بھی۔ سنت مؤکدہ یہ بھی اور واجب پر بھی یہ سب کے

سب ''ومن اغتسل فالغسل افضل'' کے تحت داخل ہیں بلکہ یہ افضلیت اور زیادہ پختہ اور ثابت ہوگی کہ جب ہم غسل جمعہ کے وجوب کا کہیں گے کہ جس طرح اگر ہم اس غسل کے سنیت کا فتویٰ دیں گے تو افضلیت زیادہ ثابت ہوگی اس کے مقابلہ میں کہ اگر استحباب کا کہا جائے۔

تو یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ افضلیت کا حکم تاکیدی حکم آنے سے پہلے کا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جو زندگی تھی اس میں کام مشقت والے زیادہ تھے۔ آج کل کی طرح کی سہولت ان کو میسر نہ تھیں۔ اتنا وافر مقدار میں پانی بھی نہ تھا کہ جس کے ذریعہ وہ اپنی نظافت اور صفائی برقرار رکھ سکتے۔ اس لیے ان کو وجوب کا حکم دیا گیا۔ اس لیے بعض احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ نبی علیہ السلام ایک دفعہ جمعہ کے دن مسجد میں داخل ہوئے تو آپ کو بو محسوس ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لو انکم غسلتم یوم الجمعة))

کاش کہ تم جمعہ کے دن غسل کرلیا کرو۔ تو یہ گویا وجوب کا تمہیدی حکم ہے۔ پھر اس کے بعد دوسری حدیثیں آئیں کہ جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کا حکم دیا اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو بھی یہی بات سمجھ میں آئی کہ جب وہ جمعہ کے دن خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ کہ اس دوران حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ داخل ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا خطبہ کاٹ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے لیٹ آنے کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے اذان سنی اور فوراً وضو کر کے مسجد میں آ گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے صرف وضو جبکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

((من اتی الجمعة فلیغتسل))

''جو شخص جمعہ کے لیے آئے تو اسے چاہیے کہ غسل کرے'' اس طرح سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تمام لوگوں کے سامنے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اس کا انکار کرنا یہ معلوم ہوتا ہے کہ غسل جمعہ فضیلت والے اعمال میں سے ہے کہ جن کے چھوڑنے پر گناہ نہیں ہوتا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس قصہ میں اس طرح کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے پہلے اس جمعہ کے دن میں کبھی بھی غسل نہیں کیا۔ یہ بات صحیح ہے لیکن دلیل یہ ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فوراً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ جیسے ہی میں نے اذان سنی وضو کیا۔ بلاشبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غسل نہیں کیا۔ لیکن اس میں دونوں جماعتوں میں سے کسی کے حق میں دلیل نہیں ملتی۔ یعنی جو وجوب غسل کے قائل ہیں اور جو افضلیت کے قائل ہیں۔ لیکن واضح دلیل حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے انکار میں ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اوپر انہوں نے انکار کیا۔

ایک فقہی نکتہ:

جن تین حدیثوں سے وجوب غسل ثابت ہو رہا ہے وہ تینوں صحیح بخاری و مسلم کی حدیثیں ہیں جبکہ جن احادیث سے جمعہ کے دن کے غسل کی افضلیت ثابت ہو رہی ہے، ان میں سے کسی کی سند بھی صحیح نہیں ہے۔ تمام طرق ملانے کے بعد ضعیف سے صحیح کے درجہ کو پہنچی ہے۔

فقہی فائدہ:

جب ایک چیز کی دلیل آئے اور وہ اس کے جواز پر دلالت کرے۔ دوسری دلیل اس معاملہ کے استحباب پر دلالت کرے۔ تو پھر صرف جواز کے حکم کو نہیں لیا جائے گا بلکہ ہم اس کے ساتھ استحباب کا حکم بھی ساتھ ملائیں گے کیونکہ استحباب جواز کے منافی نہیں ہے۔

دوسری مثال:

جب ایک حدیث میں ایک چیز مباح ہو۔ دوسری حدیث میں اس کے حرمت کا حکم آئے اور ہمیں تاریخ معلوم نہ ہو کہ ہم ایک نص کو مقدم کریں اور دوسری کو مؤخر کریں۔

قاعدہ:

جب ایک ممنوع چیز اورایک مباح آپس میں ایک دوسرے کے معارض ہوں تو ممنوع کو مباح پر مقدم کریں گے۔ جس طرح کہ ایک ضعیف سند والی حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحدحدوداً فلا تعتدوھا' وسکت عن اشیاء رحمۃ بکم فلا تسألوا عنھا))

"بے شک اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں تم ان کو ضائع مت کرو اور کچھ حدیں مقرر کی ہیں اور کچھ سے خاموش رہا تم پر رحمت کرتے ہوئے تو تم ان کے بارے میں مت پوچھو۔"

شروع اسلام میں جن احکام کے بیان سے خاموشی اختیار کی گئی تو ان کے بارے میں آج بھی اسلام خاموش ہے۔ یعنی حلال وحرام ہونے کے لحاظ سے مثلاً جیسے شراب ہے اور دوسری چیزیں کہ جب ان کو حرام کرنے والی نصوص آئیں تو علماء نے بھی ان پر بنا کی۔

اگر ہم اسی قاعدہ کو جمعہ کے دن کے غسل پر لگائیں تو ہمیں یہ چیزیں معلوم ہوتی ہیں کہ شروع اسلام میں غسل کے حکم کے بارے میں بعض احادیث میں "لو انکم اغتسلتم" اور بعض میں "ومن اغتسل فالغسل افضل" کہ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صفائی اور طہارت پر ابھارنے والی بات ہے۔ پھر اس کے بعد دوسری احادیث آئیں کہ جن میں ہے "فلیغتسل" "حق واجب" ان الفاظ کے ساتھ ایک زائد چیز ثابت ہونے لگی۔ حضرت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا ایک رسالہ ہے "نخبۃ الفکر" کے نام سے اس میں لکھتے ہیں کہ حدیث مقبول کی دو قسمیں ہیں "حسن اور صحیح" جب یہ دونوں طرح کی حدیثیں ایک دوسرے کے مخالف آئیں تو ہم ان چند ایک چیزوں کا پیچھا کریں گے۔ پہلے ہم اس طرح کی دو حدیثوں کے درمیان تطبیق دیں گے۔ تطبیق تمام صورتوں میں

سے کسی ایک کے ذریعہ دومتعارض حدیثوں کے درمیان تطبیق کی شکلیں سو سے زائد ہیں۔ ''دوسرا'' کہ جمع کی جب کوئی شکل ممکن ہو تو پھر ناسخ اور منسوخ کا اعتبار کیا جائے گا۔ ''تیسرا'' جب بحث کرنے والے بندے کے لیے ناسخ اور منسوخ واضح نہ ہو تو ثبوت کے لحاظ ترجیح دی جائے گی۔

مثلاً: اگر ایک صحیح اور ایک حسن حدیث ایک دوسرے کے مخالف ہو۔ تطبیق ممکن نہ ہو، ناسخ ومنسوخ کا پتہ نہ چل سکے تو پھر حدیث صحیح کو حسن پر ترجیح دیں گے اور جب ایک حدیث صحیح ہو لیکن غریب ہو جبکہ دوسری حدیث صحیح مشہو ہو تو حدیث صحیح مشہور کو صحیح غریب پر ترجیح دیں گے۔ ''چوتھی'' جب صحت کے لحاظ سے دونوں حدیثیں برابر درجہ کی ہوں تو اور تطبیق ممکن نہ ہو تو اس میں توقف اختیار کیا جائے گا۔

(سوال) مسواک کے استعمال کا کیا حکم ہے؟ اور کس ہاتھ کے ساتھ مسواک کی جائے؟

[فتاویٰ الامارات: ١٦٦]

(جواب) مسواک سنت ہے۔ اس پر ابھارنے کے لیے بہت ساری حدیثیں ہیں، ہاتھ سے مسواک کی جائے' اس بارے میں ہمارے پاس کوئی خاص دلیل نہیں ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں دائیں ہاتھ سے مسواک کرے اور بعض کہتے ہیں کہ بائیں ہاتھ سے مسواک کرنی چاہیے۔ جو لوگ دائیں ہاتھ سے مسواک کرنے کے قائل ہیں، وہ دائیں جانب والی احادیث سے استدلال کرتے ہیں اور جو بائیں ہاتھ کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد صفائی تو اسے وہ لوگ استنجاء پر محمول کرتے ہیں۔ بہر حال جس کا دل جس پر مطمئن ہو۔

(سوال) کیا نجاست کی کم از کم مقدار درہم کے برابر ہے، رہنمائی فرمائیں؟

(جواب) نجاست کی کم از کم مقدار کے حوالہ سے ایک حدیث ہے کہ:

((الدم مقدار الدرهم يغسل وتعادمنه الصلاة))

''درہم کی مقدار برابر خون دھویا جائے گا اور اس کی وجہ سے نماز بھی دہرائی جائے

گی۔" لیکن یہ حدیث موضوع ہے۔ دیکھیں [الضعیفہ: ۱۴۹]
حنفیہ کے نزدیک نجاست مغلظہ کی مقدار ایک درہم کے برابر ہے اور یہ ان کی دلیل ہے۔ (لیکن) یہ حدیث موضوع ہے من گھڑت ہے۔ لہٰذا اس سے نجاست کی مقدار مقرر کرنا باطل ہے اور نجاست ناپاکی سے بچنا واجب ہے خواہ وہ مقدار درہم سے کم ہی ہو ان عمومی احادیث کی وجہ سے جو طہارت کا حکم دیتی ہیں۔

[نظم الفرائد: ۱/۲۳۳]

(سوال) کیا وضو اور غسل میں پانی کی کوئی مقدار مقرر ہے یا جتنا چاہے پانی استعمال کر سکتے ہیں؟

(جواب) سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((یجزی من الوضوء مد' ومن الغسل صاع))

"وضو میں ایک مد اور غسل میں ایک صاع پانی کفایت کرتا ہے۔" [الصحیحہ: ۲٤٤٧]
القاموس میں لکھا ہے: "مد" دو رطل یا ایک اور تہائی رطل یا انسان کا دونوں ہاتھوں کا چلو بھر پانی مد کہلاتا ہے۔ (جدید وزن کے مطابق مد ۶۰۰ گرام ہوتا ہے اور صاع اڑھائی کلو بنتا ہے۔

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ "صحیح" (۱۱۷) میں فرماتے ہیں:
"اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ وضو کے لیے ایک مد پانی بھی کفایت کرتا ہے نا کہ اس بات کی اس سے کمی زیادتی ناجائز ہے۔
قلت: بات بالکل اس طرح ہے لیکن وضو اور غسل کے پانی میں اسراف سے بچنا مناسب ہے۔ اس لیے کہ اسراف ممنوع ہے۔ [نظم الفرائد: ۱/۲٦۲-۲٦۱]

گوشت کھانے سے وضو

(سوال) کیا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنا ضروری ہے؟

(جواب) سیدنا سہل بن حنظلہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے

ہوئے سنا:

((من اکل لحماً فلیتوضأ))

"جس نے گوشت کھایا' تو اسے چاہئے کہ وہ وضو کرے۔"

یہ حدیث حسن ہے۔[الصحیحہ: ۲۳۲۲]

حدیث میں امر استحباب ہے۔سوائے اونٹ کے گوشت سے کہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو واجب ہے۔اس لیے کہ ان دونوں میں فرق ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اونٹ کے گوشت سے وضو کے متعلق پوچھا؟ تو ارشاد فرمایا: "تم وضو کرو۔"

اور بکری کے گوشت سے وضو کے متعلق سوال کیا؟ تو ارشاد فرمایا: "اگر چاہو تو کرلو۔"

[صحیح مسلم ـ ارواء الغلیل ـ ۱/ ۱۵۲/ ۱۱۸ ـ نظم الفرائد: ۱/ ۲۶۸]

کیا حالت جناب میں رہنا درست ہے

سوال حالت جنابت میں رہنے کا شرعاً حکم واضح کریں؟

جواب سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ثلاثة لاتقربهم الملائكة الجنب' والسكران والمتضمخ بالخلو))

"تین طرح کے لوگوں کے قریب فرشتے نہیں جاتے۔ ① جنبی۔ ② نشے میں مدہوش۔ ③ زعفران سے بنی سرخ وزرد رنگ خوشبو میں لت پت شخص۔(الصحیحہ۔۱۸۰۴)

زعفران زدہ خوشبوس اس لیے منع کیا گیا ہے کہ یہ عورتوں کی خوشبو ہے۔[النهاية]

اس حدیث میں وہ جنبی مراد ہے جو غسل نہ کرنے کی عادت بنالے اور اکثر اوقات جنبی رہے۔ یہ بات اس کے دین میں کمی اور اس کے خبث باطن پر دلالت کرتی ہے۔

جیسا کہ حضرت امام ابن الاثیر رحمہ اللہ نے فرمایا:

وگرنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ثابت ہے کہ بسا اوقات وہ پانی کو چھوئے بغیر حالت جنابت میں ہی سو جاتے تھے۔[صحیح ابوداود۔۲۲۳]۔[نظم الفرائد: ۱/ ۲۷۲۔۲۷۱]

قضائے حاجت کے دوران بات کرنا

سوال کیا قضائے حاجت کرتے وقت' بوقت ضرورت کسی سے بات کی جا سکتی ہے، قرآن وحدیث کے دلائل سے جواب دیں؟

جواب سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب کر رہے تھے کہ اسی دوران ایک شخص نے پاس سے گزرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اذا رایتنی ھذه الحالة' فلاتسلم علی'فانك اذافعلت ذلك لم اردّعلیك))

''جب تو مجھے ایسی حالت میں دیکھے تو مجھے سلام نہ کر'اگر تم مجھے سلام کرو گے (اس حالت میں) میں تمہیں جواب نہیں دوں گا۔'' [الصحیحه:١٩٧]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پیشاب کرتے ہوئے یہ بات کہی تھی' جس سے دوران قضائے حاجت بات کرنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

اور ممانعت والی حدیث جس میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ذکر ہے (دوران قضائے حاجت بات کرنے سے) تو وہ صحیح نہ ہونے کے ساتھ ساتھ صریح بھی نہیں' اس لیے کہ اس کے الفاظ یہ ہیں:

((لا یتناجی اثنان علی غائطھما 'ینظرعلی منھما الی عورة صاحبه' فان الله یمقت علی ذلك))

''دو بندے قضائے حاجت کے دوران ایک دوسرے کی شرمگاہ کی طرف دیکھتے ہوئے گفتگو نہ کریں' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے۔''

پھر مجھے اس کی دوسری سند بھی مل گئی' جسے میں نے [سلسلة الصحیحه: ٣١٢٠] میں ذکر کیا ہے۔

حدیث مذکور شرمگاہ کی طرف دیکھتے ہوئے بات چیت کی ممانعت کی دلیل ہے' جوکہ اللہ کی ناراضگی کے کاموں میں سے ہے' نہ کہ صرف بات کرنے کی ممانعت کے متعلق۔ اگرچہ بات کرنے والا خود بھی اسے قبیح سمجھتا ہے۔

(اس حدیث سے تو حرمت ثابت نہیں ہوتی) بلکہ ایسی دلیل کا ہونا ضروری ہے جس سے حرمت ثابت ہو اور وہ ہمیں نہیں ملی۔ (ہاں) شرمگاہ کی طرف دیکھنے کی حرمت دیگر احادیث سے ثابت ہے۔[نظم الفرائد: ١/ ٢٤٦]

حیض ونفاس کے مسائل

سوال کیا حیض ونفاس کے دنوں کی کم ازکم کوئی تعداد مقرر ہے؟

جواب حیض کے حوالہ سے ایک منکر روایت موجود ہے کہ

''حیض کے ایام کم ازکم تین اورزیادہ دس دن ہیں۔''[سلسلة الضعيفه: ١٤١٤]

علماء کا حیض کے ایام کی کم ازکم اورزیادہ سے زیادہ ایام کی تعین میں اختلاف ہے۔ جیسا کہ حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (١٩/ ٢٣٧) نے بیان فرمایا کہ:

اس کے ایام کے کم اورزیادہ کی کوئی حد نہیں ۔ بلکہ جو عورت کی عادت کے مطابق ہے، وہ حیض ہے۔ اگر یہ اندازہ ہو کہ ایک دن سے کم وقت حیض کا خون عورت کو آتا ہے تو وہ حیض شمار ہوگا۔ یعنی اگر کسی عورت کی عادت شروع سے ایک دن کم ازکم مقرر ہے تو وہ اپنا حیض ایک دن شمار کرے گی اوراگر اس سے زیادہ دن خون آئے تو وہ حیض کا خون شمار نہیں ہوگا بلکہ استحاضہ کا خون کہلائے گا۔

اور جب عورت کو ایک دن سے زیادہ خون آتا ہے تو وہ معلوم ہے کہ حیض نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ بات شرع اور لغت سے معلوم ہے کہ عورت کبھی طاہرہ ہوتی ہے، کبھی حائضہ۔ اس کے طہر اور حیض دونوں کے (الگ الگ) احکامات موجود ہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس بات کو راجح قرار دیا ہے جو کہ ابن حزم کا مذہب ہے۔ جسے امام ابن حزم نے المحلی [٢/ ٢٠٣۔ ٢٠٠] میں اپنے مخصوص انداز میں تفصیلی بیان کرتے ہوئے مخالفین کا بھی رد کیا ہے۔ تفصیل وہاں ملاحظہ کرلیں۔

نفاس سے متعلق بھی سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ایک ضعیف مرفوع حدیث مروی ہے کہ:

''جب نفاس والی عورت کے سات دن گزر جائیں' پھر وہ طہارت محسوس کرے تو اسے چاہیے کہ غسل کر کے نماز ادا کرے۔''[الضعیفہ۔ ۱۲۳۳]

اس کی سند اگرچہ نبی اکرم ﷺ تک ثابت نہیں لیکن اس پر اہل العلم کا عمل ہے۔ بلکہ حضرت امام ترمذی رحمہ اللہ (۱/۲۵۸) نے تو اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ لیکن یہ بات مناسب (معلوم ہوتی) ہے کہ اس حدیث کے مفہوم کو نہ لیا جائے۔ اس لیے کہ اگر عورت سات دن سے کم میں پاک ہو جائے تو غسل کرے' نماز ادا کرے گی۔ اس لیے کہ نفاس کی کم از کم کوئی حد مقرر نہیں اور یہی بات محققین کے نزدیک معتمد ہے۔

[نظم الفرائد: ۱/۲۸۵۔۲۸۴]

نماز کا بیان

سوال نماز میں بسم اللہ جہراً پڑھنے کا حکم کیا ہے؟[فتاوی المدینہ: ۱٦۱]

جواب نماز میں بسم اللہ جہراً پڑھنا نبی اکرم ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ بلکہ سراً پڑھنا ثابت ہے اور یہ سب مذاہب میں سے صحیح ترین مؤقف ہے۔

لیکن امام کے لیے جائز ہے کہ مقتدیوں کی تعلیم کے لیے کبھی کبھار کوئی آیت یا بسم اللہ وغیرہ جہراً پڑھ لے۔

لیکن ہر وقت سنت سمجھ کر بسم اللہ کو اونچی آواز سے پڑھنا سنت صحیحہ ثابتہ کے خلاف ہے۔ ①

سوال کوئی شخص غلطی سے کسی اور جانب رخ کر کے نماز پڑھ لے۔ بعد میں پتہ چلے کہ نماز غیر قبلہ کی طرف پڑھی، وقت بھی ہو تو کیا وہ نماز دہرائے گا؟

[فتاوی المدینہ: ٢٤]

جواب نہیں دہرائے گا۔ کیونکہ ایک دفعہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اندھیرے کی وجہ سے غیر قبلہ رخ پر نماز پڑھی جب صبح ہوئی تو ان کو پتہ چلا کہ قبلہ اس رخ پر ہے لیکن نبی علیہ السلام نے ان کو نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا۔

سوال آپ کی طرف ایک بات منسوب ہے کہ رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا بدعت

---

① نماز میں امام کا بسم اللہ کو جہراً پڑھنا اگرچہ مختلف مسئلہ ہے لیکن اس کے جہراً پڑھنے کا سرے سے انکار کرنا یہ صحیح نہیں ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ راجح اور اصح سری ہے اور جہراً جائز......اس مؤقف کی تائید حدیث حضرت ابی ہریرہ، حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم کے عمل سے بھی ہوتی ہے۔ حدیث سنن نسائی اور ابن خزیمہ میں اور افعال صحابہ رضی اللہ عنہم جزء للخطیب بغدادی (۱۸۰،٤۱) میں موجود ہے۔(راشد)

ہے۔اس سے آپ نے رجوع کرلیا ہے۔کیا یہ صحیح ہے؟[فتاوی المدینہ: ۴۹]

جواب: یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ ہم تو ہمیشہ اس کا ذکر کرتے ہیں۔

حضرت امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجتہد کبھی کبھی بدعت والا کام کرتا ہے۔ لیکن اسے بدعتی نہیں کہا جائے گا، کیونکہ کبھی کبھی وہ بدعت میں واقع ہوجاتا ہے، حالانکہ سوچتا نہیں ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ شخص بدعتی ہے لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ عمل بدعت ہے کیونکہ ہم یقینی طور پر یہ کہتے ہیں کہ رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا یہ سلف سے بھی معروف نہیں ہے۔[1]

سوال: ''سنن ابی داؤد'' میں ایک حدیث ہے:

((عن ابی حمید الساعدی یصف صلاۃ الرسول ﷺ فقال کبر رسول اللہ ﷺ ثم قرأثم کبرللرکوع ثم قال سمع اللہ لمن حمدہ حتی رجع کل عظم الی موضعہ))

کیا اس حدیث کو ہم اس معنیٰ پر محمول کرسکتے ہیں کہ ہر ہڈی اپنی اصلی جگہ پر لوٹ آئے سے مراد رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا؟[فتوی الامارات: ۴۱]

جواب: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جسم کے استقرار کو برقرار رکھنا اس کی معروف کیفیت کے مطابق شرعی لحاظ سے ہر عضو کو مستقل رکھنا اپنی اصل جگہ میں۔

فائدہ:...... ہر عموی دلیل بہت سارے حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔لیکن اس حصہ پر عمل سلف صالحین سے ثابت نہیں ہے۔تو لہٰذا اس حصہ پہ عمل مشروع نہیں ہے۔اس عام

[1] رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا یہ ایک مختلف مسئلہ ہے لیکن اس کو بدعت کہنا صحیح نہیں، کیونکہ واضح اور صریح نص فریقین میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہ ایک اجتہاد ہے اور مجتہد مصیب بھی ہوتا ہے اور مخطی بھی۔اس مسئلہ کے بارے میں سب سے زیادہ اختلاف دو بھائیوں کا مشہور ہے کہ جنھوں نے ایک دوسرے کی تردید میں کتابیں بھی تحریر کیں۔جن میں شیخ العرب والعجم پیر بدیع الدین شاہ راشدی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کے اثبات میں سولہ کتابیں تحریر فرمائیں اور ان کے برادر اکبر الشیخ محب اللہ شاہ الراشدی رحمہ اللہ نے اس کی تردید میں چھ کتابیں تحریر فرمائیں۔ جوان شاء اللہ مقالات راشدیہ کی آٹھویں جلد میں شائع ہوں گی۔(راشد)

کا قاعدے سے غفلت کا باعث یہی پہلا سبب ہے۔ مسلمانوں کے درمیان بدعت کے عام ہونے کا تو اگر ہم ان بدعات پر غور کریں تو ان کے لیے دلیل تو ہمیں حدیث کے عموم سے مل جائے گی، بلکہ قرآن کریم سے بھی مل جائے گی۔

مثلاً: اذان کے شروع میں جو درود پڑھنا ہے یا جس طرح کہ قرآن کریم کی مختلف آیات پڑھنے پر مختلف دعائیں۔ ہم ان الفاظ کو بدعت کہنے میں تردد کا شکار بھی نہیں ہوتے لیکن جو حضرات یہ چیزیں پڑھتے ہیں وہ نہیں مانتے۔ بلکہ وقرآن سے دلیل پیش کرتے ہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ [الاحزاب:٥٦]

اب یہ ایک عام نص سے استدلال ہے۔ اب اس میں درود پڑھنے کا نہ وقت مقرر ہے نہ جگہ مقرر ہے۔ اس لیے امام شاطبی فرماتے ہیں کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں ایک بدعت حقیقی: کہ جس کی کتاب وسنت میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ مطلق طور پہ جیسے جبریہ اور مرجیہ وغیرہ کے عقائد ہیں۔ دوسری قسم ہے اضافی بدعت...... یہ وہ بدعت ہے کہ ایک زاویہ سے اگر اس کی طرف دیکھا جائے تو اس کی بھی کوئی اصل نہیں ملتی۔

مثلاً: جیسے نمازوں کے بعد استغفار کرنا لیکن اجتماعی استغفار نماز کے بعد اس کی کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ ایک بدعت ہے۔

دوسری مثال: یہ بھی پہلی مثال کے ساتھ ملتی جلتی ہے۔ نفل پڑھنا مشروع ہے لیکن کوئی اگر نفل نماز کی بھی جماعت کروائے اور اس دلیل سے حجت پکڑے ''يدالله على الجماعة'' کہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ یا اس دوسری حدیث سے دلیل پکڑے:

((صلاة الاثنين افضل من صلاة المرء وحده وصلاة الثلاثة ازكى عندالله من صلاة الاثنين))

کہ دو شخص کی نماز ایک سے افضل ہے اور تین شخص کی جماعت کی نماز دو سے افضل ہے۔ تو یہ عام ادلہ سے اس طرح استدلال کرے تو جب ایک شخص ایک نص سے

استدلال کرے کہ جو عام نص ہو شرعی عمل معین ثابت کرے تو بہت اچھا ہے۔ بشرطیکہ سنت سے بدعت کی طرف انحراف کرنے سے بچے۔ پھر بھی لازم ہے کہ ہم دیکھیں کہ کیا سلف نے بھی ایسا کیا ہے یا نہیں؟ بہر حال آپ کا جو اصل سوال ہے اس کے حوالہ سے میں یہی کہوں گا کہ اس طرح کی احادیث کے عموم سے بعض علماء نے استدلال کیا ہے لیکن اس عموم کے مطابق سلف کا عمل ثابت نہیں ہے لیکن اس کے استحباب کا فتویٰ نہ تو صحابہ میں سے کسی نے دیا اور نہ ہی ائمہ میں سے کسی نے دیا ہے کہ رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا سنت طریقہ ہے کہ جس طرح رکوع سے پہلے اہل السنۃ کے نزدیک ہاتھ باندھنا سنت ہے۔ یہاں ایسی کوئی خاص حدیث بھی نہیں ہے کہ جس سے ثابت ہو رکوع سے پہلے اس طرح سے ہاتھ رکھنا۔

(سوال) کیا مقتدی پر لازم ہے کہ رکوع سے سر اٹھاتے وقت وہ بھی "سمع الله لمن حمده" کہے؟ [فتاویٰ المدینہ: ۱۹]

(جواب) اس مسئلہ میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔ بعض اس کے وجوب کے قائل ہیں اور بعض نفی کے قائل ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ امام کے ساتھ "سمع اللہ لمن حمدہ" کہے۔ اس مسئلہ کے بارے میں حافظ سیوطی نے ایک پورا رسالہ لکھا کہ جس میں انہوں نے حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے موقف کی تائید کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ "مقتدی تحمید اور تسمیع دونوں کے درمیان جمع کرے گا۔ ہم بھی اسی کو راجح سمجھتے ہیں۔ دو اسباب کی وجہ سے۔

پہلا سبب: نبی علیہ السلام کا فرمان "صلوا کما رایتمونی اصلی"

کہ اس طرح نماز پڑھو جیسا مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ صحابہ نے نماز نبی علیہ السلام کی امامت سے سیکھی۔ "کما رایتمونی اصلی" کا جو معنیٰ ہے وہ بھی یہی ہے کیونکہ یہ صورت ان صحابہ کے لیے اس وقت ظاہر تھی۔ جبکہ نبی علیہ السلام سے ثابت ہے۔ آپ دونوں کو جمع کرتے تھے۔ یعنی سمع الله لمن حمده

کہتے تھے کہ جب رکوع سے اپنا سر بلند کرتے قیام کی طرف۔ جب پوری طرح کھڑے ہو جاتے تو پھر ''ربنا و لك الحمد'' کہتے تھے۔

دوسرا: رکوع سے قیام کی طرف آتے وقت کے لیے ایک حدیث ہے اور جبکہ قیام کے لیے ایک الگ سی حدیث ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مقتدی صرف ربنا و لك الحمد کہے گا تو یہ کب کہے گا؟ اگر وہ رکوع سے سر اٹھاتے وقت کہے۔ تو گویہ دعا اپنی جگہ سے ہٹ کر پڑھی گئی ۔''صلو کمارایتمونی اصلی'' کی پیروی نہیں ہوئی۔ تو اتنا ہے کہ اس نے دوسری حدیث کی تو پیروی کی ہے لیکن رکوع سے قیام کی طرف آتے وقت درمیان کی دعا چھوڑ دی تو اس سنت کے چھوڑنے کو جائز کرنے والی کوئی چیز نہیں۔ پھر نماز میں تو اس طرح کا خالی چھوڑا ہوا کوئی رکن نہیں ہے کہ جس میں کوئی خاص دعا نہ ہو اور دوسری جس حدیث میں یہ ذکر ہے۔

((اذاقال الامام:سمع الله لمن حمده فقولوا ربناولك الحمد))

تو اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ مقتدی سمع اللہ لمن حمدہ نہ کہے۔اس کی مثال اس طرح ہے کہ جیسے ایک حدیث میں ہے کہ:

((واذاقال غير المغضوب عليهم ولاالضالين'فقولوا آمين))

تو اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امام ''آمین'' نہیں کہے گا۔ تو ہم اس حدیث میں مقتدیوں کے لیے آمین کہنے کو مشروع سمجھتے ہیں۔ اور امام کے آمین کہنے کو ناجائز نہیں سمجھتے۔ کیونکہ یہ حدیث اس میں خاموش ہے جبکہ دوسری صریح حدیث موجود ہے کہ جس میں امام کے لیے ''آمین'' کہنا ثابت ہے۔ جیسے ''بخاری و مسلم'' میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔

((اذا امن الامام فامنوا......))

تو اسی طرح ہم یہی بات:

((اذاقال الامام سمع الله لمن حمده فقولوا ربناولك الحمد))

میں کہتے ہیں کہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مقتدی "سمع الله لمن حمده" نہ کہے بلکہ اس سے خاموش ہے۔

سوال: جلسہ استراحت کا کیا حکم ہے؟ تو جب امام جلسہ استراحت نہیں کر رہا تو مقتدی اس کی مخالفت کرے گا یا جلسہ استراحت ہی نہیں کرے گا؟[فتاویٰ الامارات: ۱۰]

جواب: جلسہ استراحت سنت ہے۔ ابن قیم نے اپنی کتاب "زادالمعاد" میں جلسہ استراحت کے حکم بارے میں جو لکھا ہے کہ یہ سنت نہیں ہے بلکہ کسی سبب سے نبی علیہ السلام کرتے تھے۔ اس دھوکہ میں نہیں آنا چاہئے کیونکہ یہ قول "صحیح بخاری" میں جو حدیث ہے یہ اس کے مخالف ہے:

ابوحمید ساعدی نے ایک دن اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کیا میں تمہیں نبی علیہ السلام کی نماز نہ پڑھ کر دکھاؤں؟ تو صحابہ کہنے لگے تجھے ہم سے زیادہ پتہ نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا۔ تو انہوں نے فرمایا کیوں نہیں۔ لوگوں نے کہا پڑھ کر دکھا تو وہ صحابی نبی علیہ السلام کی نماز بیان کرنے لگا تو اس میں یہ بھی ہے کہ جب پہلی رکعت کے دوسرے سجدے سے دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہونے لگے تو پہلے بیٹھ کر جلسہ استراحت فرمایا، پھر کھڑے ہوگئے اور اس طرح اس نے نبی علیہ السلام کی نماز کے پورے اوصاف بیان کر دیئے تو صحابہ نے کہا کہ واقعتاً نبی علیہ السلام اسی طرح نماز پڑھا کرتے تھے۔ ابن قیم یا دوسرے سات صدیاں گزر جانے کے بعد آ کر مختلف علتیں بیان کرنے لگے جبکہ ابوحمید ساعدی اور اس کے ساتھی جو تھے انہوں نے بذات خود نبی علیہ السلام کی نماز دیکھی اور وہ بیان کر رہے ہیں جو کہ ان لوگوں کے مقابلہ میں آپ کی نماز کو زیادہ جاننے والے ہیں۔ اگر آپ نے جلسہ استراحت کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے کیا ہوتا تو یہ چیز صحابہ سے مخفی نہ رہتی۔ امام نووی "المجموع شرح المهذب" میں فرماتے ہیں کہ جلسہ استراحت سنت ہے اس کی پابندی لازمی ہے۔ جب امام جلسہ استراحت نہ کرے تو مقتدی کے لیے ضروری ہے کہ امام کی متابعت کرے کیونکہ امام کی متابعت کرنا نماز کے واجبات میں

سے ہے۔ جیسا کہ حدیث ہے:

((انما جعل الامام لیؤتم به فاذا کبر فکبرو واذا رکع فارکعوا واذاقال سمع الله لمن حمده فقولوا ربناولك الحمد واذاسجد فاسجدو واذاصلی قائما فصلوا قیاماً واذا صلی جالساً فصلوا جلوساً اجمعین))

کہ امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم ربناولک الحمد کہو۔ جب وہ سجدہ کرے تم بھی سجدہ کرو۔ جب وہ کھڑا ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی سب کھڑے ہو کر نماز پڑھو۔ جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔

تو یہ حدیث بھی امام کی اقتدا کو لازم کرتی ہے۔ اگرچہ وہ امام بعض سنتوں کی ادائیگی میں کمی کرے۔ تو تحقیق اسے امام نے نماز کے ارکان میں ایک رکن مقتدی کے لیے ساقط کر دیا اور وہ ہے قیام۔

(سوال) کیا امام کے سلام پھیرنے کے بعد مقتدی سلام پھیرے گا یا ہر سلام کے ساتھ اس کی متابعت کرے گا؟ [فتاوی الامارات: ۸۲]

(جواب) نبی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: ((انماجعل الامام لیؤتم به فاذاکبر فکبروا واذا رکع فارکعوا))

اسی پر ہم قیاس کریں گے "واذاسلم فسلموا" اور جب سلام پھیرے تو تم بھی سلام پھیرو۔ اہل السنہ کے نزدیک ایک اور طریقہ بھی معروف ہے کہ نبی علیہ السلام سے روایت ہے ((کان یقتصر احیانا علی تسلیمة واحدة)) کہ کبھی کبھار ایک ہی سلام پہ اکتفا کرتے تھے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ سلام میں بھی امام کی اقتدا کرے۔ امام کے سلام پھیر لینے کے بعد سلام پھیرے تو یہ بھی صحیح ہے کیونکہ سلام پھیرنا دونوں طرف یہ بھی نماز کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ نبی علیہ السلام کا فرمان ہے:

((تحریمها التکبیر وتحلیلها التسلیم))

نماز سے خارج تمام کاموں کو اللہ اکبر حرام کر دیتا ہے اور سلام ان کو حلال کر دیتا ہے۔ سلام سے مراد پہلا سلام ہے کہ جب امام "السلام علیکم" کہے تو ہم بھی اس کی متابعت کریں گے اس سے پیچھے نہیں رہیں گے۔

سوال تشہد میں کب اپنی انگلی کو حرکت دی جائے گی؟[فتاویٰ الامارات:۷]

جواب مطلق طور پر اس بارے میں کوئی واضح حدیث تو نہیں آئی کہ "اشھدان لاالہ الااللہ" کے وقت اٹھائی جائے ،اس لیے وائل کی حدیث کسی بھی مخالف حدیث سے محفوظ سمجھی جائے گی۔ یہ جانتے ہوئے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ صرف رائے' اجتہاد اور اپنے استنباط کی وجہ سے کہتے ہیں۔ بلاشبہ علماء کے ایسے بیان کردہ قواعد موجود ہیں کہ جن میں یہ بات ہے کہ نص ہوئے اجتہاد کی کوئی حیثیت نہیں ہے کہ جب وائل کی حدیث میں یہ ذکر آ گیا ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں نبی علیہ السلام نماز میں بیٹھنے کے دوران شروع سے لے کر آخر تک یعنی سلام پھیرنے تک اپنی انگلی ہلاتے رہتے تھے تو کسی استنباط کے ذریعہ سے اس طرح کی صریح سنت کی مخالفت جائز نہیں ہے۔

سوال نماز کے دوران تشہد میں انگلی کو حرکت دینے کی کیفیت کیا ہوگی؟

[فتاویٰ الامارات:٤]

جواب یہاں اس کے بارے میں وائل حجر کی حدیث ہے:

((انہ رای النبی صلی اللہ علیہ وسلم حینماجلس للتشھد فی الصلاۃ' فرایتہ یحر کھایدعوبھا))

انہوں نبی علیہ السلام کو دیکھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشہد کے لیے بیٹھے فرماتے ہیں کہ "میں نے آپ علیہ السلام کو دیکھا آپ اپنی انگلی کو حرکت دے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ دعا بھی کر رہے تھے۔اس حرکت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نیچے اوپر کرتے تھے کیونکہ یہ مطلق کسی حدیث میں بھی نہیں آیا' تو حرکت سے مراد یہ ہے کہ اپنی جگہ پر تیزی سے انگلی کو حرکت دیتے تھے۔ امام احمد سے بھی صحیح سند سے ثابت ہے کہ وہ اپنی انگلی کو حرکت دیا

کرتے تھے۔

سوال کیا سجدے میں جاتے وقت نمازی زمین پر پہلے اپنے ہاتھ رکھے گا یا گھٹنے رکھے گا؟ [فتاوی الامارات: ۱]

جواب ابوداؤد میں قوی سند کے ساتھ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث موجود ہے کہ:

((إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَبْرُكْ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيرُ وَلْيُضَعْ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ))

''جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو اس طرح نہ بیٹھے کہ جس طرح اونٹ بیٹھتا ہے بلکہ اپنے ہاتھ اپنے گھٹنوں سے پہلے رکھے۔'' بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ حدیث مقلوب ہے۔ یعنی اصل میں راوی یہ کہنا چاہ رہا تھا:

((فليضع ركبتيه قبل يديه))

لیکن حدیث مقلوب ہوگئی راوی سے۔

کیونکہ اونٹ کی کیفیت انسان سے مختلف ہے۔ وہ جب بیٹھتا ہے تو پہلے اپنے گھٹنے زمین پر رکھتا ہے۔ کیونکہ گھٹنے اگلے پاؤں کے شمار ہوتے ہیں۔ اس لیے نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَبْرُكْ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيرُ))

یعنی گھٹنوں پر نہ بیٹھا کرو کہ جس طرح اونٹ گھٹنوں پر بیٹھتا ہے۔ بلکہ پہلے ہاتھ رکھنے ہیں زمین پہ اس کے بعد گھٹنے۔ اس کی مخالفت کرنے والوں کی حجت ابوداؤد اور دیگر کتابوں میں ایک حدیث ہے۔ وائل بن حجر کی۔

((رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سَجَدَ وَضَعَ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ))

یعنی انہوں نے نبی علیہ السلام کو دیکھا کہ جب آپ سجدہ کرتے تو اپنے گھٹنے ہاتھوں سے پہلے رکھتے۔ لیکن یہ حدیث ''شریک بن عبداللہ القاضی'' کے طریق سے مروی ہے

کہ جواگرچہ صدوق ہے لیکن علماء حدیث نے اس کے ''سوء الحفظ'' پر اتفاق کیا ہے۔
اس لیے امام مسلم نے بھی اپنی ''صحیح'' میں جو اس کی حدیث ذکر کی ہے۔ وہ بھی دوسری روایت کے ساتھ مقرون ہے' اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اگر ''شریک'' متفرد ہو تو قابل احتجاج نہیں ہوتا۔ تو یہ حدیث سنداً ضعیف ہے۔

سوال تورک کب بیٹھتے ہیں؟[فتاویٰ الامارات:۲۷]

جواب دورکعت والی نماز میں چاہے نفل ہوں یا فرض ہوں کسی حدیث کی کتاب میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے۔ بلکہ دورکعتوں والی نماز میں تورک کرنا یہ نص صحیح کے مخالف ہے۔ جیسے کہ امام مالک ایک حدیث لائے ہیں' موطا'' میں صحیح سند کے ساتھ۔

((إِنَّمَا سُنَّةُ الصَّلَاةِ أَنْ تَنْصِبَ الْيُمْنَى وَتَثْنِيَ وان تفرش اليسرىٰ))

عبداللہ بن عمر بن خطاب فرماتے ہیں کہ نماز میں سنت طریقہ یہ ہے کہ دائیں پاؤں کو کھڑا رکھا جائے اور بائیں پاؤں کو بچھایا جائے۔ علماء حدیث کے نزدیک یہ حدیث مرفوع کے حکم میں ہے۔ ابن عمر کے اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں بیٹھنے کا طریقہ ہی یہ ہے۔ تو لہٰذا ہمیشہ اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ ہاں اگر کوئی خاص دلیل آئے جو اس حالت سے کچھ مستثنیٰ کرے تو اس کی خاص دلیل ہونی چاہیے۔ تو تورک کے بارے میں نبی علیہ السلام سے یہی مروی ہے کہ آپ دوسرے تشہد میں کیا کرتے تھے کہ جو سلام کے قریب ہے' پہلے تشہد میں ایسا نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص قیام اللیل کرے اور دو دو رکعت پڑھ رہا ہو تو اسے چاہیے کہ ہر تشہد میں تورک کے بجائے ایک پاؤں کھڑا رکھے اور دوسرے کو بچھا دے۔

لیکن ''صحیح مسلم'' میں ایک حدیث ہے کہ نبی علیہ السلام اقعاء کیا کرتے تھے۔ تو اس پر ہم عمل کس طرح کرسکتے ہیں؟ تو ہم اس کے بارے میں وہی کہتے ہیں کہ جو ہمارے متقدمین آئمہ نے کہا کہ یہ اقعاء تو دو سجدوں کے درمیان کبھی کبھار کیا جاتا ہے لیکن ہمیشہ کے طور پر قاعدہ وہی ہے کہ جو ابن عمر کی روایت میں بیان ہے۔

سوال رکوع کے بعد سے سجدہ میں جانے کے لیے زمین پر پہلے ہاتھ لگائیں جائیں یا گھٹنے؟ کچھ یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((کان یخرعلی رکبتیه ولا نتکئ))

''اپنے گھٹنوں کے بل زمین پر جاتے تھے اور ہاتھوں کا سہارا نہیں لیتے تھے۔''

وضاحت فرمائیں؟

جواب یہ حدیث ضعیف ہے۔[الضعیفہ: ۹۲۹]

امام طحاوی رحمہ اللہ (۱۵۱/۱) نے ابراہیم عن اصحاب عبداللہ علقمہ اور اسود کے طریق سے نقل کیا کہ علقمہ اور اسود رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہم نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی نماز سے یہ بات محفوظ کی کہ وہ رکوع بعد اپنے گھٹنوں کے بل (سجدہ میں جانے کے لیے) ایسے جھکتے جیسے اونٹ گرتا ہے اور انہوں نے اپنے گھٹنے ہاتھوں سے پہلے رکھے۔''

اس کی سند صحیح ہے لیکن اس اثر میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اونٹ اپنے گھٹنوں کے بل جو کہ اس کے اگلی ٹانگوں میں ہوتے ہیں کے بل زمین پر بیٹھتا ہے۔

جب بات اس طرح ہے تو اونٹ کی طرح نہ گھٹنوں پر بیٹھنے نماز کے لیے ضروری ہے کیونکہ بہت سی احادیث میں اونٹ کی طرح بیٹھنے کی ممانعت ثابت ہے اور بعض میں تو اس کی باقاعدہ وضاحت موجود ہے۔

جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ:

((إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَبْرُكْ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيرُ وَضَعَ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ))

''جب تم میں سے کوئی سجدہ کرنے لگے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے اور چاہیے کہ وہ اپنے ہاتھ گھٹنوں سے پہلے (زمین پر) رکھے۔''

امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اسے جید سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

((كان النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سَجَدَ بدأ وَضَعَ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ))

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرنے لگتے تو اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے زمین پر رکھنے سے ابتدا کرتے۔''

اسے امام طحاوی رحمہ اللہ نے ''شرح الھانی ۱/۱۴۹'' میں روایت کیا ہے اور انہوں نے اس کا ایک شاہد حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ جس میں ان کا اپنا عمل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل موجود ہے، روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ اسے صحیح قرار دیا ہے۔ یہ تمام ثابت شدہ احادیث اوپر ذکر کردہ (گھٹنے پہلے لگانے والی) احادیث کی نکارت پر دلالت کرتی ہیں اور ان میں سے بعض کے ضعف پر دلالت کرنے والی وہ احادیث بھی ہیں جن میں پہلی رکعت سے دوسری کے لیے قیام کی کیفیت کا ذکر ہے۔ مثلاً:

امام ابوقلابہ تابعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سیدنا مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ نے ہمارے پاس آ کر کہا کہ میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے متعلق نہ بتلاؤں؟

''پس انہوں نے فرض نماز کے وقت کے علاوہ وقت میں نماز ادا کی۔ جب پہلی رکعت کے دوسرے سجدے سے سر اٹھایا تو بیٹھ گئے' پھر اپنے ہاتھوں کا زمین پر سہارا لے کر کھڑے ہوئے۔''

اسے امام شافعی ''الام ۱/۱۰۱'' امام نسائی (۱/۱۷۳) اور امام بیہقی رحمہ اللہ (۲/۱۳۵، ۱۲٤) نے شیخین کی شرط پر صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

اور امام بخاری رحمہ اللہ (۲/۲٤۱) نے دوسری سند سے ابوقلابہ رحمہ اللہ سے اسی معنی کی حدیث روایت کی ہے۔

یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ دوسری رکعت کے لیے ہاتھوں کا سہارا

لے کر کھڑا ہونا مسنون ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا:

”امام عبدالرزاق نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا عمل روایت کیا کہ وہ جب سجدہ سے کھڑے ہونے لگتے تو ہاتھوں کو اٹھانے سے قبل ان کا سہارا لیتے تھے۔

قلت:

مصنف عبدالرزاق (۲۹۶۴، ۲۹۶۹) کی سند میں عبداللہ بن عمر العمری ضعیف ہے۔ لیکن اس کا ایک قوی شاہد ہے جسے میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے ”حدیث نمبر ۹۶۷“ کے تحت بیان کروں گا۔

الغرض اوپر ذکر کردہ دلائل سے ثابت ہوا کہ سجدہ میں جانے اور ان سے اٹھتے وقت ہاتھوں کو زمین پر لگانا سنت صحیحہ ہے۔ [نظم الفرائد: ۱/ ۳۳۹-۳۳۷]

(سوال) کیا دو سجدوں کے درمیان ”اقعاء“ ثابت ہے؟

(جواب) ① سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((مِنَ السُّنَّةِ فِي الصَّلَاةِ أَنْ تَضَعَ أَلْيَتَيْكَ عَلَى عَقِبَيْكَ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ))

”نماز میں سنت میں سے یہ (بھی) ہے کہ آپ اپنی سرین کو اپنی ایڑھیوں پر رکھ دیں۔ دو سجدوں کے درمیان۔“

یہ صحیح ہے۔ [الصحیحہ: ۳۸۳۱]

② امام طاؤس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمیں نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے قدموں پر اقعاء سے متعلق سوال کیا؟ تو انہوں نے فرمایا:

”ھی السنة“ (یہ سنت ہے)

میں نے کہا: میرے خیال میں لوگ (اسے عجیب سمجھتے ہوئے) اعراض کریں گے۔ تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔“ [الصحیحہ]

③ معاویہ بن خدیج رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

میں نے طاؤس رحمہ اللہ کو اقعاء کرتے ہوئے دیکھا' تو کہا: میں نے آپ کو اقعاء کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ تو انہوں نے کہا:

تو نے مجھے اقعاء نہیں کرتے دیکھا' بلکہ یہ تو نماز (کا حصہ) ہے۔ میں نے عبادلہ ثلاثہ' عبداللہ بن عباس' عبداللہ بن الزبیر اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔

ابوزبیر بیان کرتے ہیں (پھر) میں نے معاویہ بن خدیج کو بھی اقعاء کرتے دیکھا۔

اوپر بیان کردہ حدیث اور آثار میں سوال میں مذکور اقعاء کی مشروع کی دلیل ہے کہ یہ قابل اطاعت سنت ہے۔ تاکہ عذر کی وجہ سے (اقعاء کیا گیا) جیسا کہ بعض متعصب لوگوں کا خیال ہے۔

اور یہ عذر کی وجہ سے کیسے ہوسکتا ہے جبکہ عبادلہ رضی اللہ عنہم نماز میں اس پر عمل کر رہے ہیں۔

امام احمد نے ارشاد فرمایا: ''اہل مکہ (بھی) یہ کرتے ہیں۔'' [مسائل المروزی: ١٩]

جو اس سنت پر عمل کرتے ہوئے اسے زندہ کرنا چاہتا ہے تو اسے اسلاف کا یہ عمل کافی ہے۔

اسی طریقہ اور اختراش دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ یہ دونوں مسنون ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے دونوں پر عمل کیا جائے۔ تاکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں کوئی کام عمل سے رہ نہ جائے۔ [نظم الفرائد: ١/ ٣٤٠-٣٣٩]

سوال اگر کوئی شخص مسجد میں آئے اور جماعت کھڑی ہو اور صف میں خالی جگہ نہ ہو تو کیا وہ اکیلا پیچھے کھڑا ہوسکتا ہے؟ [فتاوی الامارات: ٤٠]

جواب: اسے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ پہلے والی صف میں شامل ہوجائے۔ آج کل تو لوگوں میں صف ملا کر کھڑے ہونے کا شوق بھی تو نہیں ہے۔ تو اگر ممکن ہو اور آسانی کے ساتھ اگلی صف میں جگہ مل سکے۔ اگر اسے جگہ ملنا ممکن نہ ہو اور تمام نمازی صف میں مل کر کھڑے ہوئے ہوں تو ایسی صورت میں اکیلا پیچھے نماز پڑھے گا۔ اگلی

صف سے کسی آدمی کو پیچھے کھینچ نہیں سکتا۔ کیونکہ اگلی صف سے کسی کو پیچھے کھینچنا یہ سنت سے ثابت نہیں ہے۔ ابویعلیٰ کی ایک ضعیف سند کے ساتھ حدیث، پھر صف سے بندہ کھینچنے کا مطلب ہے، اس صف میں خلل ڈالنا۔ تو اس آدمی کے لیے صف سے پیچھے نماز پڑھنا کہ جسے اگلی صف میں جگہ نہ ملے اور دوسرا وہ آدمی جو مسجد میں جب داخل ہو تو امام رکوع میں ہو اور وہ رکوع میں شامل ہو کر رکعت پالے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ:

((لاصلاة لمن صلي في الصف وحده))۔

کہ جو شخص صف میں اکیلا نماز پڑھے اس کی نماز نہیں ہے۔ اور دوسری حدیث:

((لاصلاة لمن لم يقراء بفاتحة الكتاب))

ان دونوں حدیثوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

سوال اگر ایک مقتدی ہو تو امام کے کس جانب اور کیسے کھڑا ہوگا؟" بادلائل وضاحت فرمائیں؟

جواب سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ ام حرام رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دو رکعات نفل نماز اس طرح پڑھائی کہ سیدہ ام حرام اور سیدہ ام سلیم کو پیچھے اور مجھے اپنے دائیں طرف کھڑا کیا۔ [الصحیحہ: ۱۴۱]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر دو نمازی ہوں تو مقتدی امام کے دائیں جانب برابر کھڑا ہوگا۔ نہ اس سے آگے کھڑا' نہ پیچھے' اس لیے کہ اگر ایسا کوئی معاملہ ہوتا تو راوی ضرور بیان کرتا' خصوصاً جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کے ساتھ کئی بار نماز ادا کی ہے۔

اس بارے میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث "صحیحین" اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی "مسلم" میں موجود ہے۔ جنہیں میں نے "ارواء الغلیل" (۵۳۳) میں ذکر کیا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث پر باب قائم کیا ہے:

((بَاب يَقُومُ عَنْ يَمِينِ الْإِمَامِ بِحِذَائِهِ سَوَاءً إِذَا كَانَا اثْنَيْنِ))

"جب دو (نمازی) ہوں تو مقتدی کے امام کے دائیں طرف اس کے برابر کھڑا

ہونے کا باب۔“

حافظ ابن الحجر رحمہ اللہ نے ”الفتح (۱۶۰/۲)“ میں فرمایا:

امام بخاری کے قول ”سواء“ کا مطلب ہے۔ اس سے آگے یا پیچھے کھڑا نہ ہو۔ شاید امام بخاری رحمہ اللہ کا اشارہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول کی طرف ہے جو بعض طرق میں ہے کہ ”فقمت الی جنبه“ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں کھڑا ہوا۔ ظاہر ہے اس سے مراد برابر ہے اور امام عبدالرزاق نے ابن جریج سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: میں نے عطاء سے کہا: دو بندے نماز پڑھتے وقت کہاں کھڑے ہوں؟ فرمایا: امام کے دائیں جانب۔ میں نے کہا: کیا آپ یہ چاہتے ہو کہ مقتدی امام کے برابر اس طرح کھڑا ہو کہ درمیان میں خالی جگہ نہ ہو؟ تو امام عطاء نے کہا: جی ہاں۔

موطا (۳۲/۱۰۴/۱) میں صحیح سند سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے (اسی طرح) مروی ہے۔

پس یہ امام کے برابر کھڑے ہونے سے متعلق مذکورہ بالا احادیث کے ساتھ قوی دلیل ہے۔

یہ کہنا کہ مقتدی کا امام سے پیچھے کھڑا ہونا مستحب ہے جیسا کہ بعض فقہی مذاہب میں لکھا ہے تو یہ سنت سے دلیل نہ ہونے کے ساتھ ساتھ مذکورہ احادیث کے ظاہر، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اثر اور جلیل القدر تابعی امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ اور اسی طرح کے دیگر اقوال کے مخالف بھی ہے۔

ایک مومن کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ ان مذاہب کے اقوال کو یہ سوچتے ہوئے ترک کر دے کہ وہ حق کی تلاش میں کوشش کرنے کی وجہ سے ماجور ہوں گے۔ (لیکن) اس پر سنت کا اتباع لازم ہے۔ اس لیے کہ بہترین طریقہ سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو وہ رات کے آخری پہر نماز ادا کر رہے تھے، میں آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا تو آپ نے مجھے اپنے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اپنے برابر کر دیا۔ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی طرف متوجہ ہوئے تو میں پیچھے ہٹ گیا۔

نماز سے فارغ ہو کر رسول اللہ ﷺ نے مجھے کہا:

''تمہیں کیا ہو گیا ہے' میں تمہیں اپنے برابر کر رہا ہوں اور تم پیچھے ہٹ رہے ہو؟''

تو میں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا کسی کو یہ زیب ہے کہ وہ آپ کے برابر کھڑا ہو کر نماز ادا کرے' جبکہ آپ اللہ کے رسول ہو (اور رسالت) آپ کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو میں نے (یہ کہہ کر) خوش کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے میرے علم وفہم میں زیادتی کی دعا کی۔'' [الصحیحہ: ۲۰۶۔۲۵۹]

اس حدیث میں ایسا فقہی فائدہ ہے جو آپ کو اکثریت فقہ میں نہیں ملے گا بلکہ بعض تو اس کے مخالفت کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ مقتدی کا امام کے دائیں جانب برابر کھڑا ہونا مسنون ہے۔ اس سے آگے' نہ اس کے پیچھے' برخلاف ان مذاہب کے کہ جن میں ہے کہ مقتدی امام سے اتنا پیچھے کھڑا ہو کہ اس کے پاؤں کی انگلیاں امام کی ایڑھیوں کے برابر آ جائیں۔

اور یہ حدیث مذکور اور سلف کے عمل کے خلاف ہے۔ امام مالک ''موطا'' (۱/۱۵۴) میں نافع سے روایت کیا کہ:

''میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے ایک نماز میں کھڑا ہوا اور میرے علاوہ اور کوئی نمازی نہ تھا۔ تو عبداللہ نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے برابر کر دیا۔ پھر امام مالک (۱/۱۷۰۔۱۷۹) نے عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ سے روایت کیا۔ وہ فرماتے ہیں: میں دوپہر کے وقت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو وہ نفل نماز ادا کر رہے تھے۔ تو میں بھی ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا' تو انہوں نے مجھے قریب کرتے ہوئے اپنے دائیں جانب برابر کھڑا کر لیا۔ جب ان کا خادم آ گیا تو میں پیچھے ہوا اور ہم نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے صف بنا دی۔''

اس کی سند بھی صحیح ہے۔

اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ مرض وفات کے وقت باہر تشریف لائے اور سیدنا

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 'سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بائیں طرف ان کے برابر بیٹھ گئے۔

[مختصر صحیح البخاری: ۱/۲۲۶]۔[نظم الفرائد: ۱/۳۲۲۔۳۲۴]

سوال اکثر مساجد میں ستون ہوتے ہیں' تو کیا ستونوں کے درمیان صف بنائی جا سکتی ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں؟

جواب قرہ بن ایاس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((کنانُنهی ان نصف بین السواری علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم ونطرد عنها طرداً))

''ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں ستونوں کے درمیان صف بنانے سے منع کیا جاتا اور ہمیں پیچھے ہٹا دیا جاتا۔''[الصحیحه: ۳۳۵]

یہ حدیث ستونوں کے درمیان صف نہ بنانے کی صریح دلیل ہے۔ لہٰذا آگے یا پیچھے صف بنانا لازمی ہے،سوائے کسی مجبوری کے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

((لاتصفوا بین السواری))

''تم ستونوں کے درمیان صف نہ بناؤ۔''[المدونه ۱/ ۱۰۶'بیهقی ۳/ ۱۰۴]

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ ممانعت اس لیے کہ ستون صف کے ملانے' جوڑنے میں رکاوٹ بنتا ہے۔''

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''دو ستونوں کے درمیان جب مسجد چھوٹی ہو تو صف بنانے میں کوئی حرج نہیں۔''

[المغنی لابن قدامه۔۲/ ۲۲۰] میں ہے:

''امام کے لیے دو ستونوں کے درمیان کھڑا ہونا مکروہ نہیں۔مقتدیوں کے لیے مکروہ ہے۔اس لیے کہ ستون ان کی صفوں کو منقطع کر دیتا ہے۔

ابن مسعود' ابراہیم نخعی نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ حذیفہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ مروی ہے۔

ابن سیرین' مالک' اہل الرائے اور ابن المنذر نے اس لیے اس کی رخصت دی ہے کہ اس کے منع کی کوئی دلیل نہیں۔

(امام ابن عکرامہ فرماتے ہیں) ہماری دلیل قرہ بن ایاس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے اور اس کے منع کی وجہ ہے کہ اس سے صف منقطع ہو جاتی ہے۔ (ہاں) اگر صف ہی دو ستونوں کے درمیان چھوٹی سی ہو تو کوئی مسئلہ نہیں' اس لیے کہ اس سے صف نہیں ٹوٹتی۔

"فتح الباری ۱/ ۴۷۷" میں لکھا ہے:

"امام الطبری فرماتے ہیں: ایک جماعت نے ستون کے درمیان صف بنانے کی ممانعت کی ۔حدیث کی وجہ سے۔ ناپسند کیا ہے اور اس کی وجہ تنگی نہ ہونا ہے۔ (یعنی اور جگہ موجود ہے) اور اس کی حکمت یا تو صف کے انقطاع ہے یا جوتے رکھنے کی جگہ ہے۔ امام قرطبی نے فرمایا: اس کی کراہت کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مومن جنوں کے نماز ادا کرنے کی جگہ ہے۔"

قلت: ایسا بڑا منبر جس کے بہت سے درجے ہوتے ہیں' کہ وہ پہلی صف کو بسا اوقات دوسری صف کو بھی منقطع کر دیتا ہے کا بھی یہ حکم ہے۔ امام غزالی نے ارشاد فرمایا: "منبر صف کے کچھ حصے کو منقطع کر دیتا ہے۔ خصوصاً منبر کے سامنے پہلی صف، دونوں اطراف سے منقطع ہوتی ہے (یعنی درمیان میں منبر آنے سے صف ٹوٹ جاتی ہے)۔

امام سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

پہلی صف وہ ہوتی ہے اور اس پر بیٹھ کر کوئی بھی خطیب کے سامنے آ کر اس کا خطبہ سنتا ہے۔" (الاحیاء ۲/ ۱۳۹) (یعنی امام ثوری کے نزدیک مقطوع صف' صفوں میں شمار ہی نہیں ہوتی)

قلت: منبر صف اس وقت بھی کاٹتا ہے جب وہ نبی اکرم ﷺ کے منبر کے مخالف ہو اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کے منبر کے تین درجے تھے۔ ایسا منبر صف کو منقطع نہیں کرتا۔ اس لیے کہ امام سب سے نچلے درجہ کے برابر کھڑا ہو جاتا ہے۔

منبر کے معاملے میں سنت کی مخالفت کی نحوست سے حدیث میں وارد نہیں کا ارتکاب ہوتا ہے۔

اسی طرح بعض مساجد میں (قالین یا چٹائی کی) صفیں اس انداز سے بچھائی جاتی ہیں کہ صف منقطع ہو جاتی ہے اور اس ممنوع کام پر امام مسجد یا کوئی نمازی توجہ نہیں دیتا' اس کی پہلی وجہ تو لوگوں کا دین سے دوری اور دوسری وجہ شارع کے منع کردہ اور ناپسندیدہ کاموں سے بچنے میں لاپرواہی ہے۔

ہر وہ شخص جو مسجد میں صف منقطع کرنے والے منبر یا (قالین' چٹائی کی) صفیں لگانے کی تگ و دو کرتے ہیں۔ اس کے لیے مناسب ہے کہ وہ یہ بات جان لے کہ اسے رسول اللہ ﷺ کے بددعا:

((وَمَنْ قَطَعَ صَفًّا قَطَعَهُ اللّٰهُ))

''اور جس نے صف کو توڑا' اللہ اسے توڑے گا۔'' [صحیح ابوداؤد۔ ٦٧٢]

[نظم الفرائد: ١/٣٦١۔٣٦٠]

سوال اگر کوئی شخص فجر کی نماز یا اس کے علاوہ کسی بھی نماز کے نفل پڑھ رہا ہو۔ سلام نہ پھیرا ہو لیکن جماعت کھڑی ہو جائے تو وہ اپنے نوافل پورے کرے گا یا نماز میں شامل ہو جائے گا؟ [فتاوی المدینہ: ١١٤]

جواب اس مسئلہ میں اصل دلیل یہ حدیث ہے:

((إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوبَةُ))

جب اقامت ہو جائے تو پھر فرض نماز کے علاوہ اور کوئی نماز درست نہیں ہے۔ تو اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جماعت کھڑی ہونے کے ساتھ ہی اس کی نماز

باطل ہو جائے گی لیکن علماء کا اختلاف ہے۔

کہ کیا مطلق طور پر حدیث پر عمل کیا جائے گا۔ یا یہ سمجھا جائے کہ بعض صورتوں میں وہ اپنے نوافل پورے کرسکتا ہے۔ تو کرلے پھر جماعت کے ساتھ مل جائے؟ جو بات مجھے سمجھ میں آ رہی ہے اور میں نے ''المجموع'' نووی میں پڑھی ہے اس حدیث سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو ابھارنا ہے کہ نوافل پڑھے لیکن امام کے ساتھ بھی تکبیر تحریمہ میں مل جائے۔ تکبیر تحریمہ اس سے فوت نہ ہو۔ مثلاً اگر جماعت کھڑی ہو جائے اور ایک نفل پڑھنے والا تشہد میں بیٹھا ہو اور اس کا غالب گمان یہ ہے کہ اگر وہ سلام پھیر کر تکبیر پاسکتا ہے تو اس حالت میں وہ اپنی نماز جاری رکھے۔ اگرچہ کم دعاؤں پر ہی سلام پھیر دے۔ پھر امام کے ساتھ مل جائے۔ دوسری صورت اس کے تقابل یہ ہے کہ اگر ایک شخص فجر کی سنتیں پڑھنا شروع کرتا ہے۔ جیسے ہی اقامت کہنے والے نے اللہ اکبر کہا' اب اگر وہ اپنے نفل جاری رکھے اور امام کے ساتھ اس کے تکبیر تحریمہ کے فوت ہونے کا خدشہ ہو تو ایسی صورت میں وہ اپنی نماز توڑ دے گا' سلام کے ساتھ۔ پہلی دونوں صورتوں میں اور بہت ساری صورتیں داخل ہیں۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص اقامت کے وقت نفل پڑھ رہا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اجتہاد کرے کہ تکبیر تحریمہ تک نفل ختم کرکے امام کو پاسکتا ہے کہ نہیں؟ اگر تو اس کا غالب گمان یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ پا لے گا تو نماز مکمل کرے اور غالب گمان یہ ہو کہ تکبیر تحریمہ فوت ہو جائے گی تو نماز توڑ دے گا اور صف کے ساتھ مل جائے گا۔

سوال ایک آدمی مسجد میں داخل ہو اور عشاء کی جماعت کھڑی ہو جائے اور اس نے مغرب کی نماز نہ پڑھی ہو تو کیا کرے؟ [فتاویٰ المدینہ: ۳۷]

جواب یہ شخص اس امام کی اقتدا کرے گا کہ جو عشاء کی نماز پڑھا رہا ہے اور مغرب کی نیت کرے گا۔ جب امام چوتھی رکعت کے لیے کھڑا ہوگا تو اس وقت وہ اپنے اور امام کے درمیان علیحدگی کی نیت کرے گا' بیٹھ کر تشہد پڑھے گا اور اکیلا اپنی نماز پوری

کرے گا۔

سوال ایک آدمی بسا اوقات جہازوں کی نگرانی کر رہا ہوتا ہے اور کسی جہاز کے اترنے کا اور کسی کے پرواز کا حکم جاری کر رہا ہوتا ہے۔ بسا اوقات پورا نماز کا وقت گزر جاتا ہے اور اگر وہ اپنی ڈیوٹی چھوڑ دے تو کتنی ہی جانوں کے ضائع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے تو اس کا کیا حل ہے؟

جواب ایسے آدمی کو چاہئے کہ وہ نمازوں کی تیاری کر کے جائے اور دو نمازوں کے درمیان جمع کرے' ایسی صورت میں دونوں کو اپنے اپنے وقت میں پڑھے۔ مقیم کی نسبت جمع کرنا نمازوں کے درمیان یہ ایسا معاملہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وسعت رکھی گئی ہے۔ مسلمانوں کی آسانی کے لیے کہ جس طرح ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:

((انه قال جمع رسول الله فی المدینه بَیْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ وَبَیْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ بغیر خوف اومطر قالوافاذا اراد من ذلك یااباالعباس؟قال اراد ان لایحرج امته))

کہ بے شک نبی علیہ السلام نے مدینہ میں ظہر وعصر کی نمازوں کے درمیان جمع کیا اور مغرب وعشاء کے درمیان جمع کیا۔ بغیر خوف اور بارش کے لوگوں نے کہا کہ ابوالعباس اس سے آپ کا کیا ارادہ ہے؟ تو فرمایا کہ آپ کا ارادہ یہ ہے کہ اپنی امت کو مشقت میں نہ ڈالیں' اور وہ طاقت رکھتا ہے کہ اپنی نماز خفیف پڑھے تاکہ دوبارہ اپنے کام پہ پہنچ جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر انسان اپنے آپ کے بارے میں بصیرت رکھتا ہے تو اس پہ لازم ہے کہ اللہ کے حکم کی پابندی کرے اور اپنا کام بھی امانتداری کے ساتھ کرے تو اس پر لازم ہے کہ دونوں مصلحتوں کے درمیان جمع کرے۔

سوال جب جماعت کی نماز کا وقت امتحان کے وقت کے معارض آئے تو کیا کریں؟

[فتاویٰ الامارات: ٦٧]

جواب اس طرح کی صورت حال ان سکولوں میں پیش آ سکتی ہے کہ جن کا منہج یا نظام شریعت کے حکم کے مطابق نہ ہو۔ تو ظاہر ہے ان کا انجام درست نہیں ہے۔ جو شخص شریعت کو تھامنا چاہتا ہے' اسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ایسے تعلیمی اداروں کے ساتھ منسلک نہ کرے کہ جو شریعت کے مخالف ہو تو اگر وہ ایسا کرتا ہے پھر تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس نے جتنے سال اس طرح کے تعلیمی اداروں میں لگا دیئے اس عرصہ کی نمازوں کو دہرانے کی طاقت نہیں رکھتا تو ہر شخص پہ لازم ہے' علم کے حصول کی ابتداء ایسے منہج سے کرے جو علمی منہج پہ ہو کیونکہ جس چیز کی بنیاد نیکی پر ہوگی تو وہ نیک شمار ہوگی اور جس چیز کی بنیاد فساد پہ ہوگی تو وہ چیز فاسد ہوگی۔

سوال کیا نماز عصر کے بعد نوافل ادا کیے جا سکتے ہیں؟

جواب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:

((ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یدع رکعتین قبل الفجر' ورکعتین بعد العصر))

''بے شک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فجر سے پہلے دو رکعتیں اور عصر کے بعد دو رکعتیں نہیں چھوڑتے تھے۔'' [الصحیحہ۔ ۲۹۲۰]

امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے اسلاف کی ایک جماعت کا عمل صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ وہ عصر کے بعد دو رکعتیں ادا کیا کرتے تھے۔

ان میں ابو بردہ بن ابی موسیٰ، ابوالشعثاء، عمرو بن میمون، اسود بن یزید، ابووائل، محمد بن المنتشر اور مسروق رحمہم اللہ شامل ہیں۔

رہا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اس شخص کو مارنا جو یہ رکعتیں پڑھتا تھا تو یہ سد ذریعہ سے متعلق سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہادی معاملہ تھا۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (۲/۶۵) کی ذکر کردہ دو روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

''ایک مصنف عبدالرزاق (۲/۴۳۲۔۴۳۱)' مسند احمد (۴/۱۰۰)' طبرانی (۵/۲۶۰)

میں ہے۔ جسے علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ نے ''المجمع'' (۲/۲۲۳) میں حسن قرار دیا ہے۔
دوسری مسند احمد (۴/۱۰۲) 'طبرانی کبیر (۲/۵۹۔۵۸) اور طبرانی اوسط (۸۸۴۸)
میں ہے۔

اس کے بعد مجھے تیسری روایت جوان دونوں سے مضبوط ہے مل گئی کہ:
شریح فرماتے ہیں: میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی کیفیت کے بابت سوال کیا؟ تو انہوں نے فرمایا:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز ظہر ادا کر کے دو رکعتیں پڑھتے' پھر نماز عصر ادا کر کے دو رکعتیں ادا کیا کرتے تھے۔''

میں نے کہا: سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تو اس نماز کے ادا کرنے پر مارتے تھے اور منع کیا کرتے تھے؟ (یہ کیوں؟)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:
سیدنا عمر رضی اللہ عنہ (خود) ان دو رکعتوں کو ادا کرتے تھے اور وہ یہ جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انہیں ادا کیا ہے۔ لیکن قوم کے دیندار لوگ نا سمجھ ہیں۔ وہ ظہر ادا کر کے پھر ظہر اور عصر کے مابین نماز پڑھتے ہیں اور عصر کی نماز ادا کر کے پھر عصر اور مغرب کے درمیان نماز پڑھتے ہیں۔ تو عمر نے ان کو مارا اور اس نے اچھا کیا۔ یہ روایت ابوالعباس نے اپنی ''مسند سراج'' ق (۱/۱۴۶) میں ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ پہلے والے دونوں آثار کے لیے قوی شاہد ہے اور نص صریح ہے اور ان دو رکعتوں سے منع کرنا یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اپنی مرضی سے نہ تھا کہ جس طرح بہت سارے لوگوں کو یہ وہم ہوا ہے بلکہ یہ ان کے مستقل جاری رکھنے کی وجہ سے نماز کے بعد یا مکروہ وقت تک لیٹ کرنے کی وجہ سے منع کیا ہے۔ مکروہ وقت سے مراد سورج کا زرد ہونا اور منع والی احادیث سے یہ وقت مراد ہے کہ جس میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے اور اس وقت میں نماز پڑھنے سے متعلق یہ بیان پہلے دو حدیثوں کے

تحت گزر چکا ہے۔

جو بات پہلے گزری ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عصر کی نماز کے بعد دو رکعتیں پڑھنا سنت ہے کہ جب ان کے ساتھ عصر کی نماز بھی پڑھی جائے۔ سورج کے زرد ہونے سے پہلے پہلے اور بے شک عمر کا مارنا ان رکعتوں کے پڑھنے پر' یہ ان کا اجتہاد تھا کہ جس کی بعض صحابہ نے موافقت کی اور بعض نے مخالفت کی اور ان میں سے سرفہرست ام المومنین ہیں۔ دونوں فریقوں کی موافقت کرنے والے ہیں۔ تو لہٰذا سنت کی طرف رجوع کرنا واجب ہے اور یہ سنت ام المومنین کی روایت سے صحیح ثابت ہے۔ عموم کے علاوہ کوئی حدیث ان کے معارض نہیں ہے اور عموم کے لحاظ سے علی اور انس رضی اللہ عنہما کی حدیثیں ہیں کہ جن کی طرف ابھی ابھی اشارہ کیا ہے۔ یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ابن عمر کا یہ بھی موقف تھا جس طرح کہ ''بخاری (۵۸۹)'' میں روایت ہے۔

فرماتے ہیں' میں نماز پڑھتا ہوں کہ جس طرح میرے دوسرے ساتھی نماز پڑھتے ہیں' میں کسی کو نہیں روکتا' چاہے رات کو پڑھے یا دن میں پڑھے۔ جتنی چاہے علاوہ اس کے کہ طلوع شمس اور غروب شمس کا لحاظ رکھے۔

ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا بھی یہ موقف ہے۔ صحیح سند کے ساتھ ''مصنف عبدالرزاق (۲/۴۳۳) میں ابن طاؤس عن ابیہ کی سند کے ساتھ مروی ہے کہ بے شک ابوایوب حضرت عمر کی خلافت سے پہلے عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ جب حضرت عمر خلیفہ بنے تو انہوں نے چھوڑ دیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے۔ پھر ابوایوب یہ دو رکعتیں پڑھنے لگ گئے تو ان سے پوچھا گیا کہ یہ تم کیا کرتے ہو؟ فرمانے لگے کہ عمر ان دونوں رکعتوں کے پڑھنے پر لوگوں کو مارتا ہے۔ ابن طاؤس فرماتے ہیں کہ میرے والد ان دو رکعتوں کو نہیں چھوڑتے تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہم اہل سنت کو یہ بات یاد کروائیں کہ سنتوں کو زندہ کرنا چاہیے اور بدعات کی بیخ کنی کرنی چاہیے۔

تو جب بھی عصر کی نماز اس مشروع وقت میں پڑھیں تو یہ دو رکعتیں بھی پڑھیں تا کہ نبی ﷺ

کے اس فرمان کے ہم مصداق بن سکیں۔ ①

① عصر کے بعد دو رکعت یا کوئی بھی نماز پڑھنا ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ راقم کو بھی اس مسئلہ میں شیخ البانی رحمہ اللہ سے اتفاق ہے۔ اس مسئلہ کے بارے میں علامہ ابن حزم نے المحلی میں بڑی تفصیلی بحث کی ہے جس میں فریقین کے دلائل ذکر کر کے اسی موقف کو راجح قرار دیا ہے۔ (راشد)

((من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها......))

[نظم الفرائد: ١/ ٤٠٤۔ ٤٠٢]

سوال ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے:

((ان الرسول الله صلی الله علیه وسلم جمع فی المدینة بین الظهر والعصر، وبین المغرب والعشاء من غیر سفر ولا مطر))

تو اس حدیث پر کب عمل کیا جاتا ہے؟ [فتاوی المدینہ: ۲۸]

جواب اس حدیث سے یہ مراد نہیں ہے کہ جس طرح بہت سے طالب علم ایسے تھکاوٹ کی وجہ سے اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ کسی سبب کی وجہ سے نمازوں کے درمیان جمع کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہر مسلمان پر اپنے شہر میں رہتے ہوئے یہ واجب ہے کہ ہر نماز اپنے وقت میں اور جماعت کے ساتھ ادا کرے۔ لیکن اگر اس کے لیے ایسی صورت بن جائے کہ وہ کسی مجبوری میں مصروف ہو جائے مسلسل اور اس دوران نماز کے وقت کا نکل جانے کا خدشہ ہو تو ایسی صورت میں جمع تقدیم یا جمع تاخیر کر سکتا ہے اور اس طرح سے نمازیں جمع کرنے کی علت اصل میں تکلیف کو رفع کرنا ہے لیکن جب مشکل نہ ہو تو ایسی صورت میں جمع نہیں کیا جائے گا۔ تو ہم پر واجب ہے کہ ہم اس پوری حدیث پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ اس حدیث کا ایک ٹکڑا ابھی باقی رہتا ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں نے کہا ابن عباس سے:

((ماذا اراد بذالك یا اباالعباس؟ قال اراد الا یحرج امته))

اے ابوالعباس! ایسا کرنے کے ساتھ آپ کا ارادہ کیا تھا؟ تو فرمایا کہ تاکہ اپنی

امت پر مشقت نہ ہو تو یہاں اللہ کے رسول ﷺ نے اقامت کی حالت میں بغیر خوف و بارش کے نمازیں جمع کیں۔ تو کیا ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم رفع حرج کے لیے نمازیں جمع کریں؟ تو یہاں جب عذر شرعی واضح ہو یا نہ ہو' بہر حال اس فعل کے تعلق انسان کے اپنے نفس کے ساتھ ہے کہ اگر وہ مشقت محسوس کرتا ہے ہر نماز کی اپنے وقت میں ادائیگی پر تو وہ جمع کر سکتا ہے لیکن مطلق طور پر نہیں۔

سوال ایک آدمی عشاء کی آخری رکعت میں آکر امام کے ساتھ ملا تو اب کیا وہ فوت شدہ رکعات پوری کرے گا یا قضا کرے گا؟ اور جو رکعتیں فوت ہو گئی ہیں کیا ان میں جہراً تلاوت کرے گا؟ [فتاویٰ المدینہ: ۳۲]

جواب اس مسئلہ میں علماء کے دو قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ جو شخص دیر سے جماعت کے ساتھ ملا تو اس کی جتنی نماز فوت ہو چکی ہے وہ کھڑا ہو کر اسے پورا کرے گا اور جو قضائی کرے گا اسے نماز میں سے ہی شمار کیا جائے گا اور یہ احناف کا مؤقف ہے۔ دوسرا قول کہ جو اس نے امام کے ساتھ پالیا وہ رکعتیں اس کی نماز کا اول حصہ شمار ہوں گی اور جو رکعت فوت ہو گئیں ہیں تو وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد کھڑا ہو کر پورا کرے گا۔

اختلاف کا سبب یہ ہے کہ ایک حدیث دو طرح سے مروی ہے:

((مَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا))

اور دوسری روایت میں ہے:

((فاقضوا))

جو تم پالو تو وہ پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے تو تم اسے پورا کرو۔ دوسری حدیث میں ہے ''تم اس کی قضا کرو۔''

دونوں مسلکوں والوں نے ان روایات میں سے ہی استدلال کیا ہے۔ دوسرا قول امام شافعی کا ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ دونوں روایتوں میں معنیٰ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ''فاقضوا'' کا لغوی معنیٰ ''فاتموا'' ہے۔ جبکہ احناف نے ''فاقضوا''

کا معنی قضاء اصطلاح کیا لیکن عربی میں اس کا مفہوم "فاتموا" ہی بنتا ہے اور یہ معنی کئی ایک آیات سے بھی صراحتاً ثابت ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ﴾ [الجمعة:١٠]

تو یہاں یہ بھی " قُضِيَتِ الصَّلَاةُ" کا معنیٰ قضا کرو۔ جبکہ صحیح معنی یہاں بھی "اتمام" ہی ہے۔ا

اسی طرح دوسرا اللہ کا فرمان ہے:

﴿فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ﴾ [البقرہ:٢٠٠]

" قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ " کا معنی یہی ہے۔"اتممتم مناسككم" سوال کے دوسرے حصہ کا جواب یہ ہے کہ یہ تو پہلے حصہ سے سمجھ آ رہا ہے کہ جس کی تین رکعتیں نکل گئیں۔ وہ ایک رکعت پڑھ کر تشہد میں بیٹھے گا' پھر کھڑا ہو کر دو رکعتیں پڑھے گا کہ جن میں فاتحہ کے بعد کچھ بھی نہیں پڑھے گا اور نہ ہی جہراً پڑھے گا۔

سوال ((مَنْ صَلَّى الْغَدَاةَ فِي جَمَاعَةٍ ثُمَّ قَعَدَ يَذْكُرُ اللَّهَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ))

کیا اس حدیث سے مراد چاشت کی نماز ہے؟

جواب واللہ اعلم' ظاہراً تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد چاشت کی نماز ہے کیونکہ کسی حدیث سے الگ سے ذکر نہیں آیا کہ طلوع شمس کے بعد دو نمازیں ہیں۔ لیکن یہ والی حدیث اس حدیث کے ساتھ ٹکراتی ہے کہ جو عبداللہ بن ابی اوفی سے "مسلم" میں مروی ہے۔

نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((صلاة الاوابين حين ترمض الفصال))

کہ صلاۃ الاوابین کا وقت وہ ہے کہ جب اونٹنیوں کے بچوں کے پاؤں جلنے

لگیں۔ ''فصال'' فصیل کی جمع ہے اس سے مراد اونٹنی کا بچہ ہے۔ کیونکہ اونٹنی کے بچہ کے پاؤں اپنے ماں باپ کے پاؤں کی طرح سخت نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کے پاؤں نرم ہوتے ہیں تو یہ بچہ جب باہر کی طرف نکلے گا تو جس ریت کو دھوپ لگ چکی ہوگی، اس کی تپش کی وجہ سے اس کے پاؤں جلنے لگتے ہیں۔ تو اگر ہم اس حدیث پر غور کریں کہ جب آدمی فجر کی نماز پڑھ کر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے جب تک کہ سورج نکل کر کچھ بلند نہ ہو جائے کہ جب دھوپ سخت ہو چکی ہوتی ہے' اونٹنی کے بچے کے پاؤں ریت کی گرمی سے جلنے لگ جاتے ہیں۔

سوال: قبرستان میں نماز پڑھنے سے کیا مراد ہے؟ کیا قبروں کے درمیان یا قبریں قبلہ کی جانب ہوں؟[فتاویٰ الامارات: ۱۲۱]

جواب: بہرحال اس سے مراد عموم ہے۔ قبلہ کی جانب مراد ہے۔ کیونکہ قبلہ کی جانب قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت صراحتاً آئی ہے۔

((لَا تَجْلِسُوْا عَلَى الْقُبُوْرِ وَلَا تُصَلُّوْا إِلَيْهَا))

''نہ قبروں کے اوپر بیٹھو اور نہ ہی ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو۔'' اس کی تائید میں نبی علیہ السلام سے بہت ساری صحیح احادیث مروی ہیں کہ جن میں یہ بھی ذکر ہے کہ جو مسجدیں قبروں پر بنی ہوئی ہیں' ان میں نماز پڑھنا بھی منع ہے۔ تو اگر کوئی ایسی مسجد ہو کہ جس میں ایک قبر ہو تو اس میں نماز صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں قبر ہائے جانے کی وجہ سے وہ جگہ قبرستان کے حکم میں ہے۔ یہ اس کے برخلاف ہے کہ جو حنابلہ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ کم از کم تین قبریں ہوں تو پھر وہ جگہ قبرستان کے حکم میں ہوگی۔ نماز جنازہ پڑھنے کی جگہ اگر قبر سے ایک مختص ہو تو یہ جائز ہے کیونکہ نبی علیہ السلام عیدگاہ میں نماز جنازہ پڑھاتے تھے اور عیدگاہ قبرستان کے برابر میں ہی تھا۔

سوال: گاؤں میں جمعہ ادا کرنا کیسا ہے؟ بعض لوگ گاؤں میں جمعہ ادا کرنے سے منع کرتے ہیں۔ وضاحت فرمائیں؟

(جواب) گاؤں میں جمعہ کے نہ ہونے کی ایک دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

((لاجمعة ولاتشريق الافي مصر جامع))

''جمعہ اور عید نہیں مگر شہر میں''

یہ روایت مرفوعاً تو بے اصل ہے۔ موقوفاً صحیح ہے۔[الضعیفہ:۹۱۷]

اس حدیث کو ابن حزم نے بھی ''المحلی'' (۵/۵۴) میں صحیح کہا ہے اور امام طحاوی کا کلام بھی اسی کا متقاضی ہے، لیکن انہوں نے فرمایا:

''یہ بات سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے سے ارشاد نہیں فرمائی کیونکہ اس جیسی بات رائے وعقل سے نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت سے ہی کہی جا سکتی ہے۔''

لیکن اس میں کلام ہے' اس لیے کہ دل گواہی دیتا ہے کہ اس میں رائے اور اجتہاد کا دخل ہے۔ اسی لیے تو اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔

اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس کے خلاف صحیح ثابت ہے۔ تو کیا یہاں بھی یہ کہا جائے گا کہ یہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت سے ہی کہی گئی ہے۔ یہ بھی درست ہے؟

امام ابی شیبہ رحمہ اللہ نے:

((باب من كان ير الجمعة في القرىٰ وغيرها)) میں ابورافع عن ابی ہریرہ کے طریق سے نقل روایت کی ہے کہ انہوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف جمعہ کے متعلق خط لکھ کر سوال کیا تو انہوں نے فرمایا:

((جمعوا حيث كنتم))

''تم جہاں بھی ہو جمعہ ادا کرو۔''

قلت:

اس کی سند شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔ ابورافع کا نام نفیع بن رافع الصائف المدنی ہے۔

اور اس اثر عمر رضی اللہ عنہ کو امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ضعیف قرار دینے کے لیے

دلیل بنایا ہے اور یہ الفاظ زائد بیان کیے کہ:

''اور پہلا جمعہ مدینہ میں ادا کیا گیا' جمعہ سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے پڑھایا اور ان کے لیے ایک بکری ذبح کی جو ان چالیس افراد کو کفایت کر گئی اور وہاں مزید احکام جاری نہیں ہوئے تھے۔''

امام اسحاق المروزی فرماتے ہیں:

''میں نے امام احمد سے کہا: آپ کا کیا خیال ہے۔ مَرو بستی والے جمعہ ادا کریں؟

تو امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: جی ہاں'

امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا کہ انہوں نے فرمایا:

''اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ اور مدینہ کے درمیان اس وادی میں جمعہ ادا کیا کرتے تھے۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے (۳۱۶/۲ مع الفتح) اور امام ابوداود رحمہ اللہ (۱۰۶۸) وغیرہما نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انہوں نے فرمایا:

''بے شک پہلا جمعہ مدینہ میں مسجد نبوی کے بعد جو اسلام میں ادا کیا گیا' وہ بحرین کی ایک بستی ''جوثاء'' میں ادا کیا گیا۔

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

''یہ بستی قبیلہ عبدالقیس کی بستیوں میں سے تھی۔''

امام بخاری اور ابوداود رحمہ اللہ نے اس پر باب قائم کیا:

''باب الجمعة فی القریٰ''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا:

''اس دلیل سے ظاہر ہے کہ قبیلہ عبدالقیس نے یہ جمعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ادا کیا۔ جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عادت تھی کہ وہ نزول وحی کے زمانہ میں شرعی امور میں اپنی مرضی نہیں چلاتے تھے۔ اسی لیے اگر یہ کام ناجائز ہوتا تو قرآن نازل ہو جاتا۔

جیسا کہ سیدنا جابر اور ابوسعید رضی اللہ عنہم نے نزول قرآن کے دور میں عزل کے جواز پر استدلال کیا ہے کہ انہیں منع نہیں کیا گیا۔

قلت:

سیدنا عمرؓ امام مالک واحمد سے مروی یہ آثار اس یادگار اسلامی شعائر' نماز جمعہ کے ساتھ عظیم اہتمام میں سے ہیں کہ جس کے متعلق انہیں اسے ادا کرنے' اس کی محافظت کرنے کا حکم دیا گیا۔ خواہ وہ کسی بستی' گاؤں میں ہو' یا اس سے بھی چھوٹی جگہ میں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اثر مذکور کے علاوہ دیگر آثار نصوص شرعیہ کے عموم و اطلاق کے مطابق ہیں (جن میں) جمعہ کو چھوڑنے سے سختی سے منع کرنا جو کہ معروف ہے۔ میں یہاں ایک آیت قرآن ذکر کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾ [الجمعة:٩]

''اے ایمان والو! جب نماز جمعہ کے لیے جمعہ کے دن اذان دی جائے تو تجارت کو چھوڑ کر اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔''

اور جمعہ کے بعد ظہر احتیاطی ادا کرنا' آیت میں مذکور حکم کو پورا کرنے کے منافی ہے کہ:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ [الجمعة:١٠]

''اور جب نماز ادا کی جا چکے تو زمین میں پھیل کر اللہ کے فضل میں سے تلاش کرو۔''

(مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں صرف نماز جمعہ کا حکم دیا ہے' ظہر احتیاطی کا نہیں)

میں جب رمضان ۱۳۹۷ھ کو برطانیہ گیا تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی کہ مسلمان لندن میں نماز جمعہ اور عید کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔

اور بعض تو ان گھروں میں نماز جمعہ ادا کرتے ہیں' جنہیں انہوں نے خرید کر یا کرائے پر لیا ہے' اور وہ ان میں پانچوں نمازیں اور جمعہ ادا کرتے ہیں۔ یہ صورتحال دیکھ کر میں

نے سوچا یہ لوگ بلادِ کفر میں اس عظیم عبادت کی حفاظت کتنی عمدگی سے کر رہے ہیں۔
اگر یہ لوگ تعصب مذہبی کا مظاہرہ کرتے کہ ان کی اکثریت حنفی ہے تو یہ نماز جمعہ کو چھوڑ کر ظہر ادا کرتے۔اس سے میرے یقین میں اضافہ ہو گیا کہ دائرہ اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کی حفاظت صرف کتاب و سنت کو تسلیم کرنے اور سلف صالحین کی اتباع میں ہے۔ جو مذہبی جمود سے دائرہ اسلام کی وسعتوں کی طرف آنے کا تقاضا کرتی ہے۔ جس کے دلائل پرانے یا قدیم نہیں ہوتے۔ بلکہ ہر زمانے اور وقت کے عین مطابق ہیں۔[نظم الفرائد:۱/ ۴۲۵۔۴۲۳]

سوال کتنے لوگ ہوں تو نماز جمعہ ادا کی جا سکتی ہے؟

جواب اس بارے میں اقوال علماء میں شدید اختلاف ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''السیل الجرار'' (۱/ ۲۹۸) میں فرمایا:

''جمعہ کے لیے افراد کی تعداد سے متعلق کوئی دلیل ثابت نہیں۔ سوائے اس قول کے کہ جس تعداد میں دیگر نمازوں کی جماعت ہو سکتی ہے' اسی میں جمعہ بھی منعقد ہو جائے گا۔

قلت:

اور یہ موقف درست ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔[نظم الفرائد:۱/ ۴۲۵]

سوال خطیب جب خطبہ کے لیے منبر پر آتا ہے تو مقتدی' سامع اپنا رخ خطیب کی طرف کر سکتے ہیں؟

جواب سیدنا مطیع بن الحکم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((ان النبی صلی الله علیه وسلم کان اذا صعدالمنبر' اقبلنا بوجوهنا الیه))

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر پر چڑھ جاتے تو ہم اپنے چہرے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر لیتے۔''[الصحیحة:۲۰۸۰]

امام بخاری رحمہ اللہ نے ''الصحیح'' میں باب قائم کیا کہ:

((بَاب يَسْتَقْبِلُ الْإِمَامُ الْقَوْمَ وَاسْتِقْبَالِ النَّاسِ الْإِمَامَ إِذَا خَطَبَ وَاسْتَقْبَلَ ابْنُ عُمَرَ وَأَنَسٌ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ))

''امام کا لوگوں کی طرف رخ کرنا اور امام کے خطیب کے وقت لوگوں کا امام کی طرف رخ کرنے کا بیان اور سیدنا ابن عمر وانس رضی اللہ عنہم نے امام کی طرف رخ کیا۔''

''مصنف (امام بخاری) نے حدیث سے ترجمۃ الباب میں ذکر کردہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد ان کی گفتگو سننے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بیٹھنا' ان کی طرف دیکھنے کا بھی متقاضی ہے اور اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی جو خطبہ میں قیام سے متعلق پہلے گزر چکی ہے۔ اس لیے کہ اسے ہم اس پر محمول کریں گے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی بلند مقام پر بیٹھ کر گفتگو فرما رہے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔

جب یہ صورت حال خطبہ جمعہ کے علاوہ میں ہے تو خطبہ جمعہ میں تو اسے اختیار کرنا اولیٰ ہے۔ کیونکہ خطبہ کو سننے اور مکمل توجہ اس کی طرف دینے کی تاکید اس بارہ میں بیان ہوئی ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا:

''امام کی طرف رخ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ گفتگو مکمل توجہ سے سنی جا سکتی ہے اور اس کے کلام کو توجہ سے سننے سے امام کا ادب بھی ہوتا ہے۔ جب سامع اپنا چہرہ، جسم، دل امام کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اپنا ذہن حاضر کرتا ہے تو اس سے امام خطیب کی نصیحت بہتر سمجھ آتی ہے اور اس لیے تو خطبہ میں قیام مشروع ہے۔''

[نظم الفرائد: ۱/ ۴۳۳-۴۳۲]

سوال مسافر نماز میں قصر کب کرے گا؟ [فتاوی الامارات: ۲]

جواب یہاں اس بارے کوئی نص صریح نہ قرآن سے ہے اور نہ ہی حدیث میں ہے۔ کہ جس کے ذریعہ مسافت کا اندازہ جس میں مسافر قصر کرے گا یہ مروی نہیں ہے۔

بلکہ یہاں پر صرف ترجیح ہے۔ ہمارا مؤقف وہی کہ جو ان لوگوں کا ہے جو یہ کہتے

ہیں کہ سفر مطلق ہے کہ جس پر عرف میں سفر اور مسافر کے احکام جاری ہوں۔

اور یہ بات ماخوذ ہے۔

﴿فَمَنْ كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ﴾ [البقرہ:۱۸۴]

تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مطلق مرض ذکر کیا ہے تو اسی طرح مطلق سفر ذکر کیا ہے۔ تو جب بھی سفر ثابت ہو جائے، لمبا ہو یا چھوٹا ہو تو بہر حال وہ سفر ہی شمار ہوگا اور اس پر سفر کے احکام مرتب ہوں گے۔ مسافت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ [1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اپنے رسالہ ''احکام السفر'' میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ مسافر جیسے ہی اپنے شہر سے نکلے گا تو اسی وقت اس پر سفر کے احکام لاگوں ہو جائیں گے۔ تو جس شہر میں جانا چاہ رہا ہے تو وہاں پہنچنے کے بعد بھی مسافر ہی شمار ہوگا، چاہے تھوڑے دن رہے یا زیادہ دن رہے کہ جب تک وہاں اقامت کی نیت نہیں کر لیتا۔ لیکن جب دل میں اقامت کا ارادہ نہ ہو بلکہ سوچ رہا ہو کہ آج سفر کرتا ہوں یا کل کروں گا تو ایسی متردد صورت میں جتنا عرصہ رہے گا' مسافر ہی شمار ہوگا۔ کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جہاد کے ارادہ سے خراسان اور اس طرح کے علاقوں کی طرف آئے' پھر برف پڑنے کی وجہ سے واپسی کے راستے بند ہو گئے تو چھ مہینے بیٹھے رہے اور قصر نماز پڑھتے رہے۔

سوال نماز قصر اور جمع کب ہوتی ہیں؟ اور کیسے ہوتی ہیں؟ [فتاویٰ الامارات: ۷۸]

---

[1] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس میں جو موقف اپنایا ہے اور یہ بات کہی ہے کہ شریعت نے قصر نماز کی کوئی حد بندی نہیں کی تو اس میں شیخ البانی رحمہ اللہ کی یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اس بارے میں بڑی واضح اور صریح حدیث صحیح مسلم میں موجود ہے کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین میل یا تین فرسخ جانے کا ارادہ فرماتے تو قصر کیا کرتے تھے۔ [مسلم ۱/ ٦٤٦]

علامہ نووی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں میل کا ذکر شعبہ کا شک ہے۔ صحیح تین فرسخ ہی ہیں اور علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے اور یہ تین فرسخ ۹ ہاشمی میل بنتے ہیں جو آج کل کے حساب سے تقریباً پونے بائیس کلومیٹر بنتے ہیں اور یہی مسافت قصر ہے۔ (راشد)

جواب کب...... جب بھی سفر ہوگا۔ جب مسافر ہوگا تو ایسی صورت میں اس پر قصر واجب ہوگی اور نمازیں جمع کرنا اس کے لیے جائز ہوگا۔ جمع تو بسا اوقات مسافر کے علاوہ دوسرے بھی کرتے ہیں جیسے ''استحاضہ'' والی عورت ہے کہ نبی علیہ السلام نے اس کو دو نمازوں کے درمیان جمع کرنے کی رخصت دی ہے کیونکہ وہ عورت استحاضہ کی وجہ سے معذور ہے۔

جیسا کہ اس ''استحاضہ'' کے علاوہ دوسرے اسباب کی بناء پر مردوں اور عورتوں کے لیے اقامت کی حالت میں نمازیں جمع کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ اس میں حرج پایا جائے کہ جب ہر شخص یہ چاہتا ہو کہ ہر نماز کو اپنے وقت پر ادا کرے۔

اس معنی پر ابن عباس کی اس حدیث کو محمول کیا جائے گا کہ جو ''صحیح مسلم'' میں ہے۔

((جَمَعَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ في المدينة بَيْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ وَالْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ بِالْمَدِيْنَةِ بِغَيْرِ خَوْفٍ وَلَا مَطَرٍ، قالوا يا ابا العباس ماذا اراد رسول الله صلى الله عليه وسلم بذالك؟ قال: اراد ا لايحرج امته))

صرف مسافر ہی پر جمع کرنا واجب نہیں ہے بلکہ حرج کی بات ہے کہ پائی جا رہی ہے کہ نہیں۔ اگر مسافر اپنا سفر جاری رکھے تو ایسی صورت میں کہ جب سفر جاری ہو تو دونوں نمازوں کے درمیان جمع کرے گا۔ اگر کہیں پڑاؤ ڈال چکا ہے 'ٹھہر چکا ہے' ایسی صورت میں دو نمازوں کے درمیان جمع نہیں کرے گا کہ جس طرح ابن قیم کا ''زاد المعاد'' میں یہی مؤقف ہے کہ جس کی تفصیل یہ ہے لیکن اس پر دلیل نہیں ہے۔

ابن عمر کی حدیث کہ جس سے ابن قیم دلیل پکڑتے ہیں۔

((انه كان اذاجدبه السير جمع))

کہ جب ان کو سفر میں مشکل ہوتی تو دونوں نمازیں جمع کر لیتے۔ تو یہ حدیث بھی اس بات کی نفی نہیں کرتی کہ جب کہیں پڑاؤ ڈالنا ہو تو جمع کرے۔ ابن عمر تو انہی حدیث

کے مطابق ایک ایسی چیز کے بارے میں خبر دے رہے ہیں کہ جو انہوں نے نبی علیہ السلام کے دور میں ایک حالت پر اطلاع پائی۔ ابن عمر کی حدیث کا منطوق تو صریح ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب سفر میں مشقت نہ ہو تو پھر جمع نہیں کرے گا۔ یہی قول لینا چاہیے کہ جس طرح ابن قیم بھی اسی طرف گئے ہیں۔ اگر معاذ بن جبل والی حدیث نہ ہوتی کہ جو "موطا" وغیرہ میں ہے۔

((ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان نازلا فی سفرہ الی تبوك۔ فحضرت صلاۃ الظھر فخرج الرسول وامربالاذان فاذن وبالصلاۃ فاقیمت فصلی الظھر والعصر))

کہ نبی علیہ السلام غزوہ تبوک کے موقعہ پر کسی جگہ اترے تو ظہر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا تو نبی علیہ السلام نے نکل کر اذان کا حکم دیا، پھر نماز کا حکم دیا، جماعت کھڑی ہوگئی تو ظہر وعصر کی نماز پڑھی۔ تو یہ جمع تقدیم ہوگئی۔ اسی طرح جب مغرب کا وقت ہوا تو اذان کا حکم دیا اور جماعت کھڑی ہوئی تو مغرب وعشاء دونوں نمازیں پڑھ لیں۔ یہ جمع تقدیم کے مطابق تو یہ حدیث صریح ہے کہ اگر مسافر کہیں اتر چکا ہے تو وہ وہاں جمع کر سکتا ہے۔

جب ہم ابن عمر کی حدیث معاذ کی حدیث کے ساتھ ملائیں گے تو نتیجہ خود بخود نکل آئے گا۔ کہ مسافر کے لیے دونوں صورتوں میں جمع جائز ہے' چاہے سفر کر رہا ہو یا کہیں ٹھہر چکا ہو۔

سوال آدمی کبھی کبھار کسی اور شہر کی طرف سفر کرتا ہے۔ چھٹیوں کے دوران کہ چھٹیاں وہاں گزارے گا تو کیا یہ شخص اس سفر میں قصر اور جمع دونوں کر سکتا ہے؟

[فتاویٰ الامارات: ۸۹]

جواب ایسی صورت میں مسافر کی حالت کو دیکھا جائے گا کہ کیا وہ سکون میں ہے کہ جس طرح اپنے شہر میں تھا یا اپنے کاروباری کام کے لحاظ سے مصروف ہے اور وہ جلدی جلدی واپس جانا چاہتا ہے۔ اگر تو پہلی والی صورت جیسا معاملہ ہے تو پھر تو مقیم میں

ہوگا۔اگر معاملہ کی صورت دوسری والی ہے تو پر مسافر کے حکم میں ہوگا۔ انسان ویسے بھی اپنے آپ کے بارے میں خوب بصیرت رکھنے والا ہے۔ تو وہ خود اپنے آپ کو سمجھ سکتا ہے کہ وہ مقیم ہے یا کہ مسافر، وگرنہ ہر بندے کو اس کی نسبت سے انفرادی حکم دینا یہ ناممکن ہے۔

مثلاً: دو بندے ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف سفر کرتے ہیں جب کسی دوسرے شہر میں اترتے ہیں تو ان میں سے ایک مسافر کے حکم میں ہوتا ہے جبکہ دسرا اب مقیم کے حکم میں ہے، کیونکہ وہاں اس کی بیوی بچے وغیرہ ہیں۔

(سوال) جب ایک شخص کسی شہر میں چار دن ٹھہرنا چاہے تو کیا وہ پوری نماز پڑھے گا یا قصر کرے گا؟ [فتاوی المدینہ: ٢٥]

(جواب) چار دن ہیں۔ان کا مقیم یا مسافر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اقامت اور سفر یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں کہ ان کا تعلق انسان کی نیت کے ساتھ ہے۔ کوئی شخص کسی شہر میں تجارت کی غرض سے آتا ہے اور اسے اندازہ ہے کہ چار دن لگ جائیں گے تو وہ اس وجہ سے مقیم نہیں بن جائے گا کیونکہ اس کی نیت سفر کرنے کی ہے۔

(سوال) کیا مسافر نے جس گھر میں رہائش اختیار کی ہوئی ہے اسی میں نماز پڑھے گا؟ یا مسجد میں آ کر لوگوں کے ساتھ نماز پڑھے گا؟ [فتاوی المدینہ: ٤]

(جواب) مسافر سے شریعت نے جمعہ کی نماز ساقط کروادی ہے تو اس کی وجہ سے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا بھی ساقط ہے۔ لیکن جو جماعت ان سے ساقط ہے اس سے مراد مقیم لوگوں کی جماعت۔ ویسے مسافروں کی اپنی الگ جماعت ہے کہ جو ان کے ساتھ خاص ہے۔ مسافر کی نسبت سے افضل کیا ہے؟ تو افضل اس کے لیے وہی ہے کہ جو اس کے لیے زیادہ فائدہ مند اور آسان ہے۔ یہ حکم اسی طرح ہے کہ جس طرح عورت کی نماز کا حکم ہے۔ گھر میں تو اس کے لیے افضل نماز وہی ہے کہ جو گھر کی نماز ہے۔

﴿ وبيوتهن خير لهن ﴾

ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ نبی علیہ السلام کے عہد مبارک میں عورتیں مسجدوں کی طرف جایا کرتی تھیں۔ اور نبی علیہ السلام کے پیچھے نماز پڑھا کرتیں تھیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے:

((لقد كانت النساء المسلمات يصلين الفجر خلف النبى صلى الله عليه وسلم ينصرفن في الغلس وهن متلفعات بمروطهن ولا يعرفن من شدة الغلس))

مسلمان عورتیں فجر کی نماز نبی علیہ السلام کے پیچھے پڑھا کرتیں تھیں۔ پھر جب واپس پلٹتیں تھیں تو کپڑوں میں لپٹی ہوئیں ہوتیں تھیں۔ سخت اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ تو وہ سب مسجد کی طرف جاتیں تھیں۔ باوجود یہ کہ ان کی نماز گھروں میں افضل تھی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کبھی فاضل حکم کے ساتھ کوئی ایسی چیز مل جاتی ہے کہ جو اسے مفضول بنادیتی ہے اور مفضول کو فاضل بنادیتی ہے۔ اس کی بہت ساری مثالیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ مثال کہ عورت کا مسجد میں نماز پڑھنا، عورت کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں نماز پڑھے بلکہ اپنے خاص کمرے میں پڑھے تو یہ اور فضیلت والی بات ہے۔

نبی علیہ السلام کے زمانے میں عورتیں مسجد میں نماز پڑھتی تھیں کیونکہ ان کو علم کی ضرورت ہے۔ یہ ان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ جب وہ گھروں میں ہوتیں۔

ایسی صورت میں عورت مسجد میں نماز پڑھنے کے ساتھ ساتھ علمی فوائد بھی حاصل کرسکتی ہے تو اس صورت میں عورتیں بہت سارے علمی فوائد اور تربیتی فوائد حاصل کرسکتی ہیں کہ جو اپنے گھر میں حاصل نہیں کرسکتیں۔ لیکن نکلتے وقت بلاشبہ اس عورت کو یہ چیز دیکھنی چاہیے کہ وہ تمام اسلامی آداب کا لحاظ کر کے نکلے۔ تو لہٰذا مسافر جب جماعت میں نماز پڑھے اور اسے وہاں فائدہ حاصل ہو تو افضل یہ ہے کہ مسجد میں نماز پڑھے۔ وگرنہ گھر میں نماز پڑھ سکتی ہے۔

سوال ایک شخص نے ظہر کی نماز پڑھی لوگوں کے ساتھ اس نے ارادہ کیا کہ عصر بھی ساتھ جمع کرے لیکن بھول گیا۔ پھر عصر کا ٹائم ہونے سے پہلے اسے یاد آیا تو کیا وہ عصر کی نماز پڑھ لے یا عصر کا وقت داخل ہونے کا انتظار کرے گا؟ [فتاوی المدینۃ:٣]

جواب یہاں ایسی کوئی چیز نہیں ہے کہ جو اس پر انتظار کو لازم کرے کیونکہ جمع کر کے نماز پڑھنے کی رخصت ہے۔ بعض مسالک والے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نمازیں جمع کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ پہلے وہ اپنے دل میں ارادہ کرے، پہلی نماز شروع کرنے سے بھی پہلے لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ دلیل تو اس کے برخلاف موجود ہے۔ ''صحیح مسلم'' میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:

((جمع رسول الله صلى الله عليه وسلم المدينة بين الظهر والعصر))

کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ظہر وعصر اور مغرب وعشاء ان نمازوں کے درمیان جمع کیا ہے۔ بغیر خوف اور سفر کے...... اور بھی اس طرح کی وہ تمام احادیث کہ جن میں جمع کا ذکر آیا ہے۔ چاہے جمع تقدیم ہو یا جمع تاخیر لیکن کسی روایت میں ایسا نہیں ہے کہ نبی علیہ السلام نے کہا ہو کہ نیت کرلو ہم تو نمازوں کے درمیان جمع کر کے پڑھیں گے۔ اگر اس معنیٰ کی حدیثیں نہیں ہیں تو ہر وہ شرط کے جو کتاب اللہ میں نہ ہو تو وہ باطل ہے۔ خصوصاً ایسی کوئی شرط کہ جس پر شرع نے کوئی نص نہ کی ہو اور وہ رخصت اور آسانی کے مخالف ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ ظہر کے وقت میں عصر کی نماز پڑھ لے اگرچہ دونوں کے درمیان لمبا وقت ہو۔

سوال کیا حکم ہے اس مسافر شخص کی نماز کا کہ جس نے شہر میں آ کر جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی اور امام کے ساتھ صرف آخری دو رکعتیں پائیں پھر امام نے سلام پھیر دیا؟ [فتاوی المدینۃ:١١٨]

جواب اس شخص پر واجب ہے کہ اپنی نماز پوری کرے کہ جب اس نے مقیم امام کی اقتدا کی ہے۔

روزوں کا بیان

سوال کیا افریقہ والے روزہ رکھنے کے لحاظ سے ایشیاء والوں کی رؤیت کا اعتبار کریں گے؟[فتاویٰ المدینہ:۱۲۷]

جواب اس مسئلہ میں اصل دلیل نبی علیہ السلام کا یہ فرمان ہے:

((صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته))

کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو۔ یہ خطاب پوری امت کے لیے ہے۔ جو چاہے مشرق میں رہنے والے ہوں یا مغرب میں رہنے والے ہوں لیکن اس دور میں تطبیق دینا اتنا آسان نہیں ہے۔

نبی علیہ السلام نے ہر ایک کے لیے اپنے علاقہ کہا کہ جس طرح بعض علماء کا یہ قول ہے کہ ہر علاقہ والوں کا اپنا اعتبار ہوگا۔ علماء نے یہ بات اپنے اجتہاد کی بنیاد پر کی ہے کہ تاکہ نبی علیہ السلام کا فرمان ہر جگہ پر نافذ ہو جائے۔ کیونکہ آج کل تو پوری دنیا میں ایک ہی وقت میں چاند ثابت کرنا ممکن ہے۔ تو جہاں چاند دیکھا جائے تو جہاں چاند دیکھنے کی خبر پہنچ جائے ان کو روزہ رکھنا چاہیے یہ ان کے لیے بہتر ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ آپس میں الگ الگ ہو جائیں اور کسی کی عید پہلے ہو رہی ہے اور کسی کی بعد میں لیکن حقیقت میں یہ حکومت کی ذمہ داری ہے تمام اسلامی حکومتیں مل کر تمام ممالک میں بیک وقت عید کروائیں تاکہ لوگ اس تفرقہ بازی سے نجات پا جائیں۔

سوال رمضان کے دوران کوئی شخص سفر سے اپنے گھر آتا ہے اور اپنی بیوی کو پاتا ہے کہ وہ حیض سے غسل کرتی ہے تو کیا یہ صحیح ہے کہ ایسی حالت میں اپنی بیوی سے جماع کرے یہ جانتے ہوئے کہ وہ خود بھی بغیر روزے کے ہیں؟[فتاویٰ الامارات:۶۳]

جواب تو ایسی صورت میں جماع کرنا درست ہے لیکن اس عورت کو چاہئے کہ وہ باقی دن بھی مفطرات سے رکی رہے اور بعد میں کر لے۔

سوال داؤد علیہ السلام کے روزے کی موافقت کیسے ہوتی ہے کہ جبکہ حدیث میں اکیلے جمعہ اور اکیلے ہفتہ کے دن کے روزے کی کراہت مروی ہے۔[فتاویٰ الامارات:۳۸]

جواب جب ایک نص عام ہو کہ جو بعض چیزوں کے مباح اور بعض کے استحباب کا معنیٰ دے رہا ہو پھر دوسری کوئی خاص نص آئے' اباحت اور استحباب کے منافی ہو تو اس کو اُس میں سے مستثنیٰ کریں گے تو سب سے افضل روزہ داؤد علیہ السلام کا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے اور اکیلے جمعہ اور اکیلے ہفتہ کے دن کے روزے کی منع مروی ہے تو اس شکل میں "صیام داؤد علیہ السلام والی نص عام ہے اور نہی والی نص خاص ہے۔ تو لہٰذا اس میں سے خاص کو عام مستثنیٰ کریں گے۔

زکوٰۃ کا بیان

سوال کیا سال پورا ہونے سے دو یا تین ماہ قبل زکوٰۃ ادا کرنا جائز ہے؟

[فتاوى الامارات: ٦١]

جواب جائز ہے' اس سے کوئی مانع نہیں ہے کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ نبی علیہ السلام اپنے چچا عباس سے دو سال پہلے ہی زکوٰۃ لے لیا کرتے تھے۔

سوال کیا تنخواہ دار کی زکوٰۃ ماہانہ کے اعتبار سے لی جائے گی؟

[فتاوى الامارات: ٦٤]

جواب زکوٰۃ صرف اس مال پر ہے کہ جس پر ایک سال گزر جائے جیسا کہ حدیث میں ہے۔

سوال ایک شخص کے پاس اتنا مال ہے کہ جو زکوٰۃ کے نصاب کو بھی پہنچتا ہے اور اس پر ایک سال بھی گزر چکا ہے لیکن کسی سبب کی وجہ سے وہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے لیٹ ہو گیا اور بر وقت اس کا مال ختم ہو چکا ہے۔ مثلاً اپنے والد کے قرض کی ادائیگی کی وجہ سے تو کیا اس پر زکوٰۃ نکالنا واجب ہے؟ [فتاوى الامارات: ٨١]

جواب جی ہاں اس پر زکوٰۃ واجب ہے بلکہ قرض کی مانند ہے۔ زندگی کی آخری رمق تک اس سے ساقط نہیں ہو سکتی۔

سوال کیا سونے کی زکوٰۃ واجب ہے' چاہے محلق ہو یا غیر محلق؟ [فتاوى المدينه: ٨٥]

جواب درست بات یہ ہے کہ عورتوں کے زیورات پر زکوٰۃ ہے۔

سوال کیا عورت پر واجب ہے کہ اپنے زیور کی زکوٰۃ ادا کرے جبکہ وہ خود اس کے علاوہ مال کی مالک نہ ہو؟ اور کیا اس کے شوہر پر جبر کیا جائے گا کہ وہ بیوی کی طرف

سے زکوٰۃ ادا کرے؟[فتاوی المدینہ:١٤]

(جواب) عورت پر اپنے زیور کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔شوہر کے بارے میں مجھے کوئی حدیث معلوم نہیں کہ جو اس پر زکوٰۃ نکالنے کو واجب کرے۔

(سوال) کیا قیمتی کانوں پر سونے اور چاندی کے علاوہ ہوں زکوٰۃ واجب ہے؟

[فتاویٰ الامارات:٤٩]

(جواب) منقدی کے لحاظ سے اصل زکوٰۃ صرف سونے اور چاندی پر ہے۔ باقی جوان کے علاوہ کانیں ہیں تو ان پہ زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ مگر یا تو اس کے بارے میں تفصیل ہے یا اختلاف ہے کہ جو علماء کے نزدیک معروف ہے۔ زکوٰۃ کے مال میں وجوب زکوٰۃ کے بارے میں یا جو کان ہیں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے کیونکہ اس کی نص وارد نہیں ہے اور سامان تجارت میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں کہ جن کو انسان جمع کرتا ہے' زکوٰۃ کی غرض سے۔ سامان تجارت اس کی زکوٰۃ کے بارے میں شروع سے ہی علماء کے درمیان اختلاف چلا آ رہا ہے۔ ان میں سے بعض وجوب کے قائل ہیں اور بعض وجوب کے قائل نہیں ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ کیا تجارت کے سامان پہ زکوٰۃ ہے؟ تو یہاں زکوٰۃ سے مراد وہ زکوٰۃ ہے کہ جس میں نصاب اور سال کی شرط ہے۔ جو لوگوں وجوب زکوٰۃ کے قائل ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ہر سال اس مال کی قیمت لگائی جائے گی۔ جب نصاب کو وہ مال پہنچ جائے گا تو ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ دی جائے گی۔ یہ ایسی زکوٰۃ کی نوع ہے کہ جس کے بارے میں کتاب وسنت میں ایسی کوئی چیز وارد نہیں ہوئی کہ جو اس کی مزید تائید کرتی ہو لیکن یہاں ایک مطلق زکوٰۃ بھی ہے۔ کہ جو ہر اس شخص پر واجب ہے جو اپنی تجارتی سامان میں وسعت پاتا ہو کہ وہ کچھ نہ کچھ ادا کرے کوئی معین نہیں ہے اور نہ ہی سال کی شرط ہے۔ عمومی نصوص سے دلیل پکڑتے ہوئے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُم﴾ [البقرہ:٢٥٤]

سامان تجارت کی قیمت لگانا اور ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرنا اس کی

سنت صحیح میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ "ابوداود میں ایک حدیث جو سامان تجارت کے زکوٰۃ کی وجوب پر دلالت کرتی ہے، بشرطیکہ ثابت ہو۔

سوال: کیا سونے یا چاندی کے زیور کے ساتھ کوئی اور چیز ملی ہو اس صورت میں زکوٰۃ ہے یا نہیں؟[فتاوی الامارات: ۵۰]

جواب: اس طرح کی صورتحال ہو تو ایسے مسائل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ غالب چیز کا اعتبار ہوگا۔ اگر اس زیور پر غالب مقدار سونے کی ہو تو سونے کی زکوٰۃ دینی پڑے گی یا اگر اس کے علاوہ کوئی اور چیز غالب ہو تو زکوٰۃ نہیں ہے۔ لیکن سابقہ سوال والی مطلق زکوٰۃ ہے۔ کہ اگر دینا چاہے۔

حج اور عمرہ کا بیان

سوال بعض لوگ کہتے ہیں کہ حج افراد حج تمتع سے افضل ہے۔ اس لیے کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما حج افراد کیا کرتے تھے۔ اگر حج تمتع افضل ہوتا تو یہ لوگ بھی حج تمتع کرتے تو ہم ان کا رد کیسے کریں؟ [فتاوی المدینہ: ٤]

جواب حج افراد کہ جس کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ یہ مفضول ہے ممکن ہے بعض اوقات مفضول ثابت ہو اور بعض اوقات افضل ہوتا ہے۔ حج قران اور تمتع سے بھی یہ مطلق طور پر ہے کہ جس کی کوئی دلیل بھی نہیں۔ یہ لوگ حقیقت میں اپنے مذہب کی تائید میں حج کرتے ہیں۔ یہ سنت کی مدد کرتے ہیں۔ نبی علیہ السلام نے حج قران کیا ہے اور لوگوں کے لیے بیان کیا کہ ان کا جو حج قران تھا اس سے حج تمتع افضل ہے۔ اس کی دلیل

((لَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِي مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا سُقْتُ الْهَدْيَ و جعلتها عمرة))

اگر میں اپنے معاملہ میں جو بعد میں جانا پہلے جان لیتا تو ہدی ساتھ لے کر نہ آتا اور اس احرام کو عمرے والا احرام کر دیتا۔ جب یہ بات ثابت ہے کہ ابوبکر نے حج افراد کیا ہے' قانونی طریقہ کے مطابق تو پھر وہ لوگ نبی علیہ السلام کے حج کو کیوں بھول جاتے ہیں اور جس کا نبی علیہ السلام نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا اور اس فرمان کو بھی بھول گئے:

((دخلت العمرة في الحج الى يوم القيامة وشبك بين اصابعه))

قیامت تک عمرہ حج میں داخل ہو گیا ہے اور پھر آپ علیہ السلام نے اپنی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ حج افراد باطل ہے لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کو باطل کہنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے ہم حج کرنے والوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ حج تمتع کریں۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور حج کرنا چاہیں تو پھر حج قران کریں کہ جس طرح نبی علیہ السلام نے حج قران کیا ہے اور ذوالحلیفہ سے قربانی ساتھ لے کر گئے تھے۔ یا بغیر

قربانی ہی کے حج قران کرے۔ تو یہ منع ہے نبی علیہ السلام نے اس سے روکا ہے۔ اسی نصوص کے ساتھ کہ جن میں سے واضح ترین نص یہ ہے "دخلت العمرة في الحج......" کیونکہ یہ حکم عام ہے۔ وگرنہ بات نہیں ہے کہ حج تمتع صرف نبی علیہ السلام کے صحابہ کے ساتھ مخصوص ہے کہ جس طرح سراقہ بن مالک کو نبی علیہ السلام نے حلال ہونے کا حکم دیا کہ جب وہ مروہ پر تھے اور آپ ان سے فرمانے لگے:

((لو لاانی سقت الهدیٰ لاحللت معکم))

اگر میں قربانی ساتھ لے کر نہ آتا تو حلال ہو جاتا۔ سراقہ بن مالک نے پوچھا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا یہ فائدہ آپ نے ہمیں اس سال کے لیے دیا یا ہر سال کے لیے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عمرہ حج میں داخل ہو چکا ہے، قیامت کے لیے۔

سوال کیا حج تمتع کرنے والا قربانی نہ پانے کی صورت میں مدینہ میں روزے رکھ سکتا ہے؟ [فتاویٰ المدینہ:۱۷]

جواب سوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو شخص مدینہ منورہ آیا ہے۔ یہ عمرہ کر کے آیا پھر مدینہ کی طرف آیا' اس بناء پہ ہم کہتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ [البقرہ:۱۹۶]

تو جس نے بھی حج کے مہینوں میں سے کسی مہینے میں عمرہ کیا تو اس پر یہ آیت صادق آتی ہے لیکن میں اسے ہر حج تمتع کرنے والے کو نصیحت کرتا ہوں کہ جو ہدی کی طاقت نہ رکھتا ہو اسے چاہیے کہ روزے رکھنے میں جلدی نہ کرے بلکہ اگر ۱۰ ذی الحجہ بھی ہو جائے اور اس کے پاس قربانی نہ ہو تو پھر تین دن کے روزے رکھے۔ یوم النحر کے بعد کہ جس کو ایام تشریق کہا جاتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ عائشہ اور ابن عمر دونوں سے ایک روایت مری ہے کہ:

((النبی صلی اللہ علیه وسلم رخص للمتمتع بان یصوم ایام التشریق))

کہ بے شک نبی علیہ السلام نے حج تمتع کرنے والے کو اجازت دی ہے کہ وہ ایام تشریق میں روزے رکھے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ جس حج تمتع کرنے والے نے عمرہ کرلیا ہو اور اس کے پاس قربانی نہ ہو تو کہیں سے اللہ تعالیٰ اسے قربانی میسر کروادے۔ بالغرض! اگر اس نے پہلے روزے رکھ لیے پھر قربانی کی طاقت پائی تو اس پر لازم ہے کہ وہ قربانی کرے کیونکہ وہ اس کی طاقت رکھتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے روزے محفوظ رکھے۔ یوم النحر کے داخل ہونے تک تو پھر بھی اگر قربانی کی طاقت نہ پائے تو "فصیام ثلاثة ایام" تین دن کے روزے رکھنا شروع کردے۔ حج کے دوران۔ جب قربانی کا اس سے تقاضا کیا جارہا ہو۔

(سوال) کیا بچوں پر بھی ہدی ہے؟[فتاوی المدینہ:۱۸]

(جواب) جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے بچوں میں سے کسی بچے کو بھی اپنے ساتھ حج کروائے تو اس بندے پر لازم ہے کہ وہ اس بچہ پر بھی حج کے وہ تمام احکام لاگو کرے جو اپنے آپ پہ کرتا ہے اور ان احکام میں ہدی ہے۔ جب بچے کے لیے ہدی نہ پائے تو جو چیز ہدی نہ ہونے کی شکل میں سب پر لازم آتی ہے وہ اس پر بھی لازم آئے گی۔ روزوں کی صورت میں ہمیں یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ (واللہ اعلم)

(سوال) جب ہم مزدلفہ جمرہ عقبہ کی طرف لوٹتے ہیں تو ساتھ کمزور لوگوں کے ہونے کی وجہ سے اگر ہم فجر سے پہلے پہنچ جاتے ہیں، منیٰ میں تو کیا ہم کنکریاں ماریں؟

[فتاویٰ المدینہ:۳۸]

(جواب) نہیں۔ کیونکہ ابن عباس کی جس حدیث میں کمزور لوگوں کے پہلے پہنچنے کا ذکر ہے اس میں یہ صریح ہے۔

((لا ترموا حتی تطلع الشمس))

"سورج طلوع ہونے سے پہلے کنکریاں نہ مارو۔"

(سوال) کیا محرم کے علاوہ عورت کا حج باطل ہے؟[فتاویٰ المدینہ:۵۰]

جواب حج تو باطل نہیں ہوتا لیکن وہ عورت گناہ گار ہوتی ہے۔

سوال ہم یمن کی ایک جماعت ہے۔ حج کا ارادہ ہم نے کیا ہے۔ لیکن ہم طائف، دس دن پہلے پہنچ گئے۔ تو پھر ہم مدینہ آئے، میقات سے بغیر احرام کے گزرے تو جو ہم نے کیا کیا اس کی وجہ سے ہم پر کچھ ہے؟[فتاویٰ المدینہ: ۵۱]

جواب ان لوگوں نے جو میقات بغیر احرام کے کراس کیا ہے یا تو انہوں نے عمرہ کا ارادہ کیا ہوگا اور احرام باندھ کر عمرہ کا تلبیہ پکارا ہوگا اور میقات سے گزر گئے تو یہ لوگ گناہ گار ہوں گے۔

تو کیا اب ان پر دم ہے؟ اس امسئلہ میں اختلاف ہے۔ اکثر علماء تو ان پر دم واجب کرتے ہیں کیونکہ جان بوجھ کر بغیر شرعی عذر کے انہوں نے میقات کراس کیا ہے۔ لیکن میں ذاتی طور پر اس کے ساتھ اتفاق نہیں رکھتا۔ کہ ہر غلطی پر دم لازم کر دیا جائے۔ کہ جو بھی عمرہ یا حج کرنے والا غلطی کرے تو ایسی صورت میں ان کو گناہ تو ہوگا لیکن یہاں کوئی نص شرعی ہو کہ جو ان پر دم کو لازم کرے۔ لوگ اس میں وسعت اختیار کرتے ہیں کہ اس نے جان بوجھ کر مخالفت کی یا بھول کر یا جہالت کی وجہ سے لیکن "صحیح بخاری" میں ایک واقعہ آتا ہے ایک اعرابی کا اور وہ واقعہ اس کے برخلاف ہے۔ کہ آپ نے ایک دیہاتی دیکھا وہ تلبیہ پکار رہا ہے، اس نے ایک جبہ پہن رکھا ہے کہ جو خوشبو والا ہے تو آپ نے اس کو حکم دیا کہ وہ اسے اتار دے' خوشبو دھو لے اور اپنے عمرہ میں اسی طرح کرے کہ جس طرح حج میں کرتے ہیں لیکن کفارے کا حکم نہیں دیا۔

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ جب اس نے عمرہ کی نیت کے باوجود جان بوجھ کر بغیر احرام کے میقات کراس کیا تو لہٰذا اس کو گناہ ہوگا لیکن اس پر دم نہیں ہے کہ جس طرح بعض علماء اس پر دم کو لازم کرتے ہیں۔

سوال ایک شخص حج افراد کے ارادے سے ذوالحلیفہ سے احرام باندھ کر آتا ہے اور جدہ میں آنے کے بعد عرفات پہنچ جاتا ہے۔ بیت اللہ آئے بغیر اور طواف قدوم نہیں کرتا

اس کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ المدینہ: ٥٢]

جواب یہ شخص گناہ گار ہوگا کیونکہ اس نے ایک ایسی بات مخالفت کی ہے کہ جو بہت ساری احادیث سے ثابت ہے:

((دخلت العمرة في الحج الى يوم القيامة))

عمرہ حج میں داخل ہو گیا ہے قیامت تک۔"

((احلوا ايها الناس فلو لااني سقت الهدى لاحللت معكم))

"اے لوگو! حلال ہو جاؤ میں اگر قربانی ساتھ نہ لاتا تو حلال ہو جاتا۔"

سوال کیا قول ہے اس شخص کے بارے میں کہ جو اپنی بہت ہی بوڑھی والدہ کے ساتھ غروب شمس سے تھوڑا پہلے منیٰ سے نکلا۔ عید کے دن طواف افاضہ اور سعی کے لیے سخت رش کی وجہ سے مغرب کی نماز کے وقت مکہ پہنچا' طواف کیا یہاں تک کہ عشاء ہو گئی اور صفا مروہ کی دونوں نے سعی کی رات کے بارہ ہو گئے پھر منیٰ کی طرف لوٹے ڈرائیور راستہ بھول گیا۔ رات ایک بجے کے بعد پہنچے کیا ان پہ دم ہے؟[فتاویٰ المدینہ: ٦٣]

جواب میں اس پر دم نہیں پاتا کیونکہ واجب ہوگا' دلیل کی وجہ سے اور یہاں کوئی دلیل نہیں ہے۔

سوال کیسے ہم ان پر رد کر سکتے ہیں کہ جو حج افراد کی افضیلت کے قائل ہیں۔ ابو بکر عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے حج سے استدلال کرتے ہیں۔ چوبیس سال کی مدت سے؟

[فتاویٰ المدینہ: ٨٤]

جواب اس سوال میں ایک چیز ہے کہ جو واقع کے مطابق نہیں ہے۔ وہ ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کا چوبیس سال مسلسل حج افراد کرنا۔ جو اس کا دعویٰ کرے ہم اس سے پوچھتے ہیں۔ ثابت کرو کہ انہوں نے حج افراد چوبیس سال کیا ہو۔ تو یہاں ایسی کوئی چیز ثابت نہیں ہے کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ چوبیس سال انہوں نے حج افراد کیا ہے۔ صرف ایک مجمل حدیث ہے کہ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے حج افراد کیا ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ یہ دونوں

سب سے زیادہ جاننے والے ہیں تو ہم کہیں جی ہاں لیکن ان کا اجماع نہیں ہے کہ حج افراد ہی افضل ہے۔ بلکہ اس سے اچھا یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ حج افراد جائز ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ ابوبکر ان میں سے کسی کی طرف سے حج افراد کے افضل ہونے کے بارے میں کوئی مناقشہ بھی مروی نہیں ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ڈھائی سال خلافت رہی تو وہ حج افراد ہی کرتے رہے۔ کیوں حج افراد کیا؟ اس کا کوئی بھی جواب نہیں دے سکتا۔ کیونکہ حدیث بہت مختصر ہے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا مسئلہ اور ہے اس نے صرف حج افراد نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے اجتہاد سے حج تمتع کرنے سے منع کیا ہوا تھا۔ تو ہمارے اور تمہارے درمیان کیا فرق ہے؟ تو تم ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی وجہ سے۔

عمر رضی اللہ عنہ حج تمتع سے منع کرتے ہیں اور تم تمتع کی اجازت دیتے ہو اور بسا اوقات بعض تم میں سے کہتے ہیں کہ حج تمتع افضل ہے۔

عمران بن حصین کی "صحیح مسلم" میں حدیث ہے۔

((تمتع رسول الله متعة الحج ثم لم ينزل القرآن بنسخه ثم قال رجل برأيه ماشاء))

ہم نے نبی علیہ السلام کے ساتھ حج تمتع کیا، پھر اس یک نسخ کے بارے میں تو قرآن نہیں اترا بلکہ لوگوں نے اپنی رائے کے ساتھ جو چاہا کہتے رہے۔ یہ بہت باریک بینی والا رد ہے۔"

((ثم قال رجل......))

اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ ہے انہوں نے اجتہاد کیا لوگوں کو حج تمتع سے منع کیا۔ وہ جاہل بھی نہیں تھے لیکن ان کے لیے کوئی ایسی مصلحت ظاہر ہوئی ہے کہ جس کی وجہ سے لوگوں کو حج افراد کا حکم کرتے تھے اور تمتع سے منع کرتے تھے اور عثمان بن عفان، عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کے طریقہ پر چلتے رہے۔ تمتع سے منع کرتے تھے۔ ایک دفعہ

اپنی خلافت کے دوران حج کے لیے نکلے اور حج کا اعلان کیا تو علی بن ابی طالب ان کے سامنے کھڑے ہو کر کہنے لگے تجھے کیا ہوا تو ایسی چیز سے منع کرتا ہے کہ جو کام ہم نبی علیہ السلام کے ساتھ کرتے تھے؟

((لبیك اللهم بحجة وعمرة))

یہ تلبیہ انہوں نے خلفیہ کے سامنے پکارا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک چیز سمجھ آئی کہ جسے عثمان نہیں سمجھ سکے تو مناسب نہیں ہے کہ کوئی ایسا کہے۔ کیا وہ ہم سے زیادہ جاننے والے نہیں تھے؟ یا زیادہ سمجھنے والے نہیں تھے؟ تو ہم ایسا نہیں کہتے۔ لیکن جب یہ مسئلہ صحابہ کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ تو کسی کے لیے تمتع سے منع کرتے تھے لیکن نبی علیہ السلام اس کا حکم دیتے تھے۔ تو کیا یہاں کوئی مسلمان آدمی ہے کہ جو عمر سے زیادہ محب رسول ہو کہ کیا ممکن ہے کہ ہر کوئی اپنے آپ کو ہر مسئلہ میں عمر بنا سکے؟ یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ عمر ایک بات کرے لیکن درست بات اس کے برخلاف ہو۔ مثلاً حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں پانی نہ ہونے کی صورت میں مسافر کو نماز پڑھنے سے منع کرتے تھے۔ تیمم کے ساتھ، بھلے کئی ماہ تک پانی نہ ملے۔ بغیر نماز کے۔ جبکہ عمار بن یاسر اس کے برخلاف فتویٰ دیتے تھے۔ جب ان کا فتویٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف پیغام بھیجا تو عمار فرمانے لگے اے امیر المؤمنین کیا تمہیں یاد ہے جب ہم سفر میں تھے ہم پر غسل واجب ہو گیا تھا' پانی نہ ہونے کی شکل میں ہم مٹی میں لت پت ہوئے کہ جس طرح جانور مٹی میں لت پت ہوتا ہے۔ جب ہم نبی علیہ السلام کے پاس آئے اور یہ بات ذکر کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((انما كان يكفيك ان تضرب بكفيك الارض ثم تمسح بها وجهك ويديك))

تجھے یہی کافی ہے کہ تو اپنے دونوں ہاتھ زمین پہ مارے پھر ان دونوں کے ساتھ اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے یاد نہیں ہے۔ عمار

نے کہا تو پھر میں اس فتویٰ سے رک جاؤں گا؟ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں بلکہ ہم آپ کو اس چیز کا والی بناتے ہیں کہ جس کا آپ والی بنے ہیں؟

(سوال) جب ایک شخص نے حج تمتع کئی بار کیا' حج تمتع کی افضلیت کا عقیدہ رکھتا ہو تو کیا اس کے لیے جائز ہے کہ وہ حج افراد کرے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ تم حج افراد کے منسوخ ہونے کا کہتے ہو؟[فتاویٰ المدینہ:۸۷]

(جواب) ہم حج افراد کے منسوخ ہونے کا نہیں کہتے۔کیونکہ اس کی جائز صورتیں ہیں لیکن اس شخص کی نسبت سے تو میں اسے حج افراد کی نصیحت نہیں کروں گا کہ جب تک کہ وہ خود حج تمتع کی طاقت رکھتا ہو۔ لازم ہے کہ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ جب وہ حج تمتع کی طاقت رکھنے کے باوجود اگر حج افراد کرے گا تو نبی علیہ السلام کی سنت کی مخالفت کا گویا ارتکاب کر رہا ہے۔

((دخلت العمرة في الحج الى يوم القيامة))

اور آپ اپنی انگلیاں آپس میں ڈال دیں۔

(سوال) منیٰ میں رات گزارنا واجب ہے یا سنت مؤکدہ ہے؟[فتاویٰ المدینہ: ۸۹]

(جواب) ہمارے نزدیک راجح یہ ہے کہ منیٰ میں رات گزارنا واجب ہے، کیونکہ نبی علیہ السلام نے عذر والوں کے علاوہ کسی کو بھی منیٰ سے باہر رات گزارنے کی اجازت نہیں دی جس طرح کہ صرف حاجیوں کو پانی پلانے والے' چرواہے وغیرہ کو اجازت دی تھی۔

(سوال) کیا کسی مسلمان کے لیے جائز ہے کہ میقات سے پہلے عمرہ کا احرام باندھ لے؟[فتاویٰ المدینہ:۱۰۷]

(جواب) یہ جائز نہیں ہے کہ جس طرح امام مالک سے صحیح سند سے یہ فتویٰ موجود ہے کہ یہ سنت رسول پہ زیادتی کے مترادف ہے۔

(سوال) کیا جمرات کو رات کے وقت کنکریاں مارنا جائز ہے؟[فتاویٰ المدینہ:۱۰۷]

(جواب) طلوع فجر تک کنکریاں مارنا جائز ہے۔

سوال بچے نے اپنی طرف سے بلوغت سے پہلے حج کیا، پھر بلوغت کے بعد اسے اس کے والد نے حکم دیا کہ اپنے دادا کی طرف سے حج کرے تو اس نے اپنے دادا کی طرف سے حج تمتع کے ارادے سے احرام باندھا، پھر آٹھ تاریخ کو جب اس نے سوال کیا تو اسے کہا گیا کہ تیرا پہلا حج نفل شمار ہوا اور بلوغت کے بعد تجھ پر دوسرا حج واجب ہے اور یہ حج تیرے اپنے نفس کی طرف سے ہے۔ کیا یہ قول صحیح ہے؟ کیا یہ متمتع ہوگا یا مفرد ہوگا کیونکہ اس نے اپنے دادا کی طرف سے عمرہ کیا ہے؟[فتاویٰ المدینہ : ۱۰۹]

جواب کیا اسے صحیح کہا جائے۔ شبرمہ کی حدیث سے یہی مقصود ہے۔ جب آپ نے یہ کہا:

((هل حججت عن نفسك؟ قال لاقال "حج عن نفسك ثم حج عن شبرمة))

کیا تم نے اپنی طرف سے حج کیا ہے؟ تو اس نے کہا نہیں تو آپ نے فرمایا پہلے اپنی طرف سے حج کرو، پھر شبرمہ کی طرف سے حج کرو۔ اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ عمرہ پہلے پورا کرلیا ہے یا پورا نہیں کیا کیونکہ جز کا حکم کل کا ہی ہے اور عمرہ پھر جائے گا اس کے عمرہ کی طرف یعنی بچے سے۔

نوٹ: بہت سارے لوگ اس حدیث سے دلیل پکڑتے ہیں کہ کوئی بھی شخص اپنے دادا کی طرف سے حج کر سکتا ہے لیکن اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ جس نے شبرمہ کی طرف سے حج کرنے کی نیت کی ہوئی تھی اس نے کہا کہ "میرا بھائی ہے یا میرا قریبی عزیز ہے" یہ بات اس کی اپنی نہیں ہے اور یہ ناممکن ہے۔ اگر میں آپ سے سوال کروں یہ کون ہیں؟ آپ کہیں میرا بھائی یا میرا کوئی قریبی رشتے دار۔ تو یقیناً آپ نے مجھے گمراہ کردیا۔ تو کوئی نبی کو ایسے کہے یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تو لازمی ہے کہ اس شخص نے صاف صاف کہا ہوگا کہ وہ میرا باپ ہے یا بھائی ہے یا بھتیجا ہے۔ یعنی اس طرح کا جواب دیا ہوگا کہ سائل دوبارہ سوال لوٹانے کی ضرورت محسوس نہ کرے۔ تو اس حدیث سے دلیل

پکڑتا کہ قریبی عزیز کی طرف سے حج ہو سکتا ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ چلو اگر ہم مان لیتے ہیں کہ اس نے کہا کہ شبرمہ میرا بھائی ہے اور وہ اس کی طرف سے حج کر رہا ہے کہ جس طرح آج کل بہت سارے مسلمان اپنے فوت شدہ رشتہ داروں کی طرف سے حج کرتے ہیں جبکہ وہ فوت شدہ متعدد بار یورپ وامریکہ کی طرف سفر کرتے ہیں لیکن بیت اللہ کی طرف ایک بار بھی سفر کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں؟ تو ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ شبرمہ اتنا بیمار تھا کہ حج کرنے کی اس میں طاقت نہ تھی تو اس نے اپنے قریبی عزیز کو حج کی وصیت کی۔

سوال جو شخص حج میں قربانی کرے کیا اس پر واجب ہے کہ اپنی قربانی میں سے کھائے؟[فتاویٰ المدینہ:۱۱۵]

جواب واجب ہے اس پر کہ اس میں سے کھائے' اگر ذبح کرے اور صرف صدقہ کرے تو یہ نبی علیہ السلام کے حکم بلکہ قرآن کے حکم کے برخلاف ہے۔

سوال میں اپنے والد کے ساتھ حج کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور ہمارے پاس اتنا مال نہیں ہے کہ قربانی کریں۔ حج میں روزہ رکھنے میں بھی مشقت ہے تو میں نے حج افراد کر لیا اور میرے والدین نے حج تمتع کیا تو کیا یہ اس طرح حج افراد جائز ہے؟

[فتاویٰ المدینہ:۱۱۷]

جواب نہیں۔ کیونکہ آپ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ﴾ [البقرہ:۱۹۶]

''جو شخص عمرہ کے ساتھ ساتھ حج کا فائدہ اٹھائے تو جو بھی اسے ہدی میسر ہو جو شخص قربانی نہ پائے تو وہ تین دن کے روزے رکھے' حج میں اور سات جب تم لوٹ آؤ اپنے گھروں میں۔''

معاملات کا بیان

سوال حکومتی اداروں سے حصص خریدنے کا کیا حکم ہے؟ ان کے کام میں سود نہیں ہوتا لیکن یہ معاملہ بینکوں کے ذریعہ ہوتا ہے اور بینک سودی ہیں؟[فتاویٰ الامارات: ۱۷]

جواب جب تک اس معاملہ کا نتیجہ یہ سامنے آئے کہ سودی بینکوں سے لین دین ہو تو پھر اس طرح کے حصص نہیں خریدنے چاہیے کیونکہ نبی علیہ السلام کا فرمان ہے:

((انما الاعمال بالخواتیم))

''کہ اعمال کا دارومدار خاتمہ پہ ہے۔''

سوال کیا یہ جائز ہے کہ ایک شخص کسی ایکسچینجر کے پاس جائے کہ جو سود کا معاملہ نہیں کرتا۔ اسے سو ریال دے کہ وہ اسے صرف چیک دے دے قاہرہ کے لیے مصری کرنسی کا؟ تو کیا اس میں یہ شرط ہے کہ ہاتھ و ہاتھ ہو جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہے کہ قاہرہ میں یہ پیسے جس ذریعہ سے حاصل ہوں گے اس کی بنیاد بھی سود پر ہے؟

جواب ان کاغذی نوٹوں کی کوئی قیمت نہیں ہے بلکہ ان کے بدلے میں جو سونا جمع ہے، اس کی قیمت ہے ہر ملک اپنا اپنا سونا جو جمع کرواتی ہے عالمی بینک میں۔ تو اس لیے ضروری ہے کہ جب بھی ہم یہ کاغذی نوٹوں کا تبادلہ کریں تو ذہن میں یہ رکھیں یہ سود نہیں ہے بلکہ درحقیقت ہم سونے کے بدلہ میں سونا خریدتے ہیں۔ اس بنا پر کہ جو سوال میں مذکور ہے ضروری ہے کہ ہاتھ و ہاتھ ہو اور برابر ہو۔

میں یہ سمجھتا ہوں اس طرح سے یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔ مگر سخت مجبوری کی صورت میں۔ اس وقت بھی انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ سمجھے کہ ان کاغذوں کی کوئی ذاتی

قیمت نہیں ہے بلکہ ان کی قیمت اعتباری ہے۔ پھر جس طرح کہ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ممالک کی کرنسی اونچی ہوتی ہے اور بعض ممالک کی کرنسی گری ہوئی ہوتی ہے تو اس طرح کی کرنسی کا تبادلہ کرتے وقت یہ معاملہ جوئے کہ مشابہ ہو جاتا ہے۔ تو میں اس سوال کا جواب یہ سمجھتا ہوں کہ اسے تبدیل کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ لائق ہے کہ دیتے لیتے وقت ہاتھ وہاتھ لے اور دے کیونکہ اس کا اصل سونا ہے۔

سوال کسٹم ہاؤس بنے ہوئے ہیں، بہت ساری درآمدات سامان پہ وہ ٹیکس لیتے ہیں۔ اپنے قانون کے مطابق کوئی شخص چوری چھپے کوئی چیز لائے تو کیا اسے خریدنا اور فروخت کرنا جائز ہے؟ [فتاوىٰ الامارات: ٦٤]

جواب ہمارے نزدیک یہ کسٹم ہاؤس ٹیکس وغیرہ لینا جائز نہیں یہ غیر شرعی ہے۔

سوال ٹیکسوں کے بارے میں اسلام کا کیا حکم ہے؟ [فتاوىٰ الامارات: ٦٨]

جواب ٹیکس کہ جسے چنگی کا نام دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے تمام علماء کے درمیان یہ متفق مسئلہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔ صرف ایک صورت میں جائز ہے کہ جس کے بارے میں امام شاطبی اپنی ''الاعتصام'' میں تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام کا فرمان:

((وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلَّ ضَلَالَةٌ فِي النَّارِ))

یہ مطلق عام ہے اور اسلام میں کوئی بدعت حسنہ نہیں ہے تو اس کی کتاب وسنت میں کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ کچھ احادیث کے عموم کے مخالف بھی ہے کہ جن میں مطلق طور پر بدعت کی مذمت کی گئی ہے جس طرح بخاری ومسلم میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے:

((مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ فِيهِ فَهُوَ رَدٌّ))

جس نے ہمارے اس دین کے معاملہ میں کوئی نئی چیز داخل کی جو اس میں سے نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔ امام شاطبی اپنی اس کتاب کچھ اور بھی چیزیں لایا ہے کہ جن کو ''مصالح مرسلہ'' کہا جاتا ہے کہ جو متاخرین پر مختلط ہو گئے انہوں نے اسے بدعت

حسنہ کہنا شروع کر دیا۔

جبکہ دونوں کے درمیان بالکل علیحدگی ہے۔ مصلحت مرسلہ وہ ہے کہ جو زمانے یا جگہ کے اعتبار سے کسی شرعی مصلحت کی وجہ سے ثابت ہوتی ہے۔اس کا بدعت حسنہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بدعت حسنہ وہ ہوتی ہے کہ جس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی بندگی وقرب حاصل کرنا ہو، تو اس طرح کے اضافہ کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ جس نے بھی اسلام میں کوئی نیا کام شروع کیا۔بدعت حسنہ کے عقیدے سے تو تحقیق اس نے یہ سمجھا کہ محمد علیہ السلام نے رسالت میں خیانت کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھا کرو۔

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ......﴾ [المائدہ:۳]

امام شاطبی شرعاً ٹیکس لگانے کے قائل ہیں اور اس کی تاکید بھی کرتے ہیں لیکن وہ ٹیکس ہمارے ممالک میں آج کل نافذ کردہ ٹیکسوں کے خلاف ہیں کہ جس طرح آج کل بہت سارے اسلامی ممالک میں جو ٹیکس لینے کے قوانین موجود ہیں۔

تو یہ جائز نہیں کہ آپ ٹیکسوں کو آسمان سے اترا ہوا اللہ کا حکم سمجھ کر نافذ کر دیں، لیکن بعض اوقات اگر حالات ایسے ہوں تو ٹیکس لگایا جا سکتا ہے۔

مثلاً: کسی ایک اسلامی ملک پہ کوئی حملہ کر دیتا ہے اور قومی خزانہ میں اتنی رقم نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ فوج تیار کر کے ان حملہ آوروں کا مقابلہ کیا جا سکے تو ایسی صورت میں وہ ملک معین والے اشخاص سے ٹیکس لے کر اس شر کا دفاع کر سکتی ہے۔تو جب یہ شر ختم ہو جائے تو ان لوگوں سے ٹیکس لینا ختم کر دیا جائے۔

سوال کیا ٹیکس سے بچنے کے لیے حیلہ بازی جائز ہے؟[فتاویٰ الامارات:۸۱]

جواب حیلے شریعت سے ثابت نہیں ہیں۔ باقی ٹیکس بغیر ضرورت کے جو گزشتہ سوال میں گزر چکا ہے کے علاوہ لگانا غیر شرعی ہے۔لیکن مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ

وہ ایسے طریقہ سے چلے کہ جو حکومتی نظام کے مخالف ہو۔ اگر وہ ایسی کوئی راہ اپنائے گا تو مسلمانوں کے لیے داغ ثابت ہوگا اور آخرکار یہ داغ مسلمانوں کے مذہب اسلام کی طرف پلٹے گا۔

سوال کیا کسی شیعہ یا صوفی کو گھر کرایہ پر دینا؟ یہ کسی بدعتی کو پناہ دینے کے مترادف نہیں ہے کہ جس کی مذمت میں حدیث میں لعنت آئی ہے؟[فتاویٰ المدینہ:۷]

جواب میں اس چیز میں یہ نہیں سمجھتا لیکن اس میں کچھ تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ شیعہ یا صوفی اس کرایہ والے گھر کا ناجائز استعمال کرے، یعنی مذہب کی پرچار کرے یا اپنے مذہب کی مدد کرنے میں اسے استعمال کرے تو ایسی صورت میں کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے لیکن اگر وہ شیعہ یا صوفی شخص ایسا نہ کرتا ہو تو پھر کرایہ پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سوال کیا مسلمان کے لیے جائز ہے؟ کہ جو غیر مسلم ملک میں رہائش پذیر ہو اور اپنے پیسے اس ملک کے بینک میں رکھنا چاہتا ہو اور غیر شرعی فائدہ اٹھاتا ہو اور اس ملک میں اسلامی بینک وغیرہ بھی نہ ہوں؟[فتاویٰ المدینہ:۵۳]

جواب چاہے اسلامی بینک اور ادارے ہوں یا نہ ہوں لیکن جو شخص اللہ پر اور اخرت پر ایمان رکھتا ہے، اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنا مال کسی ایسے بینک میں رکھوائے، چاہے وہ اسلامی ملک کا بینک ہو یا غیر مسلم کا بینک ہو، چاہے وہ غیر شرعی منافع اٹھائے یا فائدہ اٹھاتا ہو، فائدہ کے بجائے سود کہنا چاہیے ۔سود کا نام فائدہ رکھنا جائز نہیں ہے۔ بہت سارے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اپنا مال بینک میں رکھوائے اور سود نہ لیں تو ان پر کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن ایسے لوگ یا تو جاہل ہیں یا جان بوجھ کر جہالت اپناتے ہیں کیونکہ نبی علیہ السلام کا فرمان ہے:

((لعن اللہ آکل الربا وموکلہ))

”اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے سود کھانے والے اور کھلانے والے پر۔“

اب لوگ خود تو سود نہیں کھاتے لیکن کھلاتے ہیں۔

تو مطلق طور پر بینکوں میں مال رکھوانا جائز ہی نہیں ہے، کیونکہ مال رکھوانے والے خود تو چلو راس المال کے مالک ہیں لیکن دوسرے جو لوگ بینک والوں سے رابطہ کرتے ہیں تو بینک ان کو ان لوگوں کا رأس المال سود پر دیتا ہے۔ تو سبب تو یہ لوگ بنتے ہیں۔

ان لوگوں کا بہانہ یہ ہے کہ اگر بینکوں میں نہ رکھوائے تو کبھی وہ مال چوری ہو جاتا ہے بلکہ کبھی تو وہ لوگ قتل کر دیے جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ گویا وہ جب چلتے ہیں تو اپنے ساتھ پلے کارڈ لے کر چلتے ہیں کہ فلاں لاکھوں والا شخص جارہا ہے، بلکہ ان کو یہ کافی ہے کہ کسی محفوظ جگہ میں مال رکھیں اور پھر اللہ پر توکل کریں۔ تو جب آپ ایسا کریں گے تو کیا آپ یہ سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ آپ پہ چور اور ڈاکو کو مسلط کر دے گا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾

[الطلاق: ۲،۳]

کیا خیال ہے آپ کا اگر کوئی شخص اپنا مال بینک میں نہیں رکھواتا تو کیا وہ متقی نہیں ہے اور جو متقی ہے اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور بنا دے گا۔ تو لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ ہم غفلت سے بیدار ہوں کہ جس کی وجہ سے ہمارے دلوں پر زنگ لگ چکا ہے۔

سوال زندگی (Save Life)، گاڑی اور زمینوں کی انشورنس کا کیا حکم ہے؟ کیا کوئی اسلامی انشورنس ہے؟ [فتاویٰ الامارات: ۱۱۰]

جواب معروف جو حفاظتی اقدام ہے کہ سامان گاڑیاں اور جائیدادیں یا زندگی محفوظ کرنے کے لیے کرے اور یہ عقیدہ رکھے پختہ کہ یہ جائز ہے تو یقیناً یہ کام جوا کی ایک قسم بنتا ہے کہ جس جوا سے قرآن مجید روکتا ہے اور سنت نبوی میں منع ہے کہ جس طرح یہ بعض اسلامی ممالک میں چل رہا ہے لیکن یہ جوئے کی قسم کی ہے۔

لیکن اسلامی انشورنس کا کوئی تصور نہیں ہے کہ جس طرح کا انشورنس آج کل معروف ہے لیکن یہ ہے کہ محفوظ رکھنے والے اور رکھوانے والے کے لیے فائدہ ہوسکتا ہے۔

مثلاً: کوئی شخص اپنے گھر اور اپنے زمین کی حفاظت کے لیے کوئی چوکیدار رکھے اور جتنے پر وہ راضی ہو اسے اتنی اجرت دے تو یہ معاملہ جائز ہے لیکن جو آج کل سیف لائف ہے۔ یہ صرف جُوا ہے لیکن آج کل جو انشورنس کرواتے ہیں یہ اسلام میں جائز نہیں ہے کیونکہ یہ جوئے کی قسم ہے۔

سوال: اس مسلمان شخص کا کیا حکم ہے؟ کہ جو کسی کا کفیل بن جاتا ہے یا شریک بنتا ہے۔ تجارتی معاملات میں کہ جو حکومت کی طرف سے جاری ہوتے ہیں۔ وہ شخص چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم ہو دوسرے ملک کا ہو' جس کا کفیل بنتا ہے اس کے ساتھ حلال وحرام کی شرط نہیں لگاتا' تجارتی معاملات میں وہ کہتا ہے کہ میں صرف کفیل ہوں اور تجارتی معاملات میں میری کوئی مداخلت نہیں ہے؟[فتاوی الامارات: ٧٩]

جواب: واللہ اعلم! مجھے جو سمجھ آتی ہے کہ اگر یہ صرف صورتاً کفالت ہو اور اپنے مکفول کے ساتھ عملی صورت میں کوئی مساعدت نہیں کرتا تو یہ چیز قرآن مجید میں منع ہے بلکہ باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانے کے مترادف ہے۔

سوال: اگر رشوت کے بغیر جائز کام نہ ہو رہا ہو تو کیا رشوت دینا جائز ہے؟

[فتاویٰ الامارات: ٧٦]

جواب: رشوت دینا جائز نہیں ہے۔ صرف ایک صورت میں جائز ہے کہ اگر اس کا حق بھی ہو اور اسے نہ مل رہا ہو تو پھر رشوت دے کر کام کروا لے۔

مثلاً: قاضی اگر زید کے حق میں فیصلہ کرے، عمرو کے خلاف پھر ٹال مٹول سے کام لے' زید سمجھ جائے کہ قاضی ٹال مٹول اس لیے کر رہا ہے تاکہ اسے کچھ رشوت دی جائے پھر وہ حق دلوائے گا تو ایسی صورت میں رشوت دینا جائز ہے۔ اگر قاضی کے لیے رشوت لینا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ قاضی پر شرعی طور پر لازم ہے کہ وہ حق والے کو حق دلوائے۔

شرعی معنیٰ کے لحاظ سے رشوت سے مراد ہے کہ کسی کو مال دے کر کسی کا حق باطل کروادینا یا کسی باطل کو اپنا حق ثابت کرنا لیکن اگر مال دے کر اپنے ہی حق کو ثابت کیا جائے تو یا باطل کو ہی باطل کیا جائے تو یہ رشوت نہیں ہے۔ اگرچہ رشوت لینے والے کے لیے لینا جائز نہیں ہے۔

(سوال) کیا کسی شخص کے لیے جائز ہے کہ اپنے والد کے مال میں سے کچھ مال لے کر تجارت کرے جبکہ اسے معلوم ہے کہ اس کا والد اپنا مال سودی بینک میں رکھواتا ہے؟

[فتاوی الامارات: ۹۱]

(جواب) ہر بالغ شخص پر واجب ہے کہ وہ ایسی کمائی کرے کہ جو سود سے بالکل صاف اور پاک ہو۔ ورنہ اس میں سے اس وقت تک کھا سکتا ہے کہ جب تک وہ محتاج ہو۔ ضرورت کی وجہ سے کھا سکتا ہے لیکن اس حرام مال کے ذریعے سے وہ مزید مال بڑھائے یہ جائز نہیں ہے۔

(سوال) کیا سونے کے پانی سے رنگے ہوئے برتنوں کو استعمال کرنا یا بیچنا جائز ہے؟

[فتاوی الامارات: ۹٦]

(جواب) سونے کی اگر لگی ہوئی چیز معمولی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر زیادہ ہو کہ جس پر سونے کا نام بولا جا سکتا ہو تو پھر ایسی صورت میں مرد و عورت کے لحاظ سے حکم میں فرق کرنے پڑے گا۔

سونا مردوں کے لیے حرام ہے اور عورتوں کے لیے حلال ہے لیکن سونے کے برتنوں میں کھانا پینا مردوں عورتوں سب کے لیے حرام ہے۔ نبی علیہ السلام کی حدیث ہے:

((ان الذی یاکل ویشرب فی آنیة الذھب والفضة فکا نما یجرجر فی بطنه نار جھنم۔))

''جو شخص سونے اور چاندی کے برتن میں کھاتا یا پیتا ہے گویا وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہا ہے۔''

جیسا کہ عورتیں محلق شدہ سونے کے حکم میں مستثنیٰ ہیں۔ بہت ساری احادیث سے یہ ثابت ہے۔

مردوں کی نسبت کچھ استثنیٰ ہے کہ جس کی مردوں کو ضرورت ہو۔ ضرورت کے مطابق جیسے مثلاً سونے کا دانت لگوانا مردوں کے لیے جائز ہے۔

لیکن اگر وہاں کوئی اور چیز لگانا ممکن ہو کہ جو سونے کا قائم مقام بن سکے تو پھر سونے کا دانت بنوانا لازمی نہیں ہے اور مردوں کے لیے اس استثناء کو ثابت کرنے کی دلیل عرفجہ بن سعد کی حدیث ہے" کہ جب ان کی ناک دور جاہلیت میں کلاب نامی واقعہ میں ٹوٹ گئی تھی جب وہ مسلمان ہوا اور اس کا چاندی کا ناک تھا تو نبی علیہ السلام کے پاس آیا اور چاندی کے ناک سے بُو آنے کی شکایت کی:

((فامره ان يتخذانفامن ذهب))

تو آپ نے اس کو حکم دیا کہ وہ سونے کی ناک لگوالے۔

جب نبی علیہ السلام نے اس صحابی کو سونے کی ناک لگوانے کی اجازت دی ہے تو بالاولیٰ یہ جائز ہے کہ سونے کے دانت لگوا سکتا ہے کہ جب کوئی اور چیز کافی نہ ہو سکتی ہو۔

سوال ۶۰% سے بڑھ کر اونچی خوشبو بیچنا حرام ہے؟ اس قول سے یہ لازم نہیں آتا کہ مٹی کا تیل بیچنا اور خریدنا کیونکہ یہ بھی تو نشہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے وہ دوائیاں خریدنا اور بیچنا کہ جو جراثیم مارنے کی ہوتی ہیں کہ جن میں کحل ہوتا ہے بعض تو صرف کحل ہی ہوتی ہیں؟ [فتاویٰ المدینہ: ۱۰۳]

جواب مٹی کا تیل نشہ آور ہے' میں اس بات کو درست نہیں سمجھتا۔ پٹرول نشہ آور نہیں ہے لیکن کبھی کبھی بے ہوش کر دیتا ہے۔ بے ہوش کرنا اور چیز ہے اور نشہ آور کرنا اور چیز ہے۔ جب جراثیم مار دوائیوں سے مقصود کحل والی دوائیاں ہوں تو پھر ان کو خریدنا اور بیچنا جائز نہیں ہے، کیونکہ نبی علیہ السلام نے شراب خریدنے اور بیچنے سے منع کیا ہے اور کحل شراب کی ماں ہے اور شراب تمام خبیث چیزوں کی جڑ ہے تو کحل خبائث کے جڑ کی

جڑ ہوئی۔

اس لیے کحل والی چیزیں خریدنا' فروخت کرنا جائز نہیں ہے، کوئی شخص کتنا بھی ان کی صفائی کا دعویٰ کرلے اور جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس میں فوائد ہیں تو اسے چاہیے کہ وہ اس کا متبادل تلاش کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی حرام چیز پیدا کی ہے اس کے مدمقابل حلال چیز بھی پیدا کی ہے۔

سوال: کحل والی خوشبو کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ المدینہ:۱۰۸]

جواب: کحل والی خوشبو کہ جو تیل والی نہ ہو' نجس نہیں ہے لیکن کبھی کبھار حرام ہوتی ہے۔ حرام اس وقت ہوتی ہیں کہ جب کحل اتنے زیادہ مقدار میں ہو کہ کحل کی وجہ سے وہ خوشبو پانی کی طرح بہنے والی بن جائے تو ایسی صورت میں نشہ آور بھی بن جاتی ہے۔ تو اس وقت ان نشہ آور چیزوں میں شامل ہوجاتی ہے کہ جنھیں نشہ کی وجہ سے خریدنا اور بیچنا منع ہوتا ہے۔

اس وقت ان کا لین دین جائز نہیں ہے اور خوشبو لگانا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ اس وقت کسی بھی صورت میں ان کا استعمال اس اللہ کے فرمان کے عموم میں داخل ہوتا ہے۔

﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾

کہ گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو۔ نبی علیہ السلام کا فرمان ہے:

((لعن الله في الخمر عشرة شاربها وساقيها ومستقيها وصاملها والمحمولة اليه وباعيها ومشتريها۔))

اللہ تعالیٰ کی دس اشخاص پہ شراب کی وجہ سے لعنت ہے۔ پینے والے' پلانے والے' نچوڑنے والے' اٹھانے والے' جس کی طرف اٹھایا جارہا ہے اور بیچنے والے اور خریدنے والے سب پر۔ اس لیے ہم کحل والی خوشبوؤں کی تجارت سے آپ کو دور رہنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ خصوصاً کہ جب ان پر لکھا ہو کہ اس میں ساٹھ فیصد اور اس میں ستر فیصد کحل ہے تو اس چیز کا معنی یہ ہے کہ اس کا نشہ آور ہونا ممکن ہے۔ شریعت

کے ابواب میں سے ایک باب "سدالذریعۃ" بھی کہ جس کا معنیٰ ہے جو چیز خود حرام ہے اس کے اسباب بھی حرام ہیں۔ شارع حکیم نے اس کے دروازے بھی بند کر دیئے ہیں۔ نبی علیہ السلام کا فرمان ہے:

((ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام))

کہ جس کا زیادہ نشہ دینا ہو تو اس کا تھوڑا بھی حرام ہے۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ کحل والی خوشبو نہیں بیچنا چاہئے۔ خصوصاً کہ جب ان میں کحل کی ملاوٹ زیادہ ہو۔

لباس اور سنن الفطرہ کا بیان

سوال کیا داڑھی کی لمبائی اور چوڑائی کے بارے میں نبی علیہ السلام سے کچھ ثابت ہے؟

[فتاویٰ الامارات: ۹۲]

جواب نبی علیہ السلام سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک بڑی تھی۔

اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ علیہ السلام نے مطلق طور پر داڑھی چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔

((قصوا الشارب واعفوا اللحی وخالفوا الیھود والنصاریٰ))

کہ مونچھیں کاٹو اور داڑھیوں کو معاف کر دو۔ یہود و نصاریٰ کی مخالفت کرو۔"

میں جمہور نہیں کہتا لیکن اکثر علماء مٹھی سے زیادہ داڑھی کے کاٹنے کے قائل ہیں جبکہ دوسرے اہلحدیث حضرات نبی علیہ السلام کے فرمان "واعفوا اللحیٰ" کے عموم سے استدلال کرتے ہیں اور میری بھی رائے یہ ہے کہ مٹھی سے نیچے کے بالوں کو کاٹنا جائز ہے اور میری دلیل ابن عمر کہ جو گزشتہ احادیث کے رواۃ میں سے ایک راوی ہے کہ جن میں داڑھی چھوڑنے کا مسئلہ مذکور ہے اس کے باوجود ان سے کئی ایک روایات میں ثابت ہے کہ وہ حج یا حج کے علاوہ دو مواقع میں مٹھی سے زائد داڑھی کے بالوں کو کاٹا کرتے تھے۔

"تفسیر بن جریر الطبری" میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ابن عباس اور دیگر سلف سے بھی یہ ثابت ہے کہ وہ ایک مٹھی سے زائد داڑھی کو کاٹا کرتے تھے۔

تو یہاں ضروری ہے کہ ہم اس فقہی قاعدے کو بھی دیکھیں کہ جس میں یہ بات ہے کہ "راوی اپنی روایت کے بارے میں زیادہ جانتا ہے" اور یہ قاعدہ ابن عمر پر فٹ

آتا ہے۔ ①

سوال: داڑھی کے نیچے گردن کے بال کاٹنا بھی کیا حرام ہے؟

[فتاویٰ المدینہ: ۱۲۹]

جواب: میرے خیال کے مطابق ان بالوں کو کاٹنا حرام نہیں ہے، کیونکہ وہ داڑھی میں سے نہیں ہیں۔

سوال: بعض لوگ مونچھیں مونڈ دیتے ہیں کیا یہ اللہ کے مخلوق میں تبدیلی ہے؟

[فتاویٰ المدینہ: ۱۸]

جواب: یہ اللہ تعالیٰ کی خلقت میں تبدیلی کے مترادف نہیں ہے۔ اگرچہ میری رائے کے مطابق یہ منکر کام ہے جو لوگ مونچھیں منڈواتے ہیں وہ دراصل ''احفوا الشوارب'' کی تاویل کرتے ہیں۔ دوسری حدیث ''انھکوا الشوارب'' تو وہ نص نبوی کی مطابقت کرتے ہیں۔ اپنی سمجھ کے مطابق احفاء انہاک اور جز ان سب کا ایک ہی معنیٰ ہے۔ ان سے مراد یہ ہے کہ مونچھوں کا وہ حصہ جو ہونٹوں سے آگے بڑھے نہ کہ جڑ سے ساری مونچھیں کاٹنا۔ ''مفو'' مافہ سے مشتق ہے۔ اس کا مطلب ہی یہی ہے کہ مونچھوں کی ابتدا۔

اس معنیٰ کی تائید میں ایک اور حدیث بھی ہے کہ جسے زید بن ارقم نے روایت کیا ہے۔ مسند احمد اور سنن میں موجود ہے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

---

① شیخ البانی رحمہ اللہ کا موقف اس مسئلہ میں محل نظر ہے کیونکہ جب شیخ البانی رحمہ اللہ خود شروع میں بیان کر چکے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک لمبی تھی تو پھر ایک مٹھی سے زائد کاٹنے کی اجازت دینا کیسے جائز ہوا؟ رہا جہاں تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فعل تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب پانچ الفاظ ''واعفو، اوفوا، ارفوا، ارحوا، وفروا'' کہ جن کا معنی ومطلب یہ ہے کہ داڑھی کو اس کی حالت پر چھوڑ دو'' کے آ جانے کے بعد صرف ایک صحابی کے عمل سے جواز کا فتویٰ دینا محل نظر ہے۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کسی صحابی کا عمل حجت نہیں اور پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابن عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ عشرہ مبشرہ، خلفاء اربعہ میں سے کسی سے یہ ثابت نہیں۔ اس لیے داڑھی کو ایک مٹھی سے زیادہ کاٹنا بھی جائز نہیں۔ (راشد)

((من لم یاخذ شاربة))

نہیں فرمایا بلکہ ''من'' کے ساتھ بیان فرمایا اور من تبعیض کے معنیٰ کے لیے آتی ہے۔ اس حدیث کے معنیٰ کی وضاحت کے لیے ایک اور حدیث پیش خدمت ہے:

''مسند احمد'' وغیرہ میں ہے کہ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اس کی مونچھیں بڑھی ہوئیں تھیں تو آپ ﷺ نے ایک قینچی منگوائی اور مسواک منگوا کر اس کے ہونٹ پر رکھی جو بال اس مسواک سے نیچے تھے وہ کٹوا دیئے۔

سوال ہیرا پہننے کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ الامارات:۱۲٤]

جواب ہیرے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے ڈائمنڈ اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ شریعت میں ایسی کوئی نص نہیں آئی کہ جس میں سونے اور چاندی کے علاوہ قیمتی چیزوں کا استعمال منع ہو۔

نمبر دو: جو سرخ سونا ہے اس پر کچھ ایسے کیمیائی مادے ڈالے جاتے ہیں کہ جن کی وجہ سے اس کا رنگ بدل جاتا ہے کہ اگر یہ اس رنگ ڈائمنڈ کے رنگ کے مشابہ ہو تو اس پر بھی سونے کے احکام ملیں گے۔

سوال جن چیزوں کو سونے کا پانی لگایا گیا ہو تو ان کے استعمال کا کیا حکم ہے' جیسے گھڑی' پین وغیرہ۔[فتاویٰ الامارات:۱۲۵]

جواب یہاں ایک مسئلہ ہے اس میں تفریق کرنا ضروری ہے۔ اگر تو جس چیز کو رنگا گیا ہے، وہ تھوڑا سا ہو یعنی معمولی سا ہو پھر تو ان شاء اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا۔

دوسرا یہ کہ اگر اس چیز کو اس طریقہ سے رنگا گیا ہو کہ انسان کا ذہن دیکھنے کے ساتھ فوراً اس طرف جائے کہ شاید یہ چیز گھڑی وغیرہ ہے ہی سونے کی تو پھر بچنا چاہیے کہ جس طرح حدیث ہے:

((دع مایریبك الی مالا یریبك))

جو چیز آپ کو شک میں ڈالتی ہے' اسے چھوڑ دو اس کی طرف کہ جو شک میں نہ

ڈالے۔یعنی اس چیز کے استعمال سے بچے اگر چہ وہ چیز ذاتی طور پر حرام نہیں ہے۔

(سوال) کیا ایسی گھڑی باندھنا جائز ہے کہ جس میں قیمتی پتھر ہوں؟

[فتاویٰ الامارات: ۱۲۶]

(جواب) شارع نے قیمتی کانوں کو حرام قرار نہیں دیا۔سونے اور چاندی کے علاوہ تو ایسی گھڑی باندھنا کہ جس میں کچھ قیمتی پتھر ہوں کوئی حرج نہیں ہے۔

(سوال) بعض لوگ دائیں ہاتھ میں گھڑی باندھنے کو مستحب سمجھتے ہیں'اس کی دلیل کیا ہے؟[فتاویٰ المدینہ: ۵۷]

(جواب) ہم اس مسئلہ میں اسی حدیث کو دلیل سمجھتے ہیں کہ جو ''صحیح بخاری'' میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

((کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یحب التیمن فی کل شیءٍ فی ترجلہ اوفی تنعلہ اوفی تطھرہ وفی شانہ کلہ))

کہ نبی علیہ السلام ہر کام میں دائیں جانب کو پسند کرتے تھے' کنگھی کرنے میں' جوتا پہننے میں، پاکی حاصل کرنے میں اور اپنے ہر کام میں۔

اس کے علاوہ ایک اور بخاری کی حدیث ہے:

((إِنَّ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى لَا يَصْبُغُونَ شعورھم فَخَالِفُوهُمْ))

یہود و نصاریٰ اپنے بالوں کو نہیں رنگتے تو تم ان کی مخالفت کرو۔دوسری احادیث بھی ہیں کہ جن میں مشرکین کی مخالفت کا حکم ہے۔ان سب احادیث کے مجموعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کفار کی مخالفت کرنا ایک مسلمان نصب العین ہونا چاہیے' ہمیں ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیے کہ کفار کی مخالفت کرنا ایک الگ چیز ہے اور ان کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا منع ہے یہ دوسری چیز ہے۔

تو مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ کفار کی مشابہت اختیار کرے بلکہ اس کے لیے یہ لائق ہے کہ وہ ہر وقت کفار کی مخالفت کا قصد رکھے۔اسی بنا پر کفار کے اندر یہ عادت

چل چکی ہے' بائیں ہاتھ میں گھڑی باندھنا' ہمیں ایک بہت بڑا ذریعہ حاصل ہوا ہے کہ ہم کفار کی مخالفت کریں۔ تو لہٰذا دائیں ہاتھ میں باندھنا سنت سے محبت اور کفار کے خلاف نفرت کا مظہر ہے۔

سوال پتلون (پینٹ شرٹ) پہننے کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ الامارات:۳]

جواب پینٹ شرٹ میں دو مصیبتیں ہیں۔ ایک تو یہ آدمی کے ستر کی جگہ کو واضح کر دیتا ہے۔ خصوصاً نماز کی حالت میں' عورت تو عورت ہے مردوں کے لیے بھی ایسا لباس جائز نہیں ہے کہ جوان کے جسم کی نمائش کا باعث بنے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ کفار کا لباس ہے۔ نبی علیہ السلام سے یہ بات ثابت ہے:

((بعث بين يد الساعة السيف حتى يعبدالله وحده لاشريك له وجعل نوقي تحت بحل رمحي وجعل الذل والصغار على من خالف امري ومن تشبه بقوم فهومنهم))

مجھے قیامت سے پہلے پہلے تلوار دے کر بھیجا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اکیلے اللہ کی عبادت کی جائے کہ جس کا کوئی شریک نہیں اور میرا رزق میرے نیزے کے سائے کے نیچے ہے۔ ذلت اور رسوائی اس کے مقدر میں کہ جس نے میرے امر کی مخالفت کی اور جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ ان میں سے ہے۔

"صحیح مسلم" میں ایک اور حدیث ہے کہ نبی علیہ السلام کے پاس آ کر ایک شخص نے آپ ﷺ کو سلام کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((هذه من ثياب الكفار فلا تلبسها))

کہ یہ کپڑے کفار کے لباس میں سے ہیں یہ مت پہن۔ تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اگر ضرورت کی وجہ سے پینٹ پہننی پڑ جائے تو پہن لے لیکن اس پر ایک لمبی جرسی نما کوئی چیز بھی پہن لیں کہ جس طرح بعض ہمارے پاکستانی اور ہندی بھائی کرتے ہیں۔

طلاق اور ترکہ کا بیان

سوال ایک شخص اپنی بیوی سے کہتا ہے۔مجھ پر قسم ہے تیری طلاق کی اگر تو فلاں جگہ پر گئی۔تو اگر بیوی چلی جائے تو اس کا حکم کیا ہوگا؟ جاننے کے باوجود نیت لفظ کے ساتھ وارد ہوتی ہے؟[فتاوی الامارات:۲۲]

جواب اس کا قول (علی الطلاق) یہ طلاق کی قسم ہے۔

اورطلاق کی قسم طلاق نہیں ہے۔الا کہ اگر وہ اس کا مقصد کرلے تو اس وقت طلاق واقع ہوجائے گی۔

علماء نے طلاق کی دو قسمیں بنائیں ہیں:① طلاق سنی ② طلاق بدعی۔

طلاق سنی وہ ہے کہ جو سنت کے مطابق ہو اور طلاق بدعی کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ اسے الفاظ میں ادا نہیں کرنا چاہیے۔اگرچہ پھر واقع ہونے کے بارے میں ان کے مابین اختلاف ہے۔سنی طلاق کی شرائط میں سے گواہوں کا ہونا بھی شرط ہے۔

سوال ایک شخص کا ایک بیٹا ہے اور بہت ساری بیٹیاں ہیں۔ بیٹا باپ سے پہلے مرجاتا ہے، پھر باپ بھی مرجاتا ہے تو کیا بیٹے کے بیٹوں کو میراث میں حصہ ملے گا؟ [فتاوی الامارات:۱۱۵]

جواب اس مسئلہ میں بہت سارے ہم عصر علماء نے بحث کی ہے۔ ہمارے علم کے مطابق میراث میں ان کا کوئی حق نہیں ہے۔①

---

① شیخ البانی رحمہ اللہ سے یہاں سہو ہوا ہے کیونکہ مسئولہ صورت میں پوتے وارث ہوں گے۔کیونکہ بیٹا باپ کی موجودگی میں انتقال کرگیا تو اب بیٹے کی اولاد یعنی پوتے بیٹے کے درجے میں ہوں گے اور وہ بیٹیوں کو دوتہائی دینے کے بعد باقی مال کے بطور عصبہ وارث ہوں گے۔ ہاں اگر کوئی بیٹا موجود ہوتا تو پھر یہ پوتے محروم ہوجاتے اور وہ بیٹا عصبہ بن جاتا۔(راشد)

سنن اور بدعات کا بیان

سوال سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''جسے مسلمان اچھے سمجھیں وہ اللہ کے ہاں بھی اچھا ہے اور جسے مسلمان برا جانیں وہ اللہ کے ہاں بھی برا ہے۔'' کیا اس حدیث سے یہ ثابت بدعت حسنہ کا ثبوت نہیں ملتا؟

جواب یہ حدیث مرفوع نہیں' بلکہ موقوف ثابت ہے۔ دیکھیں(الضعیفہ ۔۵۳۳) یہ انتہائی عجیب بات ہے کہ بعض لوگ اس حدیث سے بدعت حسنہ کا استدلال کرتے ہیں اور اس کے حسنہ ہونے کی دلیل مسلمانوں کا اس کا اہتمام کرنا ہے اور جب یہ مسئلہ عام ہوا تو ان لوگوں کا عجلت میں اس حدیث سے استدلال کرنے سے یہ معاملہ مشہور ہو گیا، حالانکہ ان پر یہ مخفی رہا۔

(الف) یہ حدیث موقوف ہے۔ جسے قطعی نصوص ''کل بدعة ضلالة'' کے مقابل دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔

(ب) اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اسے دلیل بنایا جاسکتا ہے۔ درج ذیل صورتوں میں یہ دیگر نصوص کے معارض نہیں رہے گی۔

الاول: کسی معاملہ' مسئلہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع واتفاق اس سے مراد ہے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اس سے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلافت کے انتخاب پر استدلال سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اس صورت میں ''المسلمون'' پر ''اللام'' استغراقی نہیں بلکہ العہد کا ہوگا۔

الثانی: اگر ہم (تھوڑی دیر کے لیے) یہ تسلیم کریں کہ ''الف لام'' استغراق کا ہے۔ تو بھی اس سے مسلمانوں کا ہر فرد خواہ وہ ذرا سا علم نہ رکھنے والا جاہل ہو قطعاً مراد نہیں۔

لامحالہ اس صورت میں ''المسلمون'' سے مراد ''اہل العلم'' ہی ہوں گے اور میرے خیال میں اسے ماننے بغیر کوئی چارہ کار اور جائے پناہ نہیں ہے۔

اہل العلم کون؟

تو اس صورت میں اہل علم کون ہوں گے؟ کیا اس میں وہ مقلد بھی شامل ہوں گے جنہوں نے اپنی ذات پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کو سمجھنے کی راہ میں کی ہوئی ہے اور وہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا؟

ہرگز اس سے یہ لوگ مراد نہیں۔اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

حافظ بن عبدالبر رحمہ اللہ "جامع بیان العلم" (۲/ ۳۷-۳۶) میں فرماتے ہیں:

''علم کی تعریف علماء کے نزدیک یہ ہے کہ جس چیز پر آپ کو یقین آ جائے اور آپ اس میں فکر و تامل کریں اور جس کسی کو کسی بھی چیز کا یقین ہو گیا اور اس میں غور و فکر کر لیا تو اس نے اسے (اس کی حقیقت کو) جان لیا (اور اس کے برعکس) جسے کسی چیز کا یقین نہ ہوا اور اسے تقلید کرتے ہوئے مان لیا۔ (بغیر یقین' غور و فکر کے) تو اسے اس چیز کا علم حاصل نہ ہوا اور تقلید اکثر علماء کے نزدیک اتباع نہیں ہے۔

اس لیے کہ اتباع یہ ہے کہ قائل کا آپ کے لیے اپنے قول کی صحت کو واضح کرنے کی تلاش و جستجو کرنا (اتباع ہے) اور تقلید یہ ہے کہ: آپ کوئی بات کرو' حالانکہ آپ کو اس کا علم ہو' نہ اس کے قول کی وجہ اور معنی (پتہ ہو)۔

((ان المقلد لا یسمی عالما))

''بے شک مقلد کو عالم نہیں کہا جا سکتا۔''

علامہ سندھی نے "ابن ماجہ ۱/ ۷" کے حاشیہ کے نقل کر کے اس کا اقرار کیا ہے اور اس بات کو کئی ایک مقلدین نے بیان کیا ہے بلکہ بعض نے تو اس کی حقیقت مزید یہ کہہ کر واضح کر دی کہ ''مقلد جاہل ہوتا ہے۔''

صاحب الہدایہ نے کہا:

''کسی کو اس وقت تک قاضی کا منصب نہ دیا جائے' جب تک وہ صاحب اجتہاد نہ ہو''

ابن الہمام نے "فتح القدیر" (٥/٤٥٦) میں لکھا:

''صحیح بات یہ ہے کہ اہلیت اجتہاد اولین شرط ہے۔ بہرحال جاہل کو یہ (منصب قضاء) سونپنا ہمارے ہاں صحیح ہے اور امام شافعی (اس مسئلہ میں) ہمارے خلاف ہیں۔

قلت:

غور کریں کہ کیسے ابن الہمام نے مقلد قاضی کو جاہل قرار دیا۔ جب باعتراف خود علم میں ان کی حالت اور مقام یہ ہے...... الغرض کہ اس سے مقلدین مراد نہیں۔

خلاصہ کلام:

یہ کہ حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ موقوف ہے اور بدعتیوں کے لیے اس کی کوئی دلیل نہیں۔ اور یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے جبکہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ صحابہ کرام میں سے بدعت اور اس کی پیروی کے سخت مخالف تھے۔ اس بارہ میں ان اقوال وواقعات ''سنن الدارمی'' اور ''حلیۃ الاولیاء'' وغیرھا کتب میں مشہور ومعروف ہیں۔ یہاں صرف ایک قول پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

((اتبعوا ولا تبتدعوا فقد کفیتم علیکم بالامر العتیق))

''اتباع کرو اور نئے نئے کام اختیار نہ کرو' کہ تم (قرآن وسنت کے ساتھ) کفایت کیے گئے ہو اور پرانے معاملے (یعنی کتاب وسنت) کو لازم پکڑو۔''

اس کی تخریج میرے رسالے (الرد علی التعقیب الحثیث) میں ملاحظہ ہو۔

اے مسلمانو! سنت کو لازم پکڑو' تم ہدایت وفلاح پا جاؤ گے۔

[نظم الفرائد: ١/٢١٠-٢٠٧]

سوال کیا غیر مسلموں کی خاص تہواروں میں کہ جو بعض ممالک میں منعقد ہوتی ہیں،

ان میں شرکت کرنا جائز ہے؟ اوران تہواروں کی مناسبت سے اگروہ تحفہ بھیجیں تو کیا اسے قبول کرنا جائز ہے؟ [فتاویٰ الامارات:۱۰۷]

جواب یہ مشکل ہمارے لیے اس لیے کھڑی ہوئی کہ ہم نے کفار کے نظم کی تقلید کی ان سے جان چھڑانا آسان نہیں۔ الاکہ اپنی ساری معاشرت ہم تبدیل کریں۔

اسلام میں تین عیدوں کے علاوہ کوئی عید نہیں پائی جاتی ۔دوسالانہ عیدیں عیدالفطر اورعیدالاضحیٰ اورایک ہفتہ وار عید یعنی جمعہ کا دن۔

ہمیں کسی زمانے میں سے ایک عید سے شکوہ ہے کہ جو حقیقت میں عید نہیں ہے، لیکن مسلمانوں کے اوپر تھوپ دی گئی ہے۔وہ یہ عیدمیلاد النبی جو کہ بدعت سنت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر یہ کہ عید مسلمانوں کے پرانے نصاریٰ کی رسموں کی تقلید کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، کسی بدعتی نے کہا کہ نصاریٰ اپنے نبی کی پیدائش پر مجلسیں کرتے ہیں تو کیا ہم اپنے نبی ﷺ کی پیدائش پر محفلیں نہ کریں؟ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دین سے غفلت اختیار کررکھی ہے۔تو گویا اس میں عیسائی مسلمانوں کے لیے قدوہ بن گئے ہیں گویا کہ نبی علیہ السلام نے ہمیں ان کی تقلید کرنے سے ڈرایا ہی نہیں۔ ''صحیح مسلم'' میں ابوقتادہ انصاری کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے نبی علیہ السلام سے پوچھا کہ پیر کے دن کے روزے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((ذاك يوم ولدت فيه وانزل على الوحي فيه))

یہ ایک دن ہے کہ جس میں میری پیدائش ہوئی اورمجھ پر اس دن وحی نازل ہوئی۔تو گویا کہ نبی علیہ السلام فرمارہے ہیں کہ پیر کے دن تم شکرانے کا روزہ رکھا کرو۔میری ولادت اورمیری بعثت کے شکرانے کے طور پر تو ہم پر لازم ہے کہ ہم اس نعمت کو یاد کرتے ہوئے اس دن کا روزہ رکھیں کہ اس سے بڑھ کر ہمارے لیے کیا چیز نعمت کا باعث بن سکتی ہے۔ ہر پیر کے دن کا روزہ رکھیں۔بہت کم لوگ پیر کے دن نبی علیہ السلام کی بعثت کے

شکرانے کے طور پر روزہ رکھتے ہیں۔ اس دن مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک سب سے اچھا نعم البدل محمد علیہ السلام کی صورت میں عنایت فرمایا۔

آپ اکثر مسلمانوں کو پائیں گے کہ عید میلاد النبی کی مجلسیں تو منعقد کرتے ہیں لیکن پیر کے دن کا روزہ نہیں رکھتے اور جب ان سے کہا جائے کہ تم مجلسیں کیوں منعقد کرتے ہو؟ وہ کہتے ہیں نبی علیہ السلام کی تعظیم میں ہم مجلسیں منعقد کرتے ہیں لیکن نبی علیہ السلام نے ان کے لیے وہی کچھ مشروع قرار دیا کہ جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اور لوگوں کے لیے بہتر تھا کا حکم دیا اور یہ جو مجلس ہے یہ بدعت ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ کفار کے ساتھ مشابہت بھی ہے اور تم اس طرح کی غیر شرعی محفلیں منعقد کرتے ہو ہر سال میں ایک مرتبہ نبی علیہ السلام نے تمہارے لیے مسنون قرار دیا کہ ہر ہفتہ تم مجلس منعقد کرو تو اس لحاظ سے دونوں مجلسوں میں سے کونسی مجلس بڑی ہے؟

تو لہٰذا ہمارے لیے مذکورہ تین عیدوں (عید الفطر، عید الاضحیٰ اور جمعہ) کے عیدیں اور مجلسیں منعقد کرنا جائز نہیں ہے۔ باقی رہا تحفہ قبول کرنا تو تحفہ کی بنیاد فاسد چیز یہ ہے جس چیز کی بنیاد ہی فاسد چیز پر ہو تو وہ خود تو فاسد ہی ہوگی۔

سوال کیا عیسوی سال کے شروع میں جس طرح عیسائی مختلف مجلسیں منعقد کرتے ہیں؟ ان مجلسوں میں جا کر شرکت کرنا تاکہ وہ اسلام کو اپنائیں؟

[فتاویٰ الامارات: ۱۲۳]

جواب جو شخص درحقیقت واقعتاً اتنا حریص ہو کہ غیر مسلموں کو اسلام کی طرف دعوت دینے کا شوق رکھتا ہو تو ان کے تہواروں کے موقع پر ان کے ساتھ جمع ہو کر ان کی عیدوں میں شرکت کر کے پھر دعویٰ کیا جائے کہ ہم ان کو اسلام کی دعوت دے رہے ہیں۔ جبکہ اس کے علاوہ بہت سارے ایسے میدان ہیں مثلاً خطابت کی شکل میں کتابت کی صورت میں اور اسی طرح دوسرے اسباب اسلام میں ایسا جائز نہیں ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس وسیلہ کو جائز قرار دیں۔ کیونکہ یہ اسلامی قاعدہ نہیں ہے۔ آج کل

بہت سارے مسلمان اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ آپ ان کو پائیں گے وہ بہت سارے غیر شرعی احکام میں ملوث ہوں گے اور وہ ذاتی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مصلحت سے کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح بہت سارے نام کے مسلمان بھی نبی علیہ السلام کی پیدائش کے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر وہ ایسی تقریریں کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ بعض سلفی حضرات بھی شریک ہوجاتے ہیں اور وہ سلفی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بڑا غنیمت والا موقع ہے کہ ان کو بات سمجھادی جائے تو لہٰذا ہم اس طرح کی عیدوں میں شرکت کو جائز نہیں سمجھتے۔

سوال کیا فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا جائز ہے؟ بعض لوگ اس کے جواز کے لیے "ان النبی صلاة الفجر ثم انحرف ورفع یدیه ودعا" اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں؟[فتاوی الامارات:۹۳]

جواب ہمارے علم کے مطابق یہ حدیث ذخیرہ حدیث کی کتب میں سے کسی کتاب میں مجھے نہیں ملی۔ معروف یہ ہے کہ نبی علیہ السلام نماز سے سلام پھیرنے کے بعد اذکار میں یادعاؤں میں مصروف ہوجاتے۔ اس کی قید مذکور نہیں ہے اور کسی حدیث میں بھی اس طرح کی دعا کا ذکر نہیں آتا کہ جس طرح کے بعض مساجد کے آئمہ کرتے ہیں۔ بہت ہی مختصر دعاؤں کا ذکر نبی علیہ السلام سے آتا ہے:

((اللهم قني عذابك يوم تبعث عبادك))

"اے اللہ! مجھے اپنے عذاب سے بچا کہ جس دن تو اپنے بندے اٹھائے گا۔"

فرض نمازوں کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک اور دعا:

((اللهم انت السلام ومنك السلام تباركت ياذالجلال والاكرام))

یہ بھی پڑھا کرتے تھے لیکن ایسی کسی دعا میں ہاتھ اٹھانے کے بارے میں کوئی ذکر نہیں آتا جبکہ قنوت نازلہ میں ہاتھ اٹھانا نبی علیہ السلام سے ثابت ہے۔

نبی علیہ السلام کی سنت کی دو قسمیں ہیں۔ سنت فعلیہ اور سنت ترکیہ۔ جو جو عبادات اور اطاعتیں نبی علیہ السلام نے کیں تو وہ ہمارے لیے سنت ہے۔ ہم بھی اسی طرح سے کریں اور

جو کام نبی علیہ السلام نے چھوڑیں ان کو چھوڑنا سنت ہے۔ اپنے نبی کی اتباع کرتے ہوئے۔

تو ہم جیسے مثلاً پانچوں نمازوں کے لیے اذان دیتے ہیں جبکہ بارش کی نماز اور سورج گرہن کی نماز کے وقت اذان نہیں دیتے جبکہ انسان کی عقل تو یہ کہتی ہے کہ جس طرح پانچوں نمازوں کے لیے اذان دینے کی ضرورت ہے کہ لوگ جمع ہوں تو اس سے کہیں زیادہ ضرورت ہے کہ ان نمازوں کے لیے اذان دی جائے۔ لیکن اس سخت ضرورت کے باوجود اذان صرف پانچ نمازوں کے لیے مشروع ہے کیونکہ نبی علیہ السلام نے اس طرح کی نمازوں میں اذان کو چھوڑا ہے تو لہٰذا ان نمازوں کے لیے اذان چھوڑنا ہی سنت ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''اقتضاء الصراط المستقیم'' میں فرمایا کہ مصلحت مرسلہ اور بدعت میں فرق ہے تو فرماتے ہیں کہ ہر وہ بدعت کو جو نبی علیہ السلام کے بعد پیدا ہوئی ہے' وہ ان دو شکلوں میں گھومتی نظر آتی ہے۔

اولاً: یا تو بدعت کرنے والا ایسا شخص ہو کہ اس بدعت کا خدشہ عہد نبوت میں بھی تھا لیکن اس وقت نہیں کیا مثلاً جیسے پانچوں نمازوں کے علاوہ کے لیے اذان دینا اب اس بدعت کو اختیار کرنا یہ دین میں نئی بات کرنا ہے۔ جب اس تقاضے کا یہ سبب ہو کہ مسلمانوں میں دین کے احکامات اپنانے کی کمی ہو تو اس بدعتی کی بات کو نہیں لینا چاہئے۔ اس کی مثال جس طرح مختلف ٹیکس جولاگو ہیں تو اس ٹیکس کی بھی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شرعی احکام (یعنی زکوٰۃ) کو نظر انداز کر دیا گیا کہ جو قومی خزانہ شمار ہوتا۔ تو لہٰذا ایسے ٹیکس لینا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ اس ٹیکس لگنے کی وجہ سے مسلمانوں کی اپنی سستی ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں کی اس کوتاہی یا کمی کا ازالہ ممکن نہ تو پھر ٹیکس لینا لازم آئے گا۔ یہاں آپ کے سامنے مصلحت مرسلہ اور بدعت کے درمیان فرق بتاتے چلیں۔ مصلحت مرسلہ جو ہے یہ عبادت میں اضافہ کا دروازہ نہیں ہے بلکہ ایک مسلمانوں کی مصلحت کا خیال رکھنے کے مترادف ہے کہ اس کا دین میں عبادت کے اضافہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے مالی طور پر اتنا مستحکم کیا ہے کہ وہ جہاز یا گاڑی کے ذریعہ

سے فریضہ حج ادا کرسکتا ہے لیکن وہ کہے کہ میں پیدل جاؤں گا اور یہ بھی کہے کہ پیدل حج کرنا افضل ہے۔ تو یہ بدعت ہے۔ لیکن اگر کوئی ان سواریوں میں سے کسی سوار پر بیٹھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور لیکن پیدل حج کرنے کی طاقت رکھتا ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ حج کرے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے عموم سے یہ ثابت ہے:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾(ال عمران:۹۷)

اللہ کے لیے لوگوں پر حج بیت اللہ کرنا لازم ہے جو بھی اس کے راستہ کی طاقت رکھتا ہو تو نبی علیہ السلام لوگوں میں سے سب سے زیادہ طاقتور تھے۔ اسی طرح سے آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی طاقتور تھے لیکن پھر بھی انہوں نے پیدل حج نہیں کیا۔ بلکہ آپ نے اور آپ کے صحابہ سواریوں پر حج کیا۔ کون شخص دعویٰ کرسکتا ہے کہ نبی علیہ السلام عبادت میں زیادہ عبادت کا شوق نہیں رکھتے تھے؟ حالانکہ آپ پیدل حج نہیں کیا طاقت ہونے کے باوجود۔ اب اگرچہ ہوائی جہاز ایک نئی چیز ہے لیکن مصالح میں داخل ہے کہ اس کے ذریعہ انسان سہولت کے ساتھ بیت اللہ کا حج کرسکتا ہے۔

سوال سب جمع ہوکر اجتماعی طور پر تلاوت کریں، کسی ایک دن یا کبھی کبھار تو کیا یہ جائز ہے؟[فتاویٰ المدینہ:۱۶]

جواب جب اس طرح جمع ہونے سے مقصود دوسرے مسلمانوں کے لیے آسانی ہو تو پھر تو جائز ہے کہ تاکہ سب مل کر قرآن کی تلاوت کریں۔ لیکن اگر اس عقیدہ سے یہ کام کریں کہ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی خاص قربت حاصل کرنا کسی معین دن میں تو پھر جائز نہیں ہے۔

سوال دانوں والی تسبیح کے ساتھ تسبیح پڑھنے کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ المدینہ:۵۸]

جواب دانوں کے ساتھ تسبیح پڑھنا بدعت ہے۔ سنت کے مخالفت ہے۔ سنت طریقہ انگلیوں کے پوروں پر تسبیح پڑھنا ہے بلکہ حدیث میں تو یہ بھی وضاحت ہے کہ انگلیوں کے پوروں سے قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔ دانوں والی تسبیح نبی علیہ السلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم

کے دور میں نہیں تھی۔ یہ بعض دوسری امتوں سے ہماری طرف منتقل ہو کر آئی ہے۔ جس طرح کہ نصاریٰ ہیں۔ نصاریٰ نے بوذیوں سے نقل کیا ہے۔ آج کل بھی ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائیوں کے بڑے بڑے پادریوں کی گردنوں میں تسبیح لٹک رہی ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کفار کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے میں شامل ہے۔ تو یہ دوسری مشابہتوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ تو لہٰذا ہم دانوں والی تسبیح رکھنے کے منکر ہیں۔ بلکہ بسا اوقات یہ عمل اخلاص کے بھی منافی ہے۔

سوال ”جو لوگ تلاوت کے بعد آخر میں ”صدق الله العظیم“ کہتے ہیں کیا یہ کلمہ ثابت ہے؟ یا کیا ایسے شخص کو بدعتی کہہ سکتے ہیں؟[فتاویٰ المدینہ: ۷۰]

جواب ہمیں اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سارے قراء قراءت کے بعد ایسی بدعت کرتے ہیں کہ جو سلف صالحین کے زمانے میں ثابت نہیں ہے۔

لائق ہے کہ دین میں کوئی نئی چیز نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ بدعت ذاتی طور پر ایک منکر چیز ہے۔ بسا اوقات بدعت مقبول چیز ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود بدعت کو گمراہی کہا جاتا ہے۔ جس طرح کے اس کی طرف ابن عمر نے اشارہ کیا ہے:

((کل بدعة ضلالة وان رآها الناس حسنة))

کہ ہر نئی چیز گمراہی ہے اور اگرچہ لوگ اسے اچھا سمجھیں۔ ”صدق اللہ العظیم“ کی یہ عبارت تو بڑی خوبصورت ہے جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

﴿ومن اصدق من الله قیلا﴾ (النساء:۱۲۲)

لیکن جب بھی ہم آیات پڑھنے کے بعد یہ الفاظ پڑھیں گے تو مجھے ڈر ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ان الفاظ کو قرآن کی آیات میں شامل نہ کر لیا جائے کہ جس طرح اذانوں کے بعد ”الصلاۃ والسلام علیک یارسول اللہ“ کا اضافہ کر دیا گیا۔ بعض لوگوں کا ”قل صدق اللہ“ سے اس کے لیے استدلال کرنا ایسے ہے جیسے بعض لوگ ”اللہ اللہ...... کے جواز کے لیے ”قل اللہ......“ استدلال کرتے ہیں۔

ذکر اور دعا کا بیان

سوال بخاری میں ابن عباس کی حدیث ہے:

((كُنْتُ أَعْرِفُ انْقِضَاءَ صَلَاةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالتَّكْبِيْرِ))

اس کا کیا معنیٰ ہے؟ کیا اس سے ثابت ہوتا ہے پانچوں نمازوں کے بعد جہراً اذکار کرنا مباح ہے؟ [فتاویٰ الامارات: ۱۸]

جواب نبی علیہ السلام نماز کے بعد جہراً اذکار کرتے تھے تاکہ اپنے صحابہ کو مشروع اذکار سکھائیں۔ علامہ عینی اپنی کتاب ''عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری'' میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں بھی واضح اشارہ ہے لیکن اس طرح جہراً ہمیشہ نماز کے بعد نہیں کرتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

(کنانعرف فی عھدالرسول ذالك)

ہم نبی علیہ السلام کے دور میں اس چیز کو ہم دیکھتے تھے۔ تو اس میں اشارہ ہے کہ انہوں نے جس چیز کو پہچانا تھا وہ مستقل نہیں تھا اور یہ ابتدائی احکام کے ساتھ مناسب ہے۔ باقی آہستہ اذکار کرنے کی اور بہت ساری دلیلیں ہیں۔ ان میں سے ایک دلیل ابوسعید خدری کی حدیث ہے ''مؤطا'' اور ''ابوداؤد'' میں صحیح سند کے ساتھ حدیث ہے۔ نبی علیہ السلام نے مسجد میں آوازیں سنی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((یاایھاالناس کلکم یناجی ربه فلا یجھر بعضکم علی بعض بالقراءۃ))

اے لوگو! تم میں سے ہر ایک اپنے رب کے ساتھ سرگوشی کرتا ہے تو تمہارا بعض بعض پر قراءۃ جہراً نہ کرے۔ اور ''بغوی'' میں زائد یہ الفاظ ہیں ''فتؤ ذوالمومنین'' تو تم مومنوں کو تکلیف دو گے۔

بخاری ومسلم میں ابوموسیٰ اشعری کی حدیث ہے۔فرماتے ہیں کہ ہم نبی علیہ السلام کے ساتھ سفر میں لوٹ رہے تھے تو ہم جب اونچی جگہ پہ چڑھتے تو بلند آواز سے اللہ اکبر کہتے اور جب کسی وادی میں اترتے تو بلند آواز کے ساتھ سبحان اللہ کہتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((یاایھاالناس اربعوا علی انفسکم ان من تدعون لیس باصم ولاغائب انما تدعون سمیعاً بصیراً انما تدعون سمیعاً بصیراً انما تدعون من ھواقرب الی احدکم من عنق راحلته))

''اے لوگو! اپنے آپ پر نرمی کرو جس ذات کو تم پکارر ہے ہو وہ بہری نہیں ہے اور نہ ہی غائب ہے بلکہ تم سننے والی اور دیکھنے والی ذات کو پکارتے ہو اور تم جس کو پکارتے ہو وہ تم میں سے ہر ایک کو اس کی سواری کی گردن سے زیادہ قریب ہو اور یہ میدان میں سفر کرتے ہوئے کہا تو مسجد میں کیسا حال ہوگا؟''

سوال نماز ختم ہونے کے بعد بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنے کا کیا حکم ہے؟

[فتاوی المدینہ:۱۳]

جواب ''صحیحین'' میں ابن عباس کی حدیث ہے انہوں نے فرمایا کہ ہم نبی علیہ السلام کی نماز کے ختم ہونے کو بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنے کو پہچانتے تھے۔لیکن بعض علماء نے ابن عباس کے قول پر بہت باریک ملاحظہ کیا ہے۔تو ان کے قول ''کنا'' میں بہت مناسب اشارہ ہے کہ یہ اس پر ہمیشہ عمل نہیں کرتے تھے۔امام شافعی ''الام'' میں فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام کا بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنا تعلیم کے لیے تھا۔تو اس وقت بلند آواز پر عمل تعلیم دلانے کے لیے تھا۔تو ان کی طبیعت میں سے یہ بات تھی کہ آپ اس کام کو ہمیشگی سے نہیں کیا کرتے تھے۔مجھے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی بات بھی یاد آرہی ہے کہ انہوں نے بھی فرمایا' امام کے لیے جائز ہے کہ بلند آواز کے ساتھ ذکر کرے۔

''صحیحین'' میں ابوقتادہ انصاری کی حدیث ہے:

((ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یسمعھم الآیۃ احیاناً فی صلاۃ الظھر والعصر))

کہ بے شک نبی علیہ السلام ان کو کبھی کبھار آیت زور سے سنایا کرتے تھے۔ظہر وعصر کی نماز میں۔عمر بن خطاب نے بھی اس سنت سے اس معنیٰ کو اقتباس کیا ہے کہ جس کی طرف امام شافعی نے اشارہ کیا ہے۔تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے' وہ دعاء واستفتاح جہراً پڑھا کرتے تھے۔لوگوں کی تعلیم کے لیے۔امام شافعی رحمہ اللہ' ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور دیگر اہل علم نے اس حدیث کے معنیٰ کو تعلیم دلانے پر محمول کیا ہے۔کہ شریعت میں ثابت ہے کہ افضل ذکر وہ ہے کہ جو آہستہ ہو۔یہ الفاظ جس حدیث میں ہیں اس کی سند میں ضعف ہے لیکن اس کا معنیٰ صحیح ہے اور بہت ساری ایسی احادیث آئی ہیں کہ جن میں بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنے سے روکا گیا ہے۔جس طرح ابوموسیٰ اشعری کی حدیث ہے ''بخاری ومسلم'' میں کہ صحابہ سفر میں نبی علیہ السلام کے ساتھ تھے تو فرماتے ہیں کہ جب ہم کسی وادی میں اترتے تو سبحان اللہ کہتے اور جب ہم بلند جگہ پر چڑھتے تو ہم زور سے اللہ اکبر کہتے تھے۔تو نبی علیہ السلام نے فرمایا:

((یاایھاالناس اربعوا علی انفسکم ان من تدعونہ لیس باصم ولا غائب انماتدعون سمیعاً بصیراً۔انما تدعون من ھواقربکم الی احدکم من عنق راحلتہ الیہ))

اور یہ حکم جب آپ نے صحابہ کو میدان میں دیا کہ جب کسی کو دوسرے کی پریشان کرنے والی بات نہیں تھی۔تو کیا خیال ہے تمہارا کہ اگر کوئی مسجد میں آواز بلند کرے کہ جہاں وہ قرآن پڑھنے والے تشویش کا خدشہ ہے' اسی طرح سے جس کی نماز نکل گئی تو وہ بھی پریشان ہو جائے گا۔نص صریح میں نبی علیہ السلام نے اس علت کی وجہ سے منع کیا ہے۔ اپنے اس فرمان میں:

((یاایھاالناس کلکم یناجی ربہ فلا یجھر بعضکم علی بعض بالقراء ۃ))

امام بغوی نے زائد یہ الفاظ ذکر کر دیئے ہیں ''فتؤذو االمومنین''

سوال کیا دعا کرنا واجب ہے؟[فتاوی المدینہ:١٦]

جواب مطلق دعا واجب ہے۔

یہاں بعض دعائیں بعض مناسبت کے لحاظ سے واجب ہیں، جیسے چار چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑنا۔ جہنم کے عذاب' قبر کے عذاب' زندگی اور موت کے فتنہ سے اور دجال کے فتنہ سے۔ جس طرح کہ بخاری کی حدیث ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((اذافرغ احدکم من التشھدالاخیر فلیستعذبالله من اربع......))

کہ جب تم میں سے کوئی آخری تشہد سے فارغ ہو جائے تو اسے چاہئے کہ چار چیزوں سے پناہ مانے تو اس میں امر صریح ہے چار چیزوں سے پناہ پکڑنے کے بارے میں۔ اس لیے بعض سلف سے منقول ہے کہ وہ نماز دہرانے کا حکم دیا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص چار چیزوں سے پناہ نہ پکڑے۔

سوال وتر اور اس کے علاوہ میں قنوت کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ الامارات:٩٤]

جواب قنوت وتر میں سنت ہے اور یہ سنت کسی ایک مہینے یا مخصوص مہینوں کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ اسی بناء پر کہ اگر نمازی رمضان میں تراویح میں قنوت کرنا چاہے تو اس کے لیے جائز ہے۔ چاہے رمضان کے شروع میں یا آخر میں قنوت کرنا چاہے۔ امام کے لیے مسنون ہے کہ وہ قنوت کی دعا بلند آواز سے پڑھے اور اپنے ہاتھ اٹھائے' مقتدی بھی اسی طرح کریں گے۔

((مازال رسول الله یقنت فی صلاۃ الفجر حتی فارق الدنیا))

کہ ہمیشہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز کے میں قنوت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ دنیا سے چلے گئے۔ لیکن یہ حدیث دو اسباب کی بنا پر ضعیف ہے۔ پہلا سبب: اس کی سند میں ایک راوی ہے جو کہ ابو جعفر رازی کی کنیت سے معروف ہے۔ اس کا نام عیسیٰ بن ماہان ہے لیکن علماء حدیث کے نزدیک یہ ضعیف ہے۔

دوسری بات: صحیح سند کے ساتھ انس سے ایک روایت آتی ہے کہ جو ہمیشگی کی نفی کرتی ہے۔ جیسے "صحیح ابن خزیمہ" میں حدیث ہے:

((ماكان رسول الله يقنت الااذا دعا لقوم اوعلٰى قوم))

نبی علیہ السلام قنوت نہیں کرتے مگر جب کسی قوم کے لیے یا کسی قوم کے خلاف دعا کرتے۔ اس لیے جمھور کا موقف بھی یہ ہے کہ ہمیشگی کے ساتھ فجر میں قنوت کرنا مشروع نہیں ہے۔

سوال: کیا مسلمان کے لیے جائز ہے کہ مخصوص دنوں کے ساتھ اذکار بھی مخصوص کرے؟ [فتاوی المدينه: ٦٠]

جواب: یہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے۔

کیونکہ اس میں گویا کہ وہ شریعت سازی کررہا ہے اور شریعت سازی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے جائز ہے۔

سوال: کیا نبی علیہ السلام "اللهم اقسم لنا من خشيتك......" یہ دعا سراً یا جہراً پڑھا کرتے تھے؟ [فتاویٰ الامارات: ٨٨]

جواب: حدیث کے ساتھ اس کا جوڑ نہیں ملتا کہ جہراً ایسا کیا کرتے تھے لیکن وقتی طور پر ممکن ہے کہ سراً پڑھتے ہوں۔ لیکن ممکن ہے کہ دوسرے نہ سن پائے ہوں، وگرنہ اس حدیث کے راوی ابن عمر کو کیسے پتہ چلا؟ اور انہوں نے اس دعا کو کیسے یاد کیا؟

تو لازمی بات ہے کہ نبی علیہ السلام اس کے ساتھ اپنی آواز دعا میں بلند کرتے تھے۔ بسا اوقات تعلیم کی غرض سے۔ لیکن جہری طور پر دعا پڑھنے کے حساب سے نہیں کیونکہ جہراً دعا کرنا جہراً ذکر کرنے کے مترادف ہے تو افضل ہے کہ ذکر آہستہ کیا جائے اس طرح سے آہستہ دعا کرنا ہی افضل ہے۔

بعض کتب اور مصنفات کے بارے میں سوالات

سوال آپ نے ''الآیات البینات'' کی تحقیق میں کہا ہے کہ ''کتاب الروح'' کی نسبت ابن قیم کی طرف کرنا مشکوک ہے۔کیا یہ بات صحیح ہے؟

[فتاویٰ المدینہ :۱۵]

جواب جی ہاں اس کتاب کے ابن قیم کی طرف منسوب ہونے کے بارے میں مجھے بھی شک ہے کیونکہ اس میں اس طرح کے قصے کہانیاں اور منکرات ہیں کہ ان کی وجہ سے جبکہ میں کسی مخطوطہ پر بھی مطلع نہ ہوسکا کہ جس پر اعتماد کرسکوں' اس لیے ہم ان کی طرف اس کتاب کی نسبت کاٹنے کا کہتے ہیں۔

سوال کتاب ''الحیدۃ'' کی عبدالعزیز کنانی کی طرف نسب کرنا درست ہے یا نہیں؟

[فتاویٰ المدینہ:۴۳]

جواب حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ نسبت صحیح نہیں ہے اور یہ کتاب اہل السنہ کے عقیدے کے دفاع میں کسی نے لکھی ہے۔

سوال کیا کتاب ''السنۃ'' کی نسبت عبداللہ بن احمد بن حنبل کی طرف کرنا درست ہے جبکہ کوثری اس نسبت کا انکار کرتے ہیں؟[فتاویٰ المدینہ : ۷۵]

جواب اس کتاب کے بارے میں میں نے کوئی تحقیق یا بحث نہیں کی لیکن قدیم اور جدید دونوں دور کے علماء اس کتاب کی نسبت عبداللہ کی طرف کرتے ہیں اور کوثری تو سنت اور اہل سنت کا دشمن ہے۔اس کا دعویٰ بغیر دلیل کے قبول نہیں ہے۔اگر واقعتا اس کے پاس کوئی قطعی دلیل ہے کہ جو اس کتاب کی ان کی طرف نسبت کرنے کے منافی ہو تو جلد از جلد منظر عام پر لے آئیں۔

(سوال) سلیم الہلالی کی کتاب "الجماعات الاسلامیۃ" اور محمد زکریا کی کتاب "تبلیغ النصاب" کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟[فتاوی المدینہ :۸۱]

(جواب) "الجماعات الاسلامیہ" اس کتاب میں تو خیر ہی ہے "تبلیغ النصاب" میں نے نہیں پڑھی لیکن بعض ثقہ ذرائع سے مجھے پتہ چلا کہ اس میں کچھ ایسی باتیں ہیں کہ جو سنت کے مخالف ہیں۔

(سوال) "الفقہ الاکبر" کتاب اور اس کی شرح کہ جو ملا علی قاری نے کی ہے۔ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے اور یہ دونوں سلف صالحین کے عقیدہ کے ساتھ کتنی موافقت رکھتی ہیں؟[فتاوی المدینہ :۱۰۰]

(جواب) "الفقہ الاکبر" کی امام ابوحنیفہ کی طرف نسبت تو محل نظر ہے لیکن حنفی حضرات اس نسبت کو بہت پختہ سمجھتے ہیں۔ شیخ علی کی جو شرح ہے مفید ہے۔ حنفی مذہب کے لحاظ سے کچھ زیادہ خاص ہے۔ بعض مسائل میں وہ سلف صالحین کے عقیدہ کے مطابق بھی ہے۔

(سوال) سید سابق کی کتاب "فقہ السنۃ" کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

[فتاوی المدینہ :۱۱۰]

(جواب) یہ کتاب ابتدائی جو طالب علم ہیں ان کی نسبت بہت اچھی کتاب ہے۔ لیکن یہ کتاب ان طلباء کے لیے سلف صالحین کے منہج کے مطابق سمجھنے کے طریق سے بہت اچھی کتاب ہے اور اس میں کتاب وسنت کے مطابق مسائل ہیں۔ کسی معین مذہب کی قید کے بغیر۔

لیکن اس میں دو لحاظ سے کمی ہے۔ شاید مؤلف نے بھی اس کا ادراک کر لیا ہو۔

پہلا: بہت سارے مسائل کہ جن میں اختلاف ہے' ان مسائل میں درست مذہب کو وضاحت کے ساتھ نہیں پیش کیا گیا۔

دوسرا: بہت ساری احادیث میں صحیح وضعیف کی تحقیق نہیں کی گئی۔ میں نے اس کتاب کے پہلے تین حصوں پر تعلیق لگائی ہے۔ "تمام المنۃ فی التعلیق علی فقہ السنۃ" میں۔

کھانے کی چیزوں کا بیان

سوال عیسائی ممالک میں بعض ایسی مصنوعات ہیں کہ ان کے بقول اس میں گائے کی چربی مکس ہوتی ہے۔ تو کیا یہ چربی بھی حرام ہوتی ہے کیونکہ جن چیزوں میں ملائی جاتی ہے اگر وہ شرعی طور پر پاک نہ ہوں؟[فتاوی المدینہ:٨٦]

جواب کیونکہ صحابہ کے پاس جو مصنوعات فارس وغیرہ سے اس طرح کی آتی تھیں تو انہیں کھاتے تھے اور چربی اگر ایسے جانور کی ہو جسے غیر شرعی طور پر ذبح کیا گیا ہو تو وہ حرام ہے۔ کیونکہ جو جانور شرعی طریقہ سے ذبح کیا جائے اس کی چربی حلال ہوتی ہے اور جو جانور غیر شرعی طور پر ذبح کیا جائے اس کی چربی حلال نہیں ہوتی۔

لیکن صحابہ کے پاس فارس سے جو اس طرح کی مصنوعات آئیں تھیں اور وہ لوگ کھاتے تھے۔ یہ ہمارے لیے ایک طرح سے حجت ہے۔ بہت کم لوگوں کا ذہن اس طرف جاتا ہے تو اس طرح کی پلید چربی پلوں سے پھینک دی جاتی ہے کہ جیسے بعد میں پاک پانی تصور کیا جاتا ہے کہ جو آسمان سے نازل شدہ ہے جبکہ اس میں اس طرح کی پلیدگی گر چکی ہوتی ہے۔ تو کیا اس طرح کا پانی پینا اور اس سے پاکی حاصل کرنا جائز ہے؟ جی ہاں جائز ہے۔ کیونکہ اس طرح کی جو نجاست اس میں گری ہے وہ پانی پر غالب نہیں ہے۔ اس پانی میں طاہر اور مطہر دونوں وصف موجود ہیں۔ اسی طرح ایسا تیار کردہ دودھ بھی پاک ہے اور اس کا پینا بھی جائز ہے۔ اگر چہ یقیناً اس حلیب میں اس طرح کی پلید چربی وغیرہ ڈال دی گئی ہو۔ تو میں یہاں کوئی پختہ رائے نہیں دے سکتا۔ تو اگر کوئی کیمیائی طور پر ماہر شخص ہمارے سامنے پورا فارمولا وضاحت کے ساتھ رکھے۔ ان مختلف مادوں کے ملنے سے اس کے اصل میں کتنی تبدیلی آتی ہے۔ ایک حقیقت سے دوسری حقیقت

کی طرف کتنی اس میں تبدیلی آتی ہے۔تو پھر یہ مشکل ہمارے لیے آسان ہو جائے گی۔ اگر تحقیق کرنے والے کے لیے یہ بات ظاہر ہو جائے'ان مختلف چیزوں میں چربی ملنے کے باوجود محفوظ ہے لیکن وہ اگر حلیب مکس ہو جانے کے بعد بہتر بن جائے تو اس کا جواب وہی ہے کہ جو پہلے گزر چکا ہے ۔تو تبدیل ہونا جانا یہ اصل عامل ہے۔اس کے حکم کے تبدیل ہونے کے لیے۔تو تبدیلی جن چیزوں سے آتی ہے اگر وہ تمام پاک چیزیں ہوں تو پھر تو کوئی حرج نہیں ہے۔ شراب حرام ہے'نشہ کی وجہ سے۔اگر اس میں کوئی چیز مل کر اس میں مل جائے اور نشہ ختم ہو جائے تو وہ شراب بھی حلال ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ سرکہ بن جاتی ہے۔نشہ آور بھی نہیں رہتی اور نجس بھی نہیں رہتی۔

سوال درآمد شدہ گوشت کھانے کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ المدینہ:٦٣]

جواب یہ گوشت یا تو ایسے جانوروں کا ہوگا کہ جن کو ذبح کیا گیا ہوگا۔ پھر یا تو اہل کتاب کے ذبیحہ کے مطابق ہوں گے یا شرعی طور پر ان کو ذبح کیا گیا ہوگا۔تو یہ حلال ہیں اور اگر ان کو قتل کیا گیا ہو تو پھر حلال نہیں ہے۔ جب ہمیں ایک چیز معلوم نہ ہو تو ہم کہیں گے"دع ما یریبک الی مالا یریبک" کہ جو چیز آپ کو شک میں ڈالتی ہے اسے چھوڑ دو وہ کرو کہ جس میں شک نہ ہو۔اہل کتاب کے علاوہ کے ذبیحے ہمارے لیے حلال نہیں ہیں۔یا پھر ایسے حیوانات کہ جنہیں ذبح کر کے گوشت نہیں کھایا جاتا تو وہ بھی حلال نہیں ہیں۔

سوال جب میں کسی بھائی سے ملاقات کے لیے جاؤں تو کیا میرے لیے جائز ہے کہ میں اس سے پوچھوں اس تواضع میں لائی ہوئی چیزوں کے حلت وحرمت کے بارے میں؟[فتاویٰ الامارات:٧٥]

جواب اگر یہ کھانا کسی اسلامی ملک میں ہو تو غالب گمان یہی ہے کہ شرعی طور پر ذبح کیا ہوا گوشت ہے۔تو پھر سوال کرنے کی حاجت نہیں ہے،لیکن جب معاملہ اس کے

برخلاف ہو یعنی جو آپ کا میزبان ہے وہ مسلمان ہے۔ لیکن کسی غیر مسلم ملک میں ہے۔ یہ بات بھی معروف ہے کہ وہاں جانور بہت کم ذبح کیے جاتے ہیں یا کسی ایسے مسلم ملک میں ہو کہ جہاں گوشت دوسرے ممالک سے درآمد کیا جاتا ہو اور ہمیشہ اس گوشت کے بارے میں پوچھا جاتا ہو کہ یہ ذبیحہ کا گوشت ہے یا جانور مارا گیا ہے۔ تو ان دونوں حالتوں میں مہمان کے لیے جائز ہے کہ پوچھ لے۔

حلال کھیل اور حرام کھیل کا بیان

سوال ان اشعار کا کیا حکم ہے کہ جن کے ساتھ دف بجایا جاتا ہے؟

[فتاویٰ الامارات:١٦]

جواب ان اشعار کو آج کل اسلامی نظمیں کہا جاتا ہے۔اسلام میں دینی نظمیں نہیں پائی جاتی۔ بلکہ اسلام میں شعر کا وجود ہے۔ نبی علیہ السلام فرماتے ہیں:

((ان من الشعر لحکمة))

کہ بے شک اشعار میں کچھ حکمت بھرے ہوتے ہیں۔ اگر ہم اشعار پڑھیں اور انہیں دینی نظمیں کہیں تو اسے ہمارے سلف صالحین نہیں جانتے۔خصوصاً جب اس کے ساتھ ساتھ بعض موسیقی آلات بھی ان کے ساتھ مل جائیں دف وغیرہ۔

تو اس کا خلاصہ یہ ہے۔یہاں دینی نظمیں نہیں ہے بلکہ دینی اشعار ہوتے ہیں کہ جو باریک مبنی والمعنیٰ رکھتے ہیں۔ تو جائز ہے کہ ایسے اشعار پڑھیں جائیں' انفرادی چاہے اجتماعی طور پر جیسے شادی وغیرہ کے موقعہ پر۔ جس طرح کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ وہ انصار کی کسی شادی سے آئی تو نبی علیہ السلام نے ان سے پوچھا کہ:

کہ کیا تم نے ان کی شادی میں اشعار پڑھے؟ کیونکہ انصار اسے بہت پسند کرتے ہیں۔عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اے اللہ کے رسول! ہم کیا کہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کہتے: ہم تمہارے پاس' ہم تمہارے پاس آئے' تم ہمیں سلام کرو' تحفہ دو' ہم تمہیں سلام کریں تحفہ دیں اور سرمائی رنگ کی گندم نہ ہوتی' تو تمہاری دوشیزائیں موٹی نہ ہوتیں۔ یہ شعر ہے لیکن دینی شعر نہیں ہے بلکہ دل کو خوش کرنے والا ایک جائز کلام ہے۔

سوال شطرنج وتاش اور نردو غیرہ ان کھیلوں کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ الامارات:٦٣]

جواب تاش کا کھیل کفار کا کھیل ہے کہ جنھوں نے اپنے عقیدے خراب کر رکھے ہیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔تو ان اوراق کے ساتھ اگرچہ جوئے کے بغیر کھیلا جائے تو بھی کم ازکم یہ مکروہ سے خالی نہیں ہے کیونکہ اس کھیل میں تصویروں کا استعمال ہے اوران پہ جھکنا وغیرہ ۔حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے کہ نبی علیہ السلام کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے وہ لوگ شطرنج کھیل رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ مورتیاں ہیں کہ جن کے آگے تم جھکے ہو؟

کیونکہ شطرنج میں بالفعل تصویریں ہیں ۔مثلاً گھوڑے وغیرہ کی اور تاش کھیلنا بھی عقل پر قائم ہے۔باقی جو نرد ہے اس کی حرمت کے لیے صریح نص موجود ہے۔''صحیح مسلم'' میں حدیث ہے۔

((الذی یلعب بالنردمثلہ کمثل الذی یغمس یدہ فی لحم خنزیر ودمہ))

کہ جو شخص نرد کھیلتا ہے گویا کہ اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت وخون میں لت پت کر کے آتا ہے۔ جو چیزیں عقل پر ان کی بنیاد ہے ان کا حکم شطرنج کا حکم ہے۔ہم نصیحت کرتے ہیں کہ جو شخص شطرنج کے کھیل میں ملوث ہوا سے چاہیۓ کہ ان چھوٹی چھوٹی تصویروں کے سر کاٹ دے۔

قاعدہ: یہ ہے کہ جس کھیل میں مورتیاں اور تصویریں ہوں تو اس سے دور رہنا چاہیۓ۔ جس کھیل میں ایسی چیزیں نہ ہوں تو اگر بسا اوقات دل کی خوشی کے لیے کھیلنا چاہے تو کھیل جائز ہے اور اگر مستقل اس میں مشغول رہے اور یہ چیز اس کو نماز سے بھی غافل رکھے' اپنے بچوں سے بھی غافل رکھے ایسی صورت میں اس کا حکم شراب والا حکم ہوگا کہ جو نماز اور ذکر سے روکنے کا باعث بنتا ہے۔

سوال فلموں کی طرح دینی مجالس کی فلم وغیرہ بنانے کا کیا حکم ہے؟

[فتاویٰ الامارات:۱۱۶]

جواب اس طرح کی مثالی طور پر فلمیں بنانا کئی اسباب کی وجہ سے ممنوع ہے۔

پہلا سبب: کہ بے شک یہ کفار کی تقلید ہے۔ کفار کا طریقہ ان کے ہی لائق ہے، مسلمانوں کے لائق نہیں ہے۔ کیونکہ کفار سمجھتے ہیں کہ یہ محرکات اور اسباب ان کی طرف خیر لوٹاتے ہیں۔ تو ان کے پاس ایسی شریعت بھی نہیں ہے جیسی ہمارے پاس ہے۔ الحمدللہ قرآن کی ایک ہی آیت اس طرح کی کئی فلمی سین سے ہمیں کافی ہے۔ وہ ایسی امت ہے کہ ان کے ہاں نہ کوئی چیز حرام ہے نہ حلال ہے۔ تو کیسے ہم ان سے ان کا منہج اور طریقہ لے سکتے ہیں؟ تو اس طرح کے یہ وسائل ان کے لیے حلال ہیں' ہمارے لیے حلال نہیں ہے کیونکہ ہمارے پاس ان سے بہتر چیز موجود ہے جس طرح کہ جابر بن عبداللہ کی حدیث ہے کہ نبی علیہ السلام نے ایک دن عمر کے ہاتھ میں تورات کا صحیفہ دیکھا تو فرمایا یہ کیا ہے؟ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ تورات کا صحیفہ ہے اور میرے لیے یہود میں سے ایک آدمی نے لکھ کر بھیجا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((امتھوکون انتم کما تھوکت الیھود والنصاریٰ؟لو کان موسیٰ حیًا لما وسعہ الااتباعی))

کیا تم اس میں گھسنے والے ہو کہ جس طرح یہود و نصاریٰ گھسے ہیں؟ موسیٰ علیہ السلام اگر زندہ ہوتے تو وہ بھی میری اتباع کرتے۔

دوسرا سبب: اس طرح کے فلم کے سینوں میں جھوٹی بات شامل ہو سکتی ہیں کہ جن کا تاریخ اسلامی اور سیرت سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔

تیسرا سبب: ان فلموں میں کبھی کبھار مردوں کو عورتوں سے مشابہت ہوتی ہے اور کبھی اس کے برعکس اسی طرح کبھی کبھار عورتوں' مردوں کا اس میں اختلاط بھی ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سفر میں جارہے تھے تو ایک درخت کے پاس سے ان کا گزر ہوا تو مشرک اس درخت پر اپنا اسلحہ لٹکایا کرتے تھے۔ تو صحابہ نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے بھی ذات انواط بتائیں کہ جس طرح ان کے لیے بھی ذات انواط ہے۔

تو یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ ان کے لیے ایک بت بنایا جائے کہ جس کی وہ پوجا کریں۔ صحابہ نے نبی علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ ان کے لیے کوئی درخت مختص کیا جائے کہ جس پر وہ اپنا اسلحہ لٹکائیں کہ جس طرح مشرکین کے لیے ہے۔ تو بہر حال نبی علیہ السلام نے لفظی مشابہت کا بھی انکار کیا۔ مسلمانوں کی کفار کے ساتھ مشابہت کی جڑ کاٹ دی۔ پھر کونسی چیز ہے کہ جو کفار کو اس طرح کی فلموں پر ابھارتی ہے؟ کیونکہ ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے کہ جو ان کی روحانی غذا کا سبب بن سکے کہ جس طرح ہمارے پاس روحانی غذا ہے۔ ان وسائل کو ہم ان سے لیں اور استعمال کریں۔ یہ ایک الگ چیز ہے اور اسی طرح گاڑیاں اور جہاز اور دوسری چیزیں ان سے لینا یہ الگ چیز ہے۔ یہ نبی علیہ السلام کے فرمان:

((من تشبه بقوم فهو منهم))

کے تحت داخل نہیں ہے۔ اگر ٹیلی ویژن میں ضروری چیزیں پیش کی جائیں تو یہ وسیلہ جائز ہے اور اگر ٹیلی ویژن پر غیر ضروری چیزیں دکھائی جائیں تو یہ امر مختلف فیہ ہے۔

ہم پر لازم نہیں کہ ہم فرضی واقعات بنا کر اس کے خلاف پیش کریں۔ آج کل تو مثلاً عالم عربی کے اندر ٹیلی ویژن پر بہت ساری اچھی اسلامی چیزیں دکھائی جاتی ہیں اور جو دینی مجلسیں ہوتی ہیں وہ پورے عالم کو دکھائی جاتی ہیں۔ ٹیلی ویژن پر حج کے مناسک دکھائے جائیں لیکن علماء میں سے کسی ایک عالم دین کو منظر پر دکھایا جائے تاکہ لوگ حج کے مناسک سیکھ سکیں بلکہ اس سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ کسی ایک عالم دین کو نماز پڑھتے ہوئے دکھایا جائے تاکہ لوگ صحیح نماز سیکھ سکیں۔

متفرق مسائل

(سوال) یہ ثابت ہے کہ غزوہ حنین کے موقعہ پر مسلمانوں کے منتشر ہونے کے بعد نبی علیہ السلام نے یہ الفاظ کہے "انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب" جبکہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: ﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ﴾[سورۃ یٰس:٦٩] تو ہم ان دونوں باتوں کے درمیان جمع کیسے کر سکتے ہیں؟[فتاوی الامارات:٩]

(جواب) نبی علیہ السلام ایک ان پڑھ شخص تھے تو اتفاقاً ان کی زبان سے ایسے الفاظ ادا ہوئے ہیں تو کیا اب وہ شاعر بن گئے۔ طبعی طور پر وہ اس کے مخالف تھے۔ شاعر تو وہ ہے کہ جو بنا بنا کر کلام پیش کرتا ہے۔

(سوال) آپ علیہ السلام سے ثابت ہے کہ آپ طرفہ اس قول کے ساتھ مثال پیش کرتے۔ ((ویاتیك بالاخبار من لم تزود)) ۔آپ نے یہ بھی فرمایا:((ان تغفرلھم تغفر جما...... وأی عبدلك ماألما))اس سے کیا یہ مراد ہے؟ کہ آپ شعر کہہ رہے ہیں؟[فتاوی المدینہ:٣٤]

(جواب) بلاشبہ اگر نبی علیہ السلام اپنی زبان سے شعر ادا کریں بلکہ اگر نظم جوڑ کر کہیں تب بھی اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ شاعر ہیں کیونکہ شاعر اسم فاعل کا صیغہ ہے کہ جو صفت مشبہ کا معنیٰ دیتا ہے۔ جو مبالغت پر دلالت کرتا ہے۔ جب کوئی شخص کچھ عبارت جوڑے اور وہ شعر بن جائے کہ جس طرح بعض فقہاء کا کلام موجود ہے جبکہ وہ شعر نہیں کہتے۔ لیکن کبھی کبھار اپنے ذہن کو تازہ کرنے کے لیے ان کے منہ سے ایسا کلام جاری ہوتا ہے کہ جو شعر کی مانند ہوتا ہے تو کیا اب اس فقیہ کو بھی آپ شاعر کہیں گے؟ نہیں اسے شاعر نہیں کہا جائے گا۔

شاعر وہ نہیں ہے کہ جس کی زبان سے ایک آدھی بار لفظ جاری ہوں تو وہ شاعر بن جائے لیکن شاعر وہ ہے کہ جس کا غالب کام ہی یہ ہو تو وہ شاعر کہلاتا ہے اور ہمارے اللہ نے ہمارے نبی علیہ السلام کو اس چیز سے صاف رکھا ہے۔

سوال مشت زنی کا کیا حکم ہے؟[فتاوی الامارات:۲۲]

جواب بلاشبہ یہ عادت حرام ہے۔ دو اسباب کی وجہ سے۔

پہلا سبب: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ○الَّذِيْنَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ○وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ○وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُوْنَ○وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ○إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ○ فَمَنِ ابْتَغَى وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ○﴾ [المؤمنون:1تا7]

امام شافعی رحمہ اللہ نے ان آیات سے اس کی حرمت پر استدلال کیا ہے۔

تو ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اپنی شہوت پوری کرنے کے لیے دو راستے بتائے یا تو آزاد عورتوں سے نکاح کر لیں یا پھر لونڈیوں سے فائدہ اٹھائیں۔ پھر فرمایا﴿فَمَنِ ابْتَغَى وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ﴾ یعنی جس نے اس کے علاوہ اور راستہ تلاش کیا اپنی شہوت کو پورا کرنے کے لیے ان دو راستوں کے علاوہ تو وہ شخص ظالم ہوگا۔

دوسرا سبب: طبی لحاظ سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ کام کرنے والے کا انجام بہت برا ہوتا ہے اور اس بری عادت میں صحت کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ خصوصاً جو لوگ صبح و شام مسلسل یہ کام کرتے ہیں۔

نبی علیہ السلام کا فرمان ہے:

((لاضرر ولاضرار))

”نہ نقصان دیں اور نہ نقصان لیں۔“

تو مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ ایسا کام کریں جو اسے خود کو یا اس کی وجہ سے کسی دوسرے کو تکلیف دے۔ یہاں ایک اور چیز ذکر کرنا ضروری ہے کہ جو لوگ مشت زنی کو اپنی پختہ عادت بنالیتے ہیں ان کے بارے میں "اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان صادق آتا ہے۔"

﴿ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ ﴾ [البقرہ:٦١]

"کیا تم گھٹیا چیز بدلے میں لیتے ہو اس کے کہ جو بہتر ہے۔"

اللہ کے نبی ﷺ کا فرمان ہے:

((يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ))

اے نوجوانوں کی جماعت تم میں سے جو شخص شادی کی طاقت رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ شادی کرلے کیونکہ یہ نظر جھکانے کے لیے سب سے زیادہ اچھی چیز ہے اور شرمگاہ کی حفاظت کے لیے سب سے اچھی چیز ہے جو شخص شادی کی طاقت نہیں رکھتا تو اس پر روزے لازم ہیں کیونکہ یہ اس کے لیے ڈھال بن جائیں گے۔

سوال عزل کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ الامارات: ٣١]

جواب عزل کم از کم مکروہ ہے۔ کراہت کا مطلب ہے کہ علماء کے نزدیک جائز ہے کیونکہ کبھی کبھار ایک چیز جائز ہوتی ہے حالانکہ وہ مکروہ ہوتی ہے۔ عزل کے جواز کی دلیل جابر کی حدیث ہے۔ "بخاری و مسلم" میں فرماتے ہیں کہ

((كنا نعزل والقرآن ينزل))

ہم عزل کرتے تھے۔ قرآن نازل ہو رہا ہوتا۔ جابر کے قول کا مطلب ہے کہ ہم ہمیشہ عزل کرتے تھے۔ حالانکہ قرآن میں اس کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ مطلب کہ جائز ہے۔ لیکن ہم نے کہا کہ مکروہ کے ساتھ ساتھ جائز ہے تو یہ کراہت کا حکم کہاں سے آئے گا؟ یہ حکم ہمیں نبی علیہ السلام کے اس فرمان کو جب ملاحظہ کرتے ہیں تو اس سے آتا ہے۔

((تزوجوا الودود الولود فاني مباه بكم الامم يوم القيامة' وفي لفظ'

مکاثربکم الامہ یوم القیامۃ))

''کہ تم زیادہ محبت کرنے والی' بچے جننے والی عورتوں سے شادی کرو۔ بے شک میں قیامت کے دن تم پر فخر کروں گا۔''

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں: ''قیامت کے دن دوسری امتوں سے کثرت میں ہوں گے۔''

تو جو شخص اپنی بیوی سے عزل کرتا ہے تو بلاشبہ وہ اپنے نبی کی اس رغبت کو ثابت نہیں کرتا۔ پھر یہ عزل کرنا یورپ والوں کی تقلید بھی ہے کہ وہ لوگوں' بچوں کی صحیح تربیت پہ اجر ملنے پر بھی ایمان نہیں لاتے۔

اس کی دلیل:

((إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ))

جب آدم کا بیٹا فوت ہو جاتا ہے تو اس کے سب کے سب اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔ سوائے تین کے۔ صدقہ جاریہ یا ایسا علم کہ لوگ جس سے فائدہ اٹھاتے رہیں یا نیک اولاد کہ جو اس کے لیے دعا کرتی رہتی ہے۔ ''بخاری'' میں ایک اور حدیث ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی:

((مامن مسلمین یموت لهما ثلاثة من الو الدلالن تمسه النار الاتحلة القسم))

''کہ کوئی بھی دو مسلمان کہ جن کے تین بچے فوت ہو جاتے ہیں تو ان کو قیامت کے دن عذاب نہیں ہوگا مگر صرف قسم حلال کرنے کے برابر۔''

تو کیا کفار کو اس طرح کی فضیلت حاصل ہے کہ جو ہمیں حاصل ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ بیوی کے بچوں کی تعداد ضرورت کی وجہ سے محدود کی جا سکتی ہے لیکن کسی ماہر مسلمان ڈاکٹر کے مشورے سے۔

سوال حجاج بن یوسف کے بارے میں درست بات کیا ہے؟ کیا وہ کافر ہے؟

[فتاوی المدینہ: ١٤]

جواب ہم اگرچہ اس بات کے عینی گواہ ہیں کہ حجاج واقعی ظالم تھا، لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس نے دین کی کسی معروف بات کا انکار کیا ہو تو صرف اس کے ظلم کی وجہ سے ہم اسے کافر قرار نہیں دے سکتے۔ اگرچہ اس نے بڑے بڑے نیک مسلمانوں کو شہید کیا تھا۔

سوال لوگوں میں عادت پائی جاتی ہے کہ جس کے ہاں بچہ پیدا ہو تو لوگ اس بچے کے لیے بہت سارے تحفے دیتے ہیں مثلاً سونے کے ہار وغیرہ تو کیا اس بچے کے ماں باپ کے لیے ان میں تصرف کرنا جائز ہے؟ [فتاوی الامارات: ٢٠]

جواب اگر ان تحفوں میں تصرف سے مقصود بچے کو فائدہ دینا ہو تو پھر تو بلاشبہ جائز ہے۔ اور اگر ان سے مقصود بچے کے لیے زیور بنانا مقصود ہو تو اس کی وضاحت میں نے اپنی کتاب ''آداب الزفاف فی السنة المھرة'' میں کر دی ہے۔

سوال کیا کوئی شخص قرآن اپنی جیب میں رکھ کر باتھ روم میں جا سکتا ہے؟ جبکہ اسے یہ معلوم ہے کہ اگر باہر رکھے گا تو وہ بھول جائے گا یا قرآن گم ہو جائے گا؟

[فتاوی المدینہ: ٦٥]

جواب جو شخص باتھ روم میں داخل ہو اور اس کی جیب میں قرآن ہو تو وہ گناہ گار نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ قرآن اس وقت کھلا ہوا نہیں ہے بلکہ اس کی جیب میں ہے۔ اس شخص کے درمیان کہ جو باتھ روم میں داخل ہو اور اس کی جیب میں قرآن ہو اس کے درمیان اور وہ شخص کہ جسے پورا قرآن یاد ہو لیکن مصحف اس کے پاس نہ کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ معنوی چیزیں ہیں اور فاصلہ یہ ہے قرآن کریم کا احترام ظاہر ہوتا ہے یا اس کے برخلاف۔

اگر کوئی انسان باتھ روم میں داخل ہو اور اس کی جیب میں قرآن ہو تو وہ قرآن

احترام والا ہے۔ اگر قرآن کھلا ہوا اس لحاظ سے وہ محترم نہیں ہے تو یہ وہ فضول کام ہے کہ جو منع ہے۔

سوال کیا مسجد میں اذان دینے پہ اجرت لینا جائز ہے؟ اور اسی طرح مدارس ومساجد میں حدیث پڑھانے پر اجرت لینا درست ہے؟ [فتاویٰ المدینہ: ۳۱]

جواب عبادات میں سے کسی عبادت پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ چاہے قرآن پڑھانا ہو یا حدیث بیان کرنا ہو یا اذان دینا ہو۔ یہاں ایک اور نکتہ ہے جس پر طلباء کا متنبہ ہونا ضروری ہے۔ بعض لوگوں کو جو اجرت دی جاتی ہے یہ ان دینی واجبات کی ادائیگی کی وجہ سے صرف نہیں دیا جاتا۔ یہ ضروری نہیں کہ لینے والا یہ سمجھ کرلے یہ اس عبادت کے بجالانے کی وجہ سے اس کو دیا جارہا ہے۔ ورنہ وہ گناہ میں واقع ہو جائے گا۔ لاشعوری طور پہ ''مسند احمد'' میں عثمان بن ابی العاص ثقفی کو جب نبی علیہ السلام نے اپنی قوم بنو ثقیف کے طرف بھیجا تو فرمایا:

((انت امامهم و اقتدباضعفهم و اتخذموذناً لایاخذه علی اذانه اجراً))

''تو ان کا امام ہے۔ ان کے کمزور کی اقتدا کر اور ایسا موذن رکھ کہ جو اپنی اذان پر اجرت نہ لیتا ہو۔''

تو اجرت کو عبادت کے بدلہ میں لینا جائز نہیں ہے لیکن اگر ایسے موذن کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کر دیا جائے تو وہ لے سکتا ہے لیکن اذان کے بدلہ میں تنخواہ کا نام دے کر نہ لے۔ تو جس طرح ایک شخص گھڑی بناتا ہے۔ اگر گھڑی بنوانے والا اسے اجرت نہ دے تو وہ فیصلہ حاکم کے پاس لے جاتے ہیں کیونکہ اس کا حق ہے لیکن اگر ایک شخص کچھ عرصہ کے لیے مسجد میں اذان دیتا ہو تو وہ اس تنخواہ کی وصولی کا تقاضا نہیں کرسکتا۔ اذان کے بدلے میں۔

سوال ایک کافر آدمی اسلام قبول کرنے کا شوق رکھتا ہے تو قرآن پڑھنا چاہتا ہے۔ کیا اسے قرآن ہدیہ میں دینا جائز ہے؟ [فتاویٰ الامارات: ۷۶]

جواب یہ جائز ہے کہ جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ یہ قرآن کی بے حرمتی نہیں کرے گا۔ تو اگر ہم ان پہ اپنے رب کی کتاب پیش کرنا حرام سمجھیں گے تو پھر اسلام کی طرف ان کو کیسے بلائیں گے؟ ''صحیحین'' میں نبی علیہ السلام نے کفار کے ملکوں کی طرف قرآن لے کر سفر کرنے سے منع کیا ہے۔ ''مسلم'' کے الفاظ یوں ہیں۔

((لاتسا فروابالمصحف الی الارض العدو مخافة ان يناله العدو))

کہ تم سفر نہ کرو قرآن کے ساتھ کفار کی زمین کی طرف اس خوف سے کہ کہیں وہ دشمن قرآن تم سے چھین نہ لے۔ اصول فقہ سے یہ چیز ثابت ہے کہ کتاب وسنت کے مفہوم مخالف کی دلالت ایسے ہی جیسے منطوق کی دلالت ہے۔ ہاں اگر وہ مفہوم مخالف منطوق کے معارض نہ ہو تو ایسی صورت میں منطوق کی دلالت مفہوم پر راجح سمجھی جائے گی۔ ''مخافة ان يناله العدو'' اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ دشمن کی طرف سے بے حرمتی کا خوف نہ ہو تو پھر مسلمانوں کو قرآن لے جانا منع نہیں ہے۔ مفہوم سے حجیت پکڑنے کی دلیل: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا﴾ [النساء: 101]

''جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر گناہ نہیں ہے کہ تم نماز میں قصر کرو اگر تمہیں ڈر ہو کہ تمہیں وہ لوگ فتنے میں نہ ڈال دیں جنہوں نے کفر کیا بے شک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔''

﴿ان خفتم ان يفتنكم الذين كفروا﴾

یہ شرط ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ ''اگر بغیر قصر کرو گے تو تمہیں گناہ ہوگا۔''

تو یہ چیز بعض صحابہ کو کھٹکی جب انہوں نے یہ آیت سنی تو نبی علیہ السلام سے انہوں نے پوچھا کیا ہم حالت امن میں قصر کر سکتے ہیں؟ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((صدقة تصدق الله بها عليكم فاقبلوا صدقة))

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر صدقہ ہے تو تم اللہ کے اس صدقہ کو قبول کرو۔

تو اس شخص کو نبی اکرم ﷺ نے غلط قرار نہیں دیا اور نہ ہی یہ کہا کہ تم مفہوم مخالف سے دلیل پکڑتے ہو۔ مفہوم مخالف حجت نہیں ہے، بلکہ نبی اکرم ﷺ اس کا سوال سن کر خاموش رہے، پھر اس کا اشکال آپ نے زائل کیا اس فرمان کے ساتھ ''صدقة تصدق......'' اس روایت کے حوالہ سے ایک اور روایت یہ بھی آتی ہے ''کہ تابعین میں سے ایک شخص نے کہا کہ اگر میں نبی اکرم ﷺ کو پالیتا تو ان سے سوال کرتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کس چیز کے بارے میں؟ تو انہوں نے کہا کہ'' فلاجناح عليكم......'' اس آیت کے بارے میں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ جس کے بارے میں تم سوال کرنا چاہ رہے ہو اس کے بارے میں میں نے نبی علیہ السلام سے سوال کیا تھا تو آپ نے مجھے یہ جواب دیا ''صدقة تصدق......'' الحدیث۔

سوال بعض علماء یورپ کے چاند پر چڑھنے کا انکار کرتے ہیں اور زمین گھومتی ہے اس کا بھی انکار کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کے اردگرد گھومتی ہے۔ تو ان کے قول کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ [فتاویٰ المدینہ:٩٩]

جواب چاند پر یورپ والوں کا چڑھنا یہ اب حقیقت بن چکا ہے اس میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ زمین گھومتی ہے اور اپنے ہی اردگرد گھومتی ہے۔ اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كل في فلك يسبحون﴾

ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں گھوم رہا ہے۔ تو ہر ایک سے مراد زمین چاند اور سورج ان میں ہر ایک گھوم رہا ہے۔

یہ مسئلہ قدیم علماء کے سامنے پیش نہیں آیا۔ کیونکہ اس کا تعلق فلکیات کے ساتھ ہے کہ جس کا شرعی مسائل کے ساتھ واسطہ نہیں پڑتا۔ تو ہر شخص جو سمجھتا ہے وہ اس کے

نزدیک راجح ہوگا۔ بلاشبہ اگرچہ متقدمین علماء میں سے ابن قیم وغیرہ سے یہ بات ثابت ہے کہ زمین گھومتی ہے۔

سوال ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے آزمائش میں ڈال دیا کہ اس کا بوڑھا والد ہے لیکن وہ گناہوں سے نہیں بچتا مثلاً گانے سننا' ناچ گانے کرنے والی عورتوں کو دیکھنا اور صحابہ کی شان میں بہکی بہکی سی باتیں کرنا' ان چیزوں میں ملوث ہے اور اگر وہ اسے نصیحت کرے تو سنتا ہی نہیں بلکہ غصہ ہو جاتا ہے تو کیا جب وہ غصہ ہوتا ہے تو اس کے اس بیٹے پر گناہ ہے کہ جب اس سے ایسے کام سرزد ہوں کہ جو شرع کے منافی ہوں؟

[فتاویٰ المدینہ: ۱۲۵]

جواب بیٹے کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے والد کو ناراض کرے، بلکہ وہ صرف ان کو نصیحت کر سکتا ہے۔ کیونکہ نصیحت کرنا اس پر واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا......﴾ [الاسراء: ۲۳]

اصول حدیث، علل حدیث اور اسماء رجال کا بیان

اولا: اصول حدیث:

سوال صحیح حدیث کے بارے میں اہل علم کا کیا مؤقف ہے؟[فتاوی المدینه:۲۷]

جواب اس کے بارے میں وہی قاعدہ ہے کہ جو امام شافعی نے بیان کیا ہے ''صحیح حدیث ذاتی طور حجت ہے' اہل علم کا اس پہ عمل کرنا شرط نہیں ہے تو جب کسی اہل علم کو کوئی صحیح حدیث مل جائے تو ان پر لازم ہے کہ وہ اس پہ عمل کریں۔

خبر واحد عقائد میں بھی حجت ہے:

سوال کیا خبر واحد سے عقیدہ میں بھی دلیل و حجت بنائی جاسکتی ہے؟

جواب سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''اہل یمن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آ کر عرض کی: ہمارے ساتھ کوئی ایسا شخص بھیجیں جو ہمیں اسلام اور سنت کی تعلیم دے۔'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھام کر ارشاد فرمایا:

((هذا امين هذا الامة۔ يعني اباعبيدة))

''یہ (یعنی ابوعبیدہ) اس امت کا امین ہے۔''[الصحیحه:۱۹۲٤]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خبر واحد عقائد میں بھی حجت ہے۔ جیسا کہ دیگر احکام میں ہے۔ اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو صرف احکام سکھلانے نہیں بھیجا' بلکہ عقائد بھی سکھانے بھیجا تھا۔

اگر خبر واحد عقیدے میں علم شرعی کا فائدہ نہیں دیتی اور اسے عقیدے میں حجت نہیں بنایا جاسکتا تو صرف اکیلے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف تعلیم دینے بھیجنے کا کوئی

فائدہ نہیں نظر آتا اور یہ بات شارع سے بعید ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ خبرِ واحد علم کا فائدہ دیتی ہے اور یہی مقصود ہے۔ اس موضوع پر میرے دو رسالے کئی بار طبع ہو چکے ہیں۔ ان کا مطالعہ مفید رہے گا۔ ①

[نظم الفرائد: ۱/۱۸۳]

(سوال) کیا کسی حدیث کو اس بناء پر صحیح قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ تجربہ کے عین مطابق ہے، یا فلاں کو اس کی صحت کا کشف ہوا ہے؟

(جواب) (یہ بات درست نہیں) اگرچہ بعض علماء نے لکھا ہے۔ مثلاً سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت کی گئی ہے کہ ''جب کسی کا جانور بیابان میں گم ہو جائے تو وہ آواز لگائے' اے اللہ کے بندو! اسے میرے لیے روک لو۔ اے اللہ کے بندو! اسے میرے لیے روک لو۔ پس زمین میں جو بھی حاضر ہوگا وہ اسے روک دے گا۔''

یہ روایت ضعیف ہے۔[الضعیفہ: ٦٥٥]

حافظ سخاوی ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اس کی سند ضعیف ہے لیکن امام نووی کا کہنا ہے کہ انہوں نے اور بعض اکابر شیوخ نے اس کا تجربہ کیا ہے۔''

قلت:

عبادات تجربوں سے حاصل نہیں کی جاتی۔ خصوصاً جبکہ معاملہ ایسے غیبی امور سے

① خبرِ واحد عقائد میں حجت ہے۔ اس کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک الگ کتاب کتاب اخبار الآحاد مقرر فرمائی ہے جس میں حجیت خبرِ واحد کے بارے میں بہت سی احادیث ذکر فرمائی ہیں اور پھر آخر میں امام بخاری اپنی صحیح میں کتاب التوحید لائے ہیں اور اسی کتاب میں بھی امام بخاری رحمہ اللہ نے عقیدہ توحید کو کئی خبرِ واحد سے ثابت کیا ہے۔ حتی کہ قیامت کے دن ترازو، میزان کا رکھا جانا، اعمال کا وزن ہونا جو صحیح بخاری کی آخری حدیث بھی ہے جو عقیدہ میزان یوم القیامۃ سے تعلق رکھتی ہے۔ خبرِ واحد ذکر فرمائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ عقائد میں خبرِ واحد حجت ہے کہ جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ثابت ہو جائے۔ واللہ اعلم

(راشد)

متعلق ہو۔لہٰذا تجربہ کی وجہ سے اس حدیث کی تصحیح کی میلان جائز نہیں اور یہ کیسے درست ہوسکتا ہے جبکہ بعض لوگوں نے مشکلات ومصائب میں مردے سے مدد مانگنا جو کہ خالص شرک ہے کی دلیل اس حدیث کو بنایا ہے۔

سب سے عمدہ بات امام الہروی رحمہ اللہ نے "ذم الکلام ٤/٦٨/١" میں فرمائی ہے۔

''امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ ایک دفعہ کسی سفر میں راستہ بھول گئے۔اورانہیں یہ بات پہنچی تھی کہ کوئی بیابان میں راہ بھول گیا تو اس نے سدا لگائی۔

اے اللہ کے بندو!میری مدد کرو' تو اس کی مدد کی گئی۔

ابن مبارک فرماتے ہیں:میں اس کی سند کی تلاش میں لگ گیا۔امام الہروی فرماتے ہیں:

عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ نے ایسی دعا کرنا جائز نہ سمجھا جس کی سند انہیں معلوم نہیں۔

قلت:

اسی طرح اتباع ہوئی ہے۔

اوراس جیسی عمدہ بات امام شوکانی رحمہ اللہ نے "تحفة الذاکرین :ص ١٤٠" میں اس مناسبت سے ارشاد فرمائی کہ:

''سنت فقط تجربہ سے ثابت نہیں ہوتی اور کسی کام کو یہ سوچ کر کرنے والا یہ سنت ہے،اسے بدعتی ہونے سے نہیں بچاسکتا۔''

اورقبولیت دعا سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قبولیت کا سبب بھی رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے(بلکہ) بسا اوقات اللہ تعالیٰ سنت کو ذریعے بنائے بغیر بھی دعا کو قبول کرلیتا ہے کہ وہ ارحم الراحمین ہے اور بسا اوقات قبولیت دعا بتدریج ہوتی ہے۔

اسی طرح بذریعہ کشف بھی تصحیح حدیث درست نہیں۔علامہ شعرانی "المیزان" (١/٢٨) میں موضوع حدیث

((اصحابی کالنجوم' بایھم اقتدیتم'اھتدیتم))

''میرے صحابی ستاروں کی مانند ہیں۔تم ان میں جس کی بھی پیروی کروگے'

ہدایت پاؤ گے۔" [الضعیفہ۔۵۸]

کے متعلق لکھا:

"یہ حدیث اگرچہ محدثین کے ہاں اس پر کلام ہے' اہل کشف کے نزدیک صحیح ہے۔"

تو ان کا یہ قول باطل' فضول ناقابل التفات ہے۔اس لیے کہ بذریعہ کشف حدیث کو صحیح قرار دینا صوفیاء کی ناپسندیدہ بدعت ہے۔اس پر اعتماد بہت سی باطل' بے اصل احادیث کی تصحیح کا باعث بنے گا' جیسے حدیث مذکورہ۔اس لیے کہ کشف اپنی عمدہ حالت میں اگر صحیح ہو تو ایک رائے' سوچ کی مثل ہے' جو غلط اور صحیح ہو سکتی ہے۔

خصوصاً اس وقت جب اس میں خواہشات کا دخل نہ ہو۔

ہم اللہ تعالیٰ سے خواہشات اور اللہ کی ہر ناپسندیدہ چیز سے سلامتی کا سوال کرتے ہیں۔[نظم الفرائد:۱/۱۹۷۔۱۹۵]

سوال حدیث کے بارے میں امام ابوداؤد کے سکوت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا وہ حدیث صحیح ہی ہوتی ہے؟ یا محل نظر ہے یہ بات؟[فتاویٰ المدینہ:٤٤]

جواب امام ابوداؤد کی خاموشی سے آپ یہ حجت نہیں پکڑ سکتے کہ حدیث دلیل پکڑنے کے قابل ہے۔

کیونکہ مکمل استقراء سے یہ بات ہوئی ہے کہ اس اصول کے مطابق امام ابوداؤد نے بہت ساری حدیثوں پر سکوت اختیار کیا ہے لیکن ان کی علت ضعیف ظاہر ہے۔اس لیے امام نووی نے بعض ان احادیث کے متعلق کے جن کے متعلق امام ابوداؤد نے سکوت اختیار کیا ہے فرماتے ہیں کہ: ان کی اسناد ضعیف ہیں۔امام ابوداؤد نے ان سے سکوت اختیار کیا ہے۔ظاہری ضعف کی وجہ سے۔" یہ اس کے باوجود یہ کہ امام نووی امام ابوداؤد پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔تو اس لیے ضروری ہے کہ جو بھی کسی ایسی حدیث پہ واقفیت حاصل کرے امام ابوداؤد اس پر خاموش ہوں۔تو اسے چاہئے کہ وہ اس حدیث کی سند کو اصول حدیث کے قواعد کے مطابق پرکھے' اس لیے امام سیوطی اپنے

”الفیۃ الحدیث“ میں فرماتے ہیں کہ:

((یروی ابو داؤد اقوی ماوجہ' ثم الضعیف اذاغیرہ فقد))

تو امام سیوطی کا سابق قول ان کی طرف سے اعتراف ہے کہ بہت سارے ابواب امام ابوداؤد نے ضعیف احادیث پر باندھے ہیں اور ان کو معذور سمجھا اس لحاظ سے کہ جو انہوں نے پایا اسے انہوں نے قوی سمجھا۔

سوال امام ترمذی کے قول ”حسن صحیح“ ”حسن غریب“ ”ھذا حدیث غریب“ سے کیا مراد ہے؟ [فتاوی المدینہ: ٤٥]

جواب امام ترمذی کا قول ”حسن صحیح“ یہ سب سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ اس قول کی توجیہہ ذکر کرنے میں علماء کا بہت زیادہ اختلاف ہے لیکن اس اختلاف کے باوجود اطمینان کے لائق اس میں میں نے کوئی بھی قول نہیں پایا۔ قابل اعتماد بات یہی ہے کہ یہ امام ترمذی کی ایک اصطلاح کہ جس پر وہ چلے لیکن اس کی وضاحت انہوں نے نہیں کی۔ ”حسن غریب“ پر قول واضح ہے یہ قول ”حدیث حسن“ کے برخلاف ہے، یعنی ”حسن سنداً“ مطلب سند کے اعتبار سے حسن ہے اور غریب اس لحاظ سے ہے کہ اس کے رواۃ میں سے ایک راوی متفرد ہے۔ چاہے ”تفرد مطلق“ ہو یا ”تفرد نسبی“ ہو لیکن اگر کسی حدیث کے بارے میں ”حسن“ کہیں اور حسن کے ساتھ غریب کا لفظ ملا ہوا نہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ یہ حدیث حسن لغیرہ ہے۔ تو طالب علم پر لازم ہے کہ اس نکتہ کے بارے میں متنبہ ہو۔ یعنی جس حدیث کے بارے میں امام ترمذی ”حدیث حسن“ کہے تو اس سے مراد ایسی حدیث کہ جو سنداً ضعیف ہے۔ تو وہ ”حسن“ تب ہوگی کہ جب اس کے لیے متابعات اور شواہد ہوں اور اس کے ساتھ یہ حدیث ضعیف سے حسن کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ کیونکہ اس کا متن ایک اور سند سے آ جاتا ہے اگر صرف ”حدیث غریب“ کہیں تو اکثر ایسی حدیث سنداً ضعیف ہوتی ہیں۔

اس کے مقابلہ میں ایک اور حدیث ہے ”ترمذی (٦٧٧٨) میں

((نبهان مولى ام سلمه عن ام سلمة في قصة ......))

امام ترمذی فرماتے ہیں ''حدیث حسن صحیح'' میں کہتا ہوں کہ بنہان مجہول ہے۔ اس بنہان کو کسی معتبر محدث نے ثقہ نہیں کہا۔حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ ''امام ترمذی کا قول'' حسن غریب'' تو اس کے بارے میں میں نے البانی سے کسی کیسٹ میں سنا فرماتے ہیں کہ اس سے ترمذی کی مراد 'حسن لذالة'' ہے یہ بات اس کے برخلاف ہے کہ جو انہوں نے یہاں کی ہے۔حافظ ابن حجر نے "النکت (٨/٢٠٤)" میں فرمایا'' کہ امام ترمذی کا مقصد یہ ہے کہ جب وہ کسی حدیث کے بارے میں حسن کہیں تو ان کے نزدیک اس حدیث سے دلیل پکڑنا لازمی نہیں ہے انہوں نے ایک حدیث بیان کی ہے۔

خثیمہ البصری عن الحسن عن عمران بن حصین کے طریق سے۔اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

((هذا حديث حسن وليس اسناده بذاك القائم))

تو ظاہر یہ ہوتا ہے کہ حسن کی تعریف سے ان کی مراد ''العلل'' نہیں۔انہوں نے وضاحت کی ہے کہ ایسی چیز کا بیان کہ جو بعض علماء کے نزدیک قابل حجت ہے۔ باوجود یہ کہ اس کی سند میں ضعف ہے کہ جو نبی اکرم ﷺ کی طرف نسبت کرنے میں رکاوٹ ہے۔گویا انہوں نے اس کی تعریف جو معناً صحیح ہے لیکن لفظاً صحیح نہیں ہے۔

بعض علماء نے ایسی حدیث کو قیاس پر مقدم کیا ہے۔امام احمد ایسا کرتے تھے۔ یعنی قیاس پر ضعیف حدیث کو وہ ترجیح دیتے تھے۔تو وہ حدیث ہے کہ جس کی امام ترمذی نے تعریف کی ہے۔گویا امام ترمذی کی مراد یہ نہیں ہے کہ اس حدیث کی نسبت نبی علیہ السلام کی طرف کرنا درست ہو تو انہوں نے بہت ساری احادیث کے بعد''حدیث حسن لیس اسناده بذاك القائم'' انہوں نے کہا ہے۔اس مسئلہ کو ہم نے پوری وضاحت کے ساتھ اپنی کتاب ''الحسن بمجموع الطرق'' میں ذکر کیا ہے کہ جسے یہاں دہرانے کی

ضرورت نہیں ہے۔ امام ترمذی کا یہ قول "هذا حديث غريب" اس سے مراد حدیث کا ضعف ہے کہ جس طرح شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی یہی بات کہی ہے۔

سوال امام ترمذی حدیث کے بارے میں جب "حسن غریب" کہے تو کیا اس حدیث کو ضعیف کی اقسام میں سے شمار کیا جائے گا؟[فتاویٰ المدینہ:۱۰۵]

جواب ایسی حدیث حسن ہوتی ہے اور کبھی کبھار صحیح ہوتی ہے کہ جب انسان کے شواہد اور طرق کی تحقیق کرے۔

سوال "موطا امام مالک" کی بلاغیات کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ المدینہ:۷۱]

جواب بلاغیات کو مطلق طور پر صحیح نہیں کہا جاسکتا' نہ ہی مطلق طور پر سب کو ضعیف کہا جاسکتا۔ بلاشبہ اس میں صحیح بھی ہیں ضعیف بھی ہیں۔ بہر حال اس کا مرجع تحقیق پر ہے اور امام ابن عبدالبر نے اس کی تحقیق کی ہے۔ بلاغیات مالک میں غیر صحیح حدیثیں بھی ہیں۔ مثلاً "انما انسى لاشرع" اس حدیث کی میں نے "سلسله احاديث ضعيفه" میں پوری تخریج کی ہے تو اس حدیث کی اصل نہیں ہے "موطا" میں بغیر سند کے یہ حدیث موجود ہے۔

سوال "بعض حفاظ "هذا حديث جيد" کہتے ہیں اس کا کیا معنیٰ ہے؟

[فتاویٰ المدینہ:۷۲]

جواب میری معلومات کے مطابق حفاظ "جید" اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ جس میں وہ "صحیح اور حسن" کا حکم لگانے کے بارے میں متردد ہوتے ہیں۔ تحقیق کرنے والا ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہے کہ یہ سند صحیح کا احتمال رکھتی ہے لیکن حسن تو یقینی طور پر ہے تو اس کی سند کو "جید" کہہ دیتے ہیں۔

سوال بعض اہل حدیث اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ "جس حدیث میں خفیف ضعف ہو" تو اس پر عمل کرسکتے ہیں۔ آپ کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟

[فتاویٰ المدینہ:۷۳]

جواب پہلی بات: ایسی ضعیف حدیث کہ جس میں ہلکا سا ضعف ہو اس پر عمل کرنے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

دوسری بات: کسی ضعیف حدیث پر عمل کرنا فتویٰ دینے کا مطلب کہ اس میں کوئی نہ کوئی بدعت ضرور شامل ہوگی۔ تو کوئی بھی دعا یا عمل کہ جس کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہ ہو تو اس پر عمل کرنا بدعت ہے اور ہر ضعیف حدیث سے کسی نہ کسی چیز کا مشروع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ تو شریعت سازی تو صرف صحیح حدیث سے ہوسکتی ہے۔ صرف ایک صورت میں ضعیف حدیث پر عمل ہوسکتا ہے کہ جب وہ حدیث اعمال کی فضیلت کے بارے میں ہو۔

لیکن قائل کا یہ کہنا کہ ضعیف حدیث پر فضائل اعمال میں عمل ہوسکتا ہے یہ ایسا کلام ہے کہ اس کا اول آخر کے مخالف ہے اور آخر اول کے مخالف ہے۔ تو ہم اس وقت کہتے ہیں: فضائل اعمال میں ضعیف حدیث۔ تو اس کا عمل کرنا ضعیف حدیث پر یہ حدیث کے ضعف کو ثابت کرتا ہے یا اس کے علاوہ کو......؟

اگر ہم ضعیف حدیث کو ثابت کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ فضائل اعمال کو اس ضعیف حدیث سے ثابت کر رہے ہیں یا کسی اور چیز کے ساتھ؟ اگر ہم اس ضعیف حدیث سے ثابت کرتے تو مطلب یہ کہ ہم نے ایک حکم ضعیف حدیث کے ذریعہ ثابت کیا۔

اور اگر ایک عمل کی فضیلت صحیح حدیث سے بھی ثابت ہو تو ایسی صورت میں عمل ضعیف حدیث پر تو نہیں ہوا کیونکہ ایسی صورت میں ضعیف حدیث کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے بلکہ عمل تو صرف صحیح حدیث پہ ہوگا۔

سوال حدیث میں ''ادراج'' سے کیا مراد ہے؟ [فتاوىٰ المدينه: ٦٩]

جواب ادراج کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث کی عبارت کے اندر نبی علیہ السلام کے کلام کے ساتھ کچھ اور عبارت اس طرح سے مل جائے کہ پتہ نہ چلے کہ یہ صحابی کے الفاظ ہیں یا حدیث ہے۔ اس کی مثال: ''بخاری ومسلم'' میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک مشہور

حدیث ہے۔

((إِنَّ أُمَّتِي يُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرًّا مُحَجَّلِينَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوءِ فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنكُمْ أَنْ يُطِيلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ۔فمن استطاع منكم......))

یہ والی عبارت مدرج ہے۔ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے حدیث نہیں ہے۔

(سوال) کیا علوم الحدیث کے قواعد میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ جو ظنی ہو؟

[فتاویٰ المدینہ:٧٤]

(جواب) حقیقت یہ ہے کہ بعض قواعد قطعی ہیں اور بعض ظنی ہیں لیکن ہمارا یہ قول کہ ظنی ہے۔ اس سے اس حکم کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آتی جس طرح کہ بہت ساری فقہی احکام میں یہ چلتا ہے۔ لیکن بعض فقہی مسائل کا ظنی ہونا اور قطعی نہ ہونا اس کی قدر و قیمت کم نہیں کرتا۔جیسا کہ یہی حالت ہے۔بہت سارے فقہی احکامات میں سے ہے۔لیکن بعض فقہی مسائل ظنی ہیں، قطعی نہیں ہے۔تو اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم ان کو حلال نہ سمجھیں اور ان سے اعراض کریں کہ جس طرح آج کل بہت ساری اسلامی تحریکیں جہالت کی وجہ سے ایسا کرتی ہیں ''حزب التحریر اسلامی'' وغیرہ۔کہ وہ آحاد حدیثوں سے عقیدہ ثابت نہیں کرتے کیونکہ آحاد علم قطعی کا فائدہ نہیں دیتیں بلکہ وہ تو ظنی ہیں۔تو یہ ان کی جہالت اور اصول فقہ و حدیث سے دوری کا نتیجہ ہے کہ وہ صرف ''ظنی'' کلمہ سننے کے ساتھ ہی ان کے دل سکڑ جاتے ہیں باوجود یہ کہ شریعت کے اکثر احکام ظنی طور پر ثابت ہیں۔تو دلیل کا ظنی ہونا یہ مطلب نہیں کہ اب اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے کیونکہ ظنی سے ان کی مراد غالب گمان ہے۔یعنی ایسا گمان کہ اس کے بعد یقین ہی ہے۔

(سوال) شاذ حدیث اور زیادۃ الثقۃ المقبولۃ میں کیا فرق ہے؟[فتاویٰ المدینہ:١٣]

(جواب) یہ چیز حقیقت میں علم حدیث کی باریک بینیوں میں سے ہے کہ جس میں اصول فقہ اور اصول حدیث کے علماء کا آپس میں اختلاف ہے۔تو علماء اصول مطلق طور پر یہ

دعویٰ کرتے ہیں کہ ثقہ کی طرف سے زیادتی قابل قبول ہے۔ چاہے وہ اضافہ اس دوسرے کی طرف سے جو ہو وہ برابر ہو یا اس پر زائد ہو جبکہ وہ اس قاعدہ کو مفردات میں اختیار نہیں کرتے تو اکثر طور پر وہ حدیث کی علت بیان کرتے ہیں کہ ثقہ نے اوثق کی مخالفت کردی تو اس لحاظ سے وہ پھر علماء حدیث کے مؤقف کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ تو شاذ حدیث وہ ہے کہ جسے ثقہ روایت کرنے میں اوثق کے مخالف ہو یا زیادہ تعداد کے مخالف ہو۔ زیادۃ الثقہ یہ ہے وہ اپنے ہم مثل مرتبہ والے سے زائد بیان کرے تو یہ اضافہ مقبول ہے اور اگر اس کے مخالف بیان کرنے والا اسی سے زیادہ ثقہ ہو یا تعداد میں وہ زیادہ ہوں تو اس سے مراد یہ ہوگا کہ یہ حدیث شاذ ہے اور صحیح حدیث کے شرائط میں سے یہ بات ہے کہ صحیح حدیث شذوذ سے محفوظ ہو اور اس پر علماء حدیث کا اجماع ہے۔ تو مطلق طور پر ثقہ کی طرف سے زیادتی قبول ہے یہ بات اس قید کی وجہ سے باطل ہو جائے گی کہ جس پر علماء حدیث کا اجماع ہے۔

سوال ''قواعد علوم الحدیث'' تھانوی کی جو کتاب ہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟[فتاویٰ المدینہ:۹۶]

جواب یہ کتاب حنفی مسلک کے مطابق ہے اصول حدیث کے بارے میں۔

سوال 'امام طبرانی'' ((لم یروعن فلان الافلان تفرد به فلان)) جب کہے تو اس سے ان کی کیا مراد ہوتی ہے؟ کیا ان کی مراد یہ ہے کہ اس حدیث کے لیے اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریق نہیں ہے؟[فتاویٰ المدینہ:۱۲۳]

جواب طبرانی یا کسی اور کے اس طرح کے قول سے یہ مراد نہیں ہے کہ اس حدیث کا دوسرا طریق نہیں ہے۔ بلکہ ان کا یہ قول دوسرے علماء حدیث امام ترمذی وغیرہ کے قول کے مشابہ ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ ''لم یروہ الا فلان'' تو یہ طبرانی اور امام ترمذی کی نسبت سے ان کا قول بھی ہے اور دیگر علماء بھی ایسے کہتے ہیں۔

سوال ابوداؤد پر جو مختصر منذری نے لکھی پھر اس میں ابن قیم کی تعلیقات ہیں تو جن

احادیث پر امام ابوداؤد نے سکوت اختیار کیا پھر اسی طرح منذری اور ابن قیم نے تو کیا اس سکوت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان آئمہ کی خاموشی تحقیق کرنے والے کے لیے باعث اطمینان بن سکے' ان احادیث کے بارے میں یا کم از کم ان احادیث کو حسن کہا جا سکتا ہے کہ نہیں؟[فتاوی المدینہ:٤٧]

جواب بعض تحقیق کرنے والے مطمئن ہو جاتے ہیں۔اگرچہ حدیث حسن درجہ کی ہوتی ہے۔لیکن تنقید ایک ایسا موضوع ہے کہ جو بحث کرنے والے کو صرف ان کی خاموشی کی وجہ سے خاموش رہنے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ حقیقتاً ثابت ہے کہ یہ تینوں آئمہ بسا اوقات حدیث کے بارے میں سکوت اختیار کرتے ہیں لیکن ناقد اس حدیث کو ضعیف کہہ دیتا ہے۔

لیکن ابتدائی بحث کرنے والا مثلاً یا جو شخص تحقیق کی متابعت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اس کے لیے بھی ہے کہ وہ خاموش رہے اور ان پر اعتماد کرے۔ہاں مگر جب اس کے پاس احادیث پر تنقید کرنے کا ملکہ آ جائے تو پھر تنقید کرے۔لیکن شرعی تعلیمات خصوصاً حدیث کا طالب علم کتنے طالب ان لوگوں کی نسبت طاقت رکھتے ہیں کہ وہ انفرادی طور پر بحث کرے کہ جس حدیث کو امام ترمذی حسن کہتے ہیں اس کا نتیجہ ضعف کی صورت میں نکالتے ہیں؟ایسے لوگ بہت تھوڑے ہیں تو پھر جمہور کی پیروی کرنا ضروری ہے۔

سوال جب مجھے حدیث کے راوی صحابی کا نام معلوم ہو اور میں وہ حدیث ''مسند احمد'' سے نکالنا چاہوں تو کس طرح سے نکالوں؟''[فتاوی المدینہ:١٢٨]

جواب ''المعجم المفهرس لا لفاظ الحديث''یا''مفتاح كنوزالسنة'' کی طرف رجوع کرنے سے ممکن ہے کہ آپ نکال لیں۔تو یہ دونوں کتابیں آپ کی رہنمائی کریں گی کہ یہ حدیث کس جگہ وارد ہوئی ہے تو اس وقت آپ کے لیے اس صحابی کی بہت ساری احادیث میں سے اس حدیث کو نکالنا آپ کے لیے آسان ہو جائے گا۔

رواۃ کے حالات کی پہچان

جرح وتعدیل کے قواعد:

سوال ایک راوی پر اگر اسماء رجال کی کتابوں میں توثیق پر اختلاف ہو تو ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ اس راوی کی کیا حالت ہے؟[فتاویٰ المدینہ: ٤٦]

جواب یہ چیز ہم "مصطلح الحدیث" کے قانون سے پہچانیں گے۔ مثلاً بہت ساری علمی اور اصولی قواعد ہیں۔

① "من حفظ حجة على من لم يحفظ" کہ جس کو ایک چیز یاد ہے یہ اس پر حجت ہے کہ جسے یاد نہیں ہے۔

② "من علم حجة على من لم يعلم" جس کو ایک چیز معلوم ہے یہ اس پر حجت ہے کہ جس کو معلوم نہیں ہے کہ ایک نے ایک شخص کے ثقہ ہونے کو ثابت کیا۔ دوسرے نے ثابت نہیں کیا تو اس کا مطلب ہے کہ دوسرے کو ایک چیز معلوم ہے کہ جو پہلے والے کو معلوم نہیں ہے۔

③ جرح مقدم ہے تعدیل پر لیکن یہ اصول مطلق نہیں ہے بلکہ علت کے بیان کرنے کے ساتھ ہے لیکن یہ بھی مطلق طور پر نہیں کیونکہ بسا اوقات وہ علت بیان کرتا ہے لیکن وہ علت قادمہ نہیں ہوتی تو ہم کہیں گے کہ ایسی علت بیان کرے کہ جو قادحہ ہو۔

تو علمی قواعد کی طرف رجوع سے ایک طالب علم جان سکتا ہے اور وہ ہر ایک کے تراجم دیکھ کر خلاصہ نکال سکتا ہے۔

سوال جب حدیث کی سند میں ایک ایسا راوی ہو کہ: "رجل صدوق يهم' صدوق يخطئ ، صدوق سيئ الحفظ" اس کے بارے میں کہا جاتا ہو اس کی حدیث

کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ المدینہ:۷۹]

جواب ایسے راوی کی حدیث ہے لیکن اس میں حسن کا احتمال ہے۔

بسا اوقات ایسے راوی کی حدیث کو بعض لوگ حسن کہہ دیتے ہیں کہ جو بالضبط اس عبارت سے واقف نہیں ہوتے بلکہ ایسے راوی کہ تفصیل کی طرف رجوع کیا جائے گا تو اس وقت ممکن ہے کہ اس کی حدیث حسن ہونے کے لائق ہو لیکن اس کی حدیث کا حسن ہونا بھی بہت مشکل ہے۔

سوال کیا ''متھم بالکذب'' کو متروک کہا جائے گا اور امام بخاری کے ''منکر الحدیث'' سے کیا مراد ہے؟ اور ایسی حدیث کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ المدینہ:۹۰]

جواب جی ہاں جو راوی ''متھم بالکذب'' ہوگا اسے متروک کہا جائے گا۔ امام بخاری کے منکر الحدیث سے مراد شدید ضعیف اور اس کا حکم یہ ہے کہ ایسی حدیث ضعیف ہوتی ہے۔

سوال عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے جو حدیث آئے اس کا کیا حکم ہے؟

[فتاویٰ المدینہ:۹۱]

جواب یہ سلسلہ حسن ہے قابل حجت ہے۔

سوال حافظ طبرانی نے ''معجم الصغیر'' میں ایک حدیث لانے کے بعد اس کی سند یوں ذکر کی۔((حدثنا عبداللہ بن محمدبن جمعة الدمشقي حدثنا العباس بن الولیدبن مزید اخبرني ابی حدثنا ابن لھیعة)) پھر اس کے بعد باقی سند لائے۔ پھر فرمانے لگے کہ یزید بن ابی حبیب سے صرف ابن لہیعہ نے روایت کیا ہے اور ولید بن یزید ان لوگوں میں سے ہیں کہ جنہوں نے ابن لہیعہ سے کتابیں جلنے سے پہلے حدیث سنی تھی......'' سوال یہ ہے کہ ابن لہیعہ کے ترجمہ میں اکثر محدثین نے یہ لکھا کہ اس کی کتابیں جل گئی ہیں۔ جلنے سے پہلے صرف عبادلہ ثلاثہ کا اس سے سماع ثابت ہے۔

سوال تو کیا ہم امام طبرانی کے اس قول کو قبول کریں؟[فتاویٰ المدینہ:۱۲٤]

(جواب) ہم ایک تحفظ کی بنیاد پر ان کے قول کو قبول کریں گے کیونکہ ممکن ہے کہ ان سے یہ بات وہم کی وجہ سے نکل گئی ہو۔ واللہ اعلم

(سوال) ''مجمع'' میں امام ہیثمی جب ''رجاله رجال الصحيح'' کہتے ہیں تو اس کا کیا مطلب ہے؟

(جواب) اس کتاب کی اہمیت سنن اربعہ کی طرح ہے کیونکہ اس میں کتب ستہ کی احادیث جمع ہیں اور کتب ستہ کی احادیث کے زیادت بھی اس میں جمع ہیں۔ جو احادیث ہیثمی نے اپنی کتاب ''مجمع'' میں جمع کی ہیں۔ اگر ان احادیث کو جمع کرتے اور ان پر کلام نہ کرتے تو ان احادیث کی حالت سنن اربعہ کی طرح ہوتی کہ ان میں صحیح حسن اور ضعیف موضوع سب جمع ہوتیں۔ جی ہاں! یہاں سنن اربعہ کی احادیث اور کتب ستہ کی احادیث کہ جن کو امام ہیثمی نے جمع کیا ہے بہت فرق ہے۔ اگر ان پر کلام نہ کرتے اور فرق یہ ہے کہ سنن اربعہ کے مصنفین نے بہت ساری احادیث کے بارے میں صحیح اور ضعیف کے لحاظ سے کلام کیا ہے اور سب سے زیادہ کلام کرنے والے امام ترمذی ہیں وہ شاید ہی کسی حدیث پر خاموش رہے ہوں۔

حافظ ہیثمی نے ''المجمع'' میں احادیث جمع کیں ان پر کلام بھی کیا ہے لیکن اکثر مقامات پر ان کا کلام کافی نہیں ہے کیونکہ وہ بہت کم حدیث کے درجہ کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں اور غالب اکثر طور پر حدیث ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اسے احمد نے روایت کیا ہے یا طبرانی نے روایت کیا ہے۔ ''رجاله رجال الصحيح'' اس عبارت سے یہ مراد نہیں ہے کہ سند صحیح ہے بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ اس سند میں شروط الصحۃ جمع ہیں اور اس کے رواۃ صحیح کے رواۃ ہیں۔ بس یہ ایک صحت کے شروط میں سے صرف اس شرط کا لحاظ رکھتے ہیں 'بقایا' کا نہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ حدیث صحیح ہے یا حسن ہے۔ بہت کم کہتے ہیں بس اکثر ''رجاله رجال الصحيح'' کہتے ہیں۔ یا ''رجاله ثقات'' یا اور ''رجاله ثقات الافلان ففيه كلام۔'' تو ان میں سے بعض نے اس کی

توثیق کی اور بعض نے ضعیف کہا۔

اور کبھی کبھار کسی راوی کے مال کے بارے میں قطعی حکم لگاتے ہیں' یہ راوی متکلم فیہ ہے یا ضعیف ہے' یا راجح۔ یہ ہے کہ یہ ثقہ ہے۔

وہ کتب جو کتب ستہ سے زائد ہیں وہ یہ ہیں۔ ① مسند احمد۔ ② مسند ابی یعلی۔ ③ مسند بزار۔ ④ معجم طبرانی کبیر۔ ⑤ اوسط۔ ⑥ صغیر۔ ان کتابوں سے وہ حدیثیں انہوں نے لی ہیں کہ جو کتب ستہ یعنی ''صحیحین اور سنن اربعہ میں نہیں تھیں۔''

احادیث کے علل اور روایات پر نقد کا بیان

سوال کیا ''صحیح بخاری و مسلم'' میں ضعیف احادیث ہیں؟[فتاویٰ الامارات:۱۱۳]

جواب یہ معاملہ ایسے ہے کہ جیسے امام شافعی فرماتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انکار کیا مگر اپنی کتاب پوری کرے۔امام بخاری و مسلم نے احتیاط کے ساتھ احادیث جمع کیں اور صرف وہ احادیث جمع کیں' اپنی کتابوں میں جو ان کے نزدیک صحیح تھیں۔ یہاں تک کہ امام بخاری کے بارے میں آتا ہے کہ انہیں چھ لاکھ احادیث یاد تھیں' ان میں سے دولاکھ احادیث صحیح تھیں لیکن پھر ان میں سے چن کر صرف آٹھ ہزار احادیث انہوں نے اپنی صحیح میں ذکر کی ہیں۔ اس لیے آج تک ان دونوں کتابوں جیسی صاف کتاب نہیں پائی گئی۔ اگرچہ غلطی سے معصوم صرف وصرف انبیاء ہیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ بخاری میں ایک صرف ایک جملہ بھی غلط نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد بھی نہیں ہے کہ بخاری و مسلم کی احادیث اس وجہ سے قابل احتجاج نہیں ہیں۔

سوال ((إِنَّ الْمَرْأَةَ إِذَا بَلَغَتِ الْمَحِيضَ لَمْ تَصْلُحْ أَنْ يُرَى مِنْهَا إِلَّا هَذَا وَهَذَا وَأَشَارَ إِلَى وَجْهِهِ وَكَفَّيْهِ)) اسماء کی حدیث ہے ۔اس کی صحت کیسی ہے؟ صحیح ہے یا کہ ضعیف؟[فتاویٰ المدینہ:۱۱]

جواب یہ حدیث ہمارے نزدیک تمام طرق کے مجموعہ کی وجہ سے حسن درجہ کی ہے، باوجودیکہ بعض صحابیات کا عمل اس کے مطابق تھا۔ ''سنن بیہقی'' میں اسماء کی ہی ایک حدیث آئی ہے۔ ایک دوسرے طریق سے ۔پہلے طریق کے علاوہ کہ ضعیف منقطع ہے۔ اس کی سند کے تمام رواۃ ثقہ ہیں۔ابن لہیعہ کے علاوہ۔ ابن لہیعہ کے بارے میں معروف ہے کہ وہ صدوق ہے اور یہ اپنے حافظے کی وجہ سے ضعیف

ہے۔کتابیں جل جانے کے بعد۔بہت سارے علماء ہیثمی وغیرہ کی طرح کے اکثر اوقات اس کی حدیث ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے۔کبھی کبھی ابن لہیعہ کی حدیث کو حسن لذاتہ قرار دیتے ہیں ۔اگرچہ ہماری یہ رائے نہیں لیکن یہ بات استشہاد کے قابل ہے۔

(سوال) کیا ''طلع البدر علینا'' ثابت ہے؟

(جواب) عبداللہ بن محمد بن عائشہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو عورتوں' بچوں اور بچیوں نے یہ کہا:

طلع البدر علینا......من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا......مادعا للہ داع

یہ ثابت نہیں بلکہ ضعیف ہے۔تفصیل[الضعیفہ ۵۹۸]

اس حوالہ سے مزید وضاحت حسب ذیل ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : جیسا کہ (تاریخ ابن کثیر ۵/۲۳) میں لکھا ہے۔ علماء بیان کرتے ہیں کہ:

''نبی اکرم ﷺ کے مکہ سے تشریف لاتے ہوئے (یہ قصیدہ پڑھا گیا) تا کہ اس وقت جب آپ ثنیات الوداع مقام کی طرف سے مدینہ تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے۔''

اسی بات کو امام ابن الجوزی رحمہ اللہ نے ''تلبیس ابلیس 'ص ۲۵۱'' پر جزم سے بیان کیا ہے لیکن محقق ابن القیم رحمہ اللہ ''زاد المعاد ۳/۱۳'' میں اس کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ ظاہری نظر آنے والا وہم ہے' اس لیے کہ ''ثنیات الوداع'' شام کی سمت ہے جسے مکہ سے مدینہ آنے والا دیکھ سکتا ہے۔ نہ ہی اس کے پاس سے گزر سکتا ہے' جب تک کہ وہ شام کی طرف رخ نہ کرے۔''

اس کے باوجود اس تحقیق کے لوگ ہمیشہ اس کے خلاف رہے ہیں اور یہ واقعہ بھی ثابت نہیں۔

تنبیہ: امام غزالی نے اس واقعہ میں یہ بات زائد بیان کی ہے کہ وہ عورتیں، بچے، بچیاں، یہ قصیدہ دف بجاتے ہوئے 'ترنم سے گا رہی تھیں۔

علامہ عراقی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''اس قصیدے میں دف اور ترنم کا ذکر نہیں ہے۔''

اور اس کی وجہ سے بعض لوگ اس قصہ کو بیان کرتے ہوئے نبوی اشعار کے جواز پر استدلال کرتے ہوئے دھوکے میں مبتلا ہوگئے ہیں۔پس انہیں کہا جائے گا کہ ''پہلے عرش ثابت کرنا' پھر نقش ونگار'' اور اگر یہ قصہ ثابت بھی ہو جائے تو بھی ان کا مدعیٰ ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ (الضعیفه : ٥٨٩)میں تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

[نظم الفرائد:١/١٦٨-١٦٧]

(سوال) بعض علماء کرام ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو ضعیف کہتے ہیں ''انه قال ان موسیٰ لطم عین ملك الموت ففقأ ها'' اس بات کا ہم رد کیسے کر سکتے ہیں؟ جبکہ یہ بات بھی معلوم ہے کہ یہ حدیث اسرائیلیات میں سے ہے؟ تو ایک نبی کے لیے کیسے جائز ہے۔موت کے فرشتہ کو مارے جبکہ معلوم ہے کہ یہ ملک الموت ہے؟

[فتاویٰ الامارات:١١٢]

(جواب) یہ حدیث بخاری ومسلم نے اپنی صحیحین میں لائے ہیں۔

کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔

((ان النبی صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قال جاء ملك الموت الی موسیٰ فقال له اجب ربك ؟فما كان من موسیٰ الاان لطمه ففقاء عينه فرجع ملك الموت الی ربه فقال یارب ارسلتنی الی عبدیکره الموت فقال الله له اعدالیه وقل له ان ربك يقول لك:ضع یدك علی جلد ثور فلك

من السنين بعد كل الشعرات التي تكون تحت اصابعك فرجع ملك الموت الى موسىٰ وقال له ماامره به ربه فقال موسىٰ وما ذابعد ذالك؟قال الموت قال فالان فقبض ملك الموت روح موسىٰ في تلك اللحظة))

نبی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس موت کا فرشتہ آیا کہنے لگا اپنے رب کا حکم قبول کر تو موسیٰ علیہ السلام نے تھپڑ مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دی۔فرشتہ رب کے پاس چلا گیا۔کہنے لگا اللہ آپ نے مجھے ایسے بندے کی طرف بھیجا کہ جو موت کو ناپسند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا دوبارہ اس کی طرف لوٹ جا اور اس سے کہہ بے شک تیرے رب نے تیرے لیے یہ کہا ہے کہ اپنا ہاتھ کسی بیل کی پیٹھ پر رکھ تو جتنے بال تیرے ہاتھ کے نیچے ہوں گے اتنے سال زندہ رہے گا۔تو ملک الموت موسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹ کر آیا اور وہی پیغام دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے اس کے رب نے کہا۔موسیٰ علیہ السلام فرمانے لگے۔اس کے بعد کیا ہوگا؟ تو کہنے لگے اس کے بعد موت تو کہنے لگے اب (روح قبض کر لے) تو ملک الموت نے اسی وقت ان کی روح قبض کی۔

تو یہ حدیث ہے جس نے اس حدیث کو ضعیف کہا۔وہ خود ضعیف ہے کیونکہ اس نے علم کے بغیر بات کی اور میں سمجھتا ہوں کہ ضعیف انہوں نے کہا ہوگا کہ جو حدیث کو اپنی عقل کے مطابق پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں اگر عقل کے مطابق ہو تو صحیح ہے۔اگر عقل کے خلاف ہو تو ضعیف کیونکہ بہت سارے لوگوں کا ایمان کمزور ہے۔باوجود یہ کہ وہ اپنے آپ کو دین کی طرف منسوب کرتے ہیں تو ہر وہ حدیث کہ جو بخاری و مسلم میں ہے اس پر علماء حدیث میں سے کسی نے نقد نہیں کیا تو یہ حدیث بھی یقیناً ثابت ہے۔

سوال اس میں اشکال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ملک الموت کو کیسے مارا؟

جواب ''مسند امام احمد'' میں صحیح سند کے ساتھ ایک حدیث آتی ہے۔

((كان الملك ياتي الناس على صورة البشر))

کہ فرشتہ لوگوں کے پاس انسانی شکل وصورت میں آتا تھا۔ تو ملک الموت نے جب موسیٰ علیہ السلام کو آ کر کہا کہ "اجب ربك" تو اس وقت اپنے ساتھ کوئی چیز نہیں لائے۔ علامت کے طور پر کہ جسے موسیٰ علیہ السلام دیکھ کر متنبہ ہوجاتے اور سمجھ جاتے کہ یہ فرشتہ ہے۔ کسی شخص کے پاس آ کر کوئی یہ کہے تو اپنی روح میرے حوالہ کر تو اس کا جواب کیا ہوگا؟ جہاں پوری لمبی حدیث آتی ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ جب فرشتہ نے جا کر اللہ تعالیٰ کے پاس شکایت کی تو دوبارہ جب اللہ تعالیٰ نے بھیجا تو اس وقت ایک نشانی دے کر بھیجا۔

دوسری بات کہ: جب پہلی مرتبہ فرشتہ آیا تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام نہیں جھکے جب دوبارہ آیا تو کیوں جھکے؟ تو جواب واضح ہے کہ پہلی مرتبہ وہ انسانی شکل میں گیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہیں تھا کہ یہ فرشتہ ہے۔ دوسری مرتبہ جب آیا تو اس کے ساتھ علامت بھی تھی۔ تو موسیٰ علیہ السلام علامت دیکھ کر مطمئن ہوگئے تو بہر حال تفسیر میں اگر ہم امام احمد کی حدیث کا مطالعہ کریں تو اشکال زائل ہوجاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اسرائیلیات میں سے ہے۔ اس کا قول بھی باطل ہوجاتا ہے کیونکہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں روایت اسرائیلی ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ سے مروی ہے۔ وہ اپنے سلف سے بیان کرتے ہیں تو اس میں جھوٹ وسچ دونوں کا احتمال ہے۔ اس لیے آپ علیہ السلام نے فرمایا:

((اذا حدثکم اهل الکتاب فلا تصدقوهم ولا تکذبوهم))

اسرائیلی روایات قصص کی نسبت دوقسموں میں تقسیم ہوتی ہیں:

پہلی تقسیم: اور یہ زیادہ ہوتی ہیں کہ جو اہل کتاب کے بارے میں مروی ہوں۔ نبی علیہ السلام کے قول سے۔

دوسری قسم: اور یہ کم ہیں کہ بعض ایسی اسرائیلی روایات کہ جنہیں نبی علیہ السلام اسرائیل سے بیان کرتے تھے تو ایسی اسرائیلی روایات صحیح ہیں۔ کیونکہ نبی علیہ السلام ان کی طرف سے خبر دے رہے ہیں۔

سوال "ماجعل الله للمسخ من نسل" اس حدیث کی صحت کیسی ہے؟ اور اس

کا معنیٰ کیا ہے؟[فتاویٰ الامارات:۵]

جواب یہ حدیث صحیح ہے۔

''مسلم'' کی حدیث ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی شکلیں مسخ کر دیں تھیں' ان کو خنزیر اور بندر بنا دیا تھا۔ تو اس شکل میں وہ لوگ تین دن تک رہے' پھر سب مر گئے۔ ان مسخ شدہ شکلوں کی اللہ تعالیٰ نے آگے نسل نہیں چلائی۔ تو جس کسی قوم کو اللہ تعالیٰ حیوانات کی شکل میں مسخ کر دیتا ہے' تو وہ ان کی آگے نسلیں نہیں چلاتا بلکہ ان کو ختم کر دیتا ہے۔

سوال ''خیرالقرون قرني......''یا''خیرالناس قرني......''کون سی حدیث ثابت ہے؟[فتاویٰ المدینہ:۷۸]

جواب خیرالقرون ...... یہ والی حدیث تو ثابت نہیں ہے۔ میرے علم کے مطابق کہ جتنی حدیثیں میں نے دیکھیں کسی سند سے خیرالقرون ...... ثابت نہیں ہے بلکہ ثابت جو حدیث ہے اس کے الفاظ ''خیرالناس......'' ہیں۔

سوال دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنے والی حدیث کے بارے میں ابن حجر نے حسن کا حکم لگایا ہے' آپ کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟[فتاویٰ المدینہ:۸۳]

جواب میری رائے کے مطابق درست نہیں ہے۔ دونوں میں سے ایک طریق سے استشہاد جائز نہیں ہے۔ اس کے سخت ضعیف ہونے کی وجہ سے۔

سوال کیا ایسی کوئی حدیث ہے کہ جس سے دلیل لی جائے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تفسیر میں۔﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأَى بُرْهَانَ رَبِّهِ﴾[یوسف: ۲٤] اور بعض تفسیروں میں ابن عباس کی طرف جو قول منسوب ہے اس کا کیا حکم ہے؟

[فتاویٰ المدینہ:٤۳]

جواب اس آیت کی تفسیر میں نبی علیہ السلام سے مرفوعاً کوئی حدیث ثابت نہیں ہے۔ ابن عباس اور دیگر لوگوں سے اس کے بارے میں جو روایات آتی ہیں' وہ سب کی سب

اسرائیلیات ہیں کہ جو یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں لیکن کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ انہیں یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کرے۔اس آیت کی تفسیر میں علماء کے دو قول ایسے ہیں کہ جو قابل التفات ہیں۔پہلا قول: ''وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ'' سے مراد برائی ہے اور'' وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأَى بُرْهَانَ رَبِّهِ'' سے مراد ''ماهم'' یعنی یوسف نے برائی نہیں کی تو اس سے یوسف علیہ السلام کی عزت وعصمت ثابت ہوجاتی ہے اور یہی قول معتمد ہے کیونکہ سلف سے بھی یہی بات مروی ہے۔

دوسرا قول: کہ جس کی نسبت یوسف علیہ السلام کی طرف کی جاتی ہے کہ جو یوسف علیہ السلام کی عصمت کے منافی نہیں ہے بلکہ عصمت ہی کو مزید تاکید سے ثابت کرتا ہے لیکن یہ نیا قول ہے کہ جو سلف سے منقول ہی نہیں ہے اور وہ یہ کہ: ''وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ'' سے مراد برائی ہے اور'' وَهَمَّ بِهَا'' سے مراد اس عورت کو مارنا۔

سوال نبی علیہ السلام کا فرمان''انا لیس لی ان ادخل بیتاً تزوقا''تزویق کا معنیٰ کیا ہے؟ کیا اس سے مراد اس کی حرمت ہے؟[فتاویٰ الامارات:۸۵]

جواب تزویق سے مراد خوبصورت' اس سے مراد اس کی حرمت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایسی جگہ سے دور رہنا کیونکہ ایسی جگہ نبوۃ اور رسالت کے مقام کے لائق اور مناسب نہیں ہے۔بلاشبہ کوئی مسلمان کتنی بھی اللہ کی قربت حاصل کرلے تب بھی اس کے لیے ضروری ہے کہ نبی علیہ السلام کے نقش قدم پہ چلے اور اس طریقہ پر کہ جسے آپ پسند فرماتے تھے اور جسے ناپسند کرتے تھے اس سے دور رہے۔

سوال پہلے ایک سوال میں ذکر کیا گیا کہ''لن تمسها النار الا تحلة القسم'' ہرگز نہیں اسے آگ چھوئے گی مگر قسم حلال کرنے کے برابر۔قسم حلال کرنے کے برابر اس کا کیا معنیٰ ہے؟[فتاویٰ الامارات:۳۲]

جواب اس حدیث میں اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف ﴿وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا﴾ کہ تم میں سے ہر ایک اس پر وارد ہونے

والا ہے اور یہ فیصلہ حتمی ہے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم ہے۔ اس وارد ہونے سے کیا مراد ہے اس کے بارے میں علماء کے مابین تین قول ہیں:

پہلا قول: ورود کا معنیٰ ہے ''آگ کے کونے سے''

دوسرا قول: آگ کے اوپر سے پل صراط پہ گزرنا۔

تیسرا قول: آگ میں داخل ہونا اور یہ دوسرے قول کے منافی نہیں ہے کیونکہ پل صراط پر گزرنا آگ میں داخل ہونا ہے اور اس کلام کی مزید تائید جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے۔ لیکن حدیث سند کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔ اپنی شہرت کے باوجود اس حدیث کو بعض تابعین مجہول لوگوں سے روایت کرتے ہیں۔ حدیث کے ضعف کی علت یہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس آیت ''وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا'' کا ذکر چلا تو ہمارا آپس میں اختلاف ہو گیا۔ تو جابر رضی اللہ عنہ نے فوراً اپنی انگلیاں اپنے کانوں پر رکھیں اور کہنے لگے کہ یہ دونوں کان بہرے ہو جائیں کہ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی ہو۔ فرمانے لگے:

((لَا يَبْقَى بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ إِلَّاوَيَدْخُلُهَا ثم تكونبَرْدًا وَسَلَامًا عَلَى الْمُؤْمِنِين كَمَا كَانَتْ عَلَى إِبْرَاهِيمَ))

''نہ کوئی نیک رہے گا، نہ کوئی گناہ گار مگر وہ اس آگ میں ضرور داخل ہوگا، پھر وہ آگ ان پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جائے گی کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی ہوئی تھی۔ ''مسلم'' میں ایک حدیث ہے۔ حفصہ بنت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لایدخل النار احد من اهل بدر واصحاب الشجرة))

کہ آگ میں بدر والوں اور بیعت رضوان والوں میں سے کوئی داخل نہیں ہوگا۔

کہتی ہے کیسے اے اللہ کے رسول! جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وان منکم الاوار دھا﴾

تو آپ نے ان سے فرمایا کہ:

اس کے بعد بھی پڑھو۔

﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا وَّنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا﴾۔[مریم:۷۲]

”پھر ہم ڈرنے والوں کو نجات دیں گے اور ظالموں کو گھٹنوں کے بل اس میں گھسیٹیں گے۔“

ہم اس سے استدلال کر سکتے ہیں کہ نبی علیہ السلام کوئی بات سن کر بھی اس کا انکار نہ کریں تو یہ خود بخود اس بات کی درستگی دلیل بن جائے گی۔لیکن ممکن ہے کہ اس میں تخصیص وتنقید داخل ہو۔ یہ ایک عظیم اور باریک بینی والا فائدہ ہے لیکن ابن حزم اس سے مطلع نہیں ہوئے۔تو اس لیے انہوں نے ایک کتابچہ لکھا کہ جس میں موسیقی اور گانے کے آلات کو انہوں نے جائز قرار دیا اور ان کی دلیل یہ تھی ”کہ جو ”بخاری ومسلم“ میں ایک حدیث ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عید کے دن نبی علیہ السلام میرے پاس آئے تو میرے پاس دو بچیاں بیٹھ کر بعاث جنگ کے اشعار پڑھ رہی تھیں اور دف بجا رہی تھیں۔تو جب ابوبکر رضی اللہ عنہ گھر میں داخل ہوئے تو فرمانے لگے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں شیطانی باجے؟ تو آپ نے فرمایا:

((دعهما فان لكل قوم عيداً وهذا عيدنا))

ان کو چھوڑ دو بے شک ہر قوم کے لیے ایک عید کا دن ہوتا ہے اور یہ ہماری عید کا دن ہے۔تو امام ابن حزم نے اس حدیث سے دف اور گانے کے جواز پر دلیل لی ہے کیونکہ نبی علیہ السلام نے ان دونوں بچیوں کو برقرار رکھا تھا لیکن ان سے یہ بات فوت ہو گئی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کے الفاظ ”امزمار الشیطان“ کو بھی برقرار رکھا۔تو اس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ کو بھی ”کیف یارسول اللہ واللہ یقول“ ان منکم الا واردھا“ ؟ پر بھی اسی طرح برقرار رکھا ہوگا۔تو اب ہم جمع کریں دونوں کی بات تو ”مزمار الشیطان......“ ابوبکر کے الفاظ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان :دعهما فان لكل قوم عيدا......

کے درمیان تو نتیجہ خود بخود نکل آئے گا کہ جائز نہیں ہے۔ منع ہونے کے لحاظ سے ان آلات کا شیطان کی طرف منسوب ہونا ہی کافی ہے۔ لیکن عید والے دن بچیوں کا دف بجانا اس سے مستثنیٰ ہے۔ اسی طرح کی استثنیات میں سے ایک استثناء یہ بھی ہے کہ جو صحیح حدیث میں آئی ہے۔ شادی میں دف وغیرہ بجانا جائز ہے کہ جس طرح نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "اضربو بالدف۔"

کہ ان پر دف بجاؤ۔ صحابہ نبی علیہ السلام کے عہد مبارک میں شادیوں میں دف بجایا کرتے تھے "اس مسئلہ کو میں نے تفصیل سے اپنی کتاب "آداب الزفاف في السنة المطهرة" میں بیان کیا ہے۔

(سوال) حافظ ابن حجر نے کچھ روایات ذکر کی ہیں' ان لوگوں کے بارے میں کہ جو عورتوں کو دبر میں آتے ہیں' ان کے حکم کے متعلق ساتھ ساتھ تمام اسانید اور ان پر جو کلام ہے وہ بھی ذکر کیا ہے کہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام ائمہ نے عورتوں کے دبر میں آنے کے بارے میں ان روایات پر کلام کیا' امام بخاری' نسائی اور دیگر ائمہ نے کہا کہ اس کے بارے میں کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔ جبکہ ابن عمر' نافع' مالک اور دیگر کچھ دوسرے لوگوں سے عورتوں کے دبر میں آنے کا صحیح ہونا منقول ہے لیکن حافظ ابن حجر خود اس طرف مائل ہوئے ہیں کہ تمام طرق کی بنا پر ہی درست ہے تو جب کچھ بھی جواز کے متعلق ثابت نہیں ہے تو یہ بات کیوں تسلیم نہیں کی گئی؟ [فتاویٰ المدینہ: ۳۳]

(جواب) ان کا قول اس لیے درست نہیں ہے کہ جس چیز کے بارے میں یہ لوگ بات کرتے ہیں وہ صرف کچھ احادیث کے مفردات ہیں کہ جو اس مسئلہ کے بارے میں آئے ہیں۔

حافظ ابن حجر حدیث میں امیر المؤمنین ہیں۔ ان کا مثل موجود نہیں ہے تو انہوں نے اس معنیٰ کی تمام احادیث اور طرق کو ایک جگہ جمع کیا ہے اور ان پر علوم حدیث کے قواعد کے مطابق قواعد لگائے بھی ہیں۔ تو ان کے لیے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ بہت

دشوار غلطی ہے یہ کہنا کہ اس کے متعلق کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔ جی ہاں انفرادی طور پر آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے متعلق کچھ ثابت نہیں ہے۔ مجموعی طور پر اگر ان تمام ادلہ کو جمع کیا جائے تو یقینی طور پہ ان سب کا اس بات پہ اتفاق ہو جاتا ہے کہ عورت کو اپنی اصل جگہ سے ہٹ کر کہیں اور آنا حرام ہے۔ ”نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ“ یعنی جیسے تم چاہو تو یہ آیت بھی اس حکم میں قوت پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح سے احادیث بھی اس کی تفسیر کرتی ہیں۔

اور نبی علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ کیا آدمی کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی بیوی کو جیسے چاہے آئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں لیکن ایک ہی سوراخ میں آئے۔

(سوال) کیا حائضہ عورت سے جماع کرنا یا دبر میں جماع کرنا برابر ہے حکم کے لحاظ سے؟ کہ کبائر میں سے ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ عورت کے دبر میں آنا یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کبائر میں سے ہے کہ نہیں باوجود یہ کہ اس کے ادلہ بھی کمزور ہیں؟

[فتاویٰ المدینہ: ۱۰۱]

(جواب) مجھے اس میں ذرا شک نہیں کہ واقعتاً عورت کے دبر میں جماع کرنا کبائر میں سے ہے۔ باقی رہی بات اس کے دلائل میں ضعف ہے تو یہ ضعف بعض طرق کے مفردات کے اعتبار سے ہے۔ وگرنہ بے شک یہ ثابت ہے کہ عورت کو دبر میں جماع کرنا منع ہے۔ عورت کے دبر میں جماع کرنے والے پر کئی احادیث میں لعنت وارد ہے۔

کچھ احادیث میں نے اپنی کتاب ”آداب الزفاف فی السنة المطهرة“ میں ذکر کی ہیں۔

عورتوں کے مخصوص مسائل

سوال وضع حمل سے کچھ دیر پہلے عورت کو جو خون آتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ وہ نفاس کا خون ہے یا استحاضہ کا خون ہے؟[فتاوی الامارات: ۱۰۹]

جواب یہ استحاضہ کا خون شمار ہوگا کیونکہ نفاس کا خون بچے کی ولادت کے بعد ہوتا ہے۔

سوال حج اور عمرہ کے دوران آسانی سے حج کرنے کے لیے کیا عورت مانع حیض کوئی دوائی وغیرہ استعمال کر سکتی ہے؟[فتاوی الامارات: ۷۰]

جواب اس طرح سے کسی طبی ذریعہ سے کوئی مانع حاصل کرنا کہ جب ڈاکٹر ایسی دوائی استعمال کرنے کی اجازت دے کہ عورت یہ ضرر کا خدشہ پیدا نہ ہو تو جائز ہے۔ کیونکہ اصل یہ ہے کہ ہر چیز مباح ہے اور اس عمل کے ارتکاب میں کوئی مانع نہ ہو۔

سوال کیا حائضہ عورت کا مسجد میں داخل ہونا جائز ہے؟[فتاوی المدینہ: ۲۳]

جواب عورت کے لیے یہ جائز ہے۔ سلبی دلیل کے ساتھ اور دوسری ایجابی دلیل کے ساتھ۔

سلبی دلیل: سلبی دلیل کا مطلب ہے کہ اس سے مانع دلیل کا وجود نہیں ہے کہ جو مسجد میں داخل ہونے سے مانع ہو اور یہ اصول کے قاعدہ کو بھی شامل ہے کہ: ''ان الاصل فی الاشیاء الاباصرۃ'' کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے اور کسی چیز سے منع ہونا یہ خاص دلیل کا مطالبہ کرتا ہے۔ مطلق طور پر ایسی کوئی صحیح حدیث نہیں آئی کہ جس میں حائضہ عورت کے مسجد میں داخل ہونے سے منع ہو۔

ایجابی دلیل: عائشہ کی حدیث ہے ''صحیح بخاری'' میں جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر مکہ کے قریب ''سرف'' نامی مقام پر عائشہ حائضہ ہو گئی۔

جب اللہ کے رسول ﷺ اس کے پاس آئے تو یہ رو رہی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: مالك ؟انفست تجھے کیا ہوگیا؟ کیا تو حائضہ ہوگئی ہے؟ پھر فرمانے لگے:

((هذا امر كتبه الله على بنات آدم'فاصنعي مايصنع الحاج غير الاتطوفي ولا تصلي))

کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے تمام آدم کی بیٹیوں پر لکھ دیا ہے۔ تو تو وہی کر کہ جو حاجی کرتے ہیں۔ صرف طواف نہ کر اور نماز نہ پڑھنا۔ تو یہ نص ہے کہ حائضہ عورت کے لیے مسجد میں داخل ہونا جائز ہے بلکہ مسجد حرام میں کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اس کے لیے مباح قرار دیا جو کچھ حاجی کرتے ہیں۔ تیرے لیے بھی جائز ہے۔ مسجد میں داخل ہونا طواف اور نماز سمیت کیونکہ حاجی یہ سب کام کرتے ہیں۔ ہاں البتہ یہ اسے مستثنیٰ قرار دیا اس سے کہ حاجی کریں طواف نہ کرے اور نماز نہ پڑھے۔ تو حائضہ مسجد میں داخل ہوسکتی ہے' مصحف پڑھ سکتی ہے۔

جو اس کے برخلاف دعویٰ کرے اس پر لازم ہے کہ دلیل پیش کرے۔ تو اس پر لازم ہے ان چیزوں کو حرام قرار دینے والی دلیل لائے اور ثابت کرے یہ حرمت اس حلت کے بعد کی ہے۔

سوال کیا نماز میں عورت کے پاؤں ستر شمار ہوتے ہیں؟ ان کو ڈھانپنا ضروری ہے؟

[فتاویٰ الامارات:۹۸]

جواب علماء کے اس بارے میں دو قول ہیں۔ پہلا قول: کہ دونوں پاؤں ستر ہیں اور یہی قول صحیح ہے۔ دوسرا قول: کہ پاؤں ستر نہیں ہیں اور یہ مرجوع ہے۔ اس بات کی دلیل اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ماخوذ ہے۔

﴿وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ﴾ [النور:۳۱]

وہ عورتیں اپنے پاؤں زمین پہ مار کہ نہ چلیں تا کہ جو چیز مخفی ہے ان کی زینت میں سے وہ ظاہر ہو جائے۔ تو یہ نص صریح ہے کہ صحابہ کی عورتیں اپنے پاؤں ڈھانپ کر رکھتی

تھیں یہ صرف اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قول پر عمل کرتی تھیں' عمومی طور پر۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ﴾ [الاحزاب:٥٩]

جلباب سے مراد وہ چادر اور کپڑا کہ جسے عورت جب سر پر ڈالے تو پورے جسم کو ڈھانپ لے یہاں تک کہ پاؤں کو بھی ڈھانپ لے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے تربیت کرتے ہوئے فرمایا ان عورتوں کے لیے کہ جن کے دل میں شیطان وسوسے ڈالتا ہے کہ وہ اپنے پاؤں ڈھانپ کر رکھیں۔لیکن شیطان بعض عورتوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ اپنے پاؤں زمین پر مار کر چلتی ہیں تاکہ مردوں کو اپنی پائل کی آواز سنائیں۔بعض احادیث میں ''سنن ابی داؤد'' وغیرہ میں ہے کہ عورت جب نماز کے لیے کھڑی ہو تو لازمی ہے کہ وہ اپنے آپ پر کوئی لمبی چادر یا قمیض پہن لے تاکہ جسم کے ساتھ ساتھ اس کے پاؤں کو بھی وہ چادر ڈھانپ لے۔

کبھی کبھار اگر تھوڑا سا عورت کا پاؤں ظاہر ہو جائے تو یہ معاف ہے۔

سوال عورت کی گھر کی نماز مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے تو کیا جب عورت مکہ میں ہو تو اس وقت ہوٹل میں نماز پڑھے' کیا یہ نماز حرم میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے؟

[فتاویٰ الامارات:٩٩]

جواب عورت کہیں بھی ہو کسی بھی ملک میں ہو حتیٰ کہ اگرچہ مکہ یا مدینہ میں ہو بلکہ بیت المقدس میں ہو تو پھر بھی اس کی گھر کی نماز مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔

مرد کا نوافل کے لحاظ سے یہی حال ہے تو مرد کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ اپنے نوافل گھر میں ادا کرے مسجد کے بجائے اگرچہ مسجد حرام میں ہو۔

اس کی دو دلیلیں ہیں: پہلی دلیل: قیام رمضان کے متعلق نبی اکرم ﷺ کا عمومی فرمان کہ جب صحابہ کو پہلی' دوسری اور تیسری رات قیام کروایا تھا پھر جب چوتھی رات

جمع ہوئے یہاں تک کہ بعض جاہل لوگوں نے آپ کے دروازے کو پتھر مارے تو ان کی طرف غصہ میں نکلے اور فرمایا:

((فَصَلُّوا أَيُّهَا النَّاسُ فِي بُيُوتِكُمْ فَإِنَّ أَفْضَلَ الصَّلَاةِ صَلَاةُ الْمَرْءِ فِي بَيْتِهِ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ))

کہ تمہارا یہاں جمع ہونا مجھ سے مخفی نہیں تھا، میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا۔ لوگو! اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھو کیونکہ فرض نماز کے علاوہ گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے۔

دوسری دلیل: یہ خاص مسجد نبوی کے متعلق ہے کہ جب صحابہ میں سے ایک شخص نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور آ کر سوال کیا کہ جو اس سوال کے مشابہ تھا کہ کیا نفل نماز میں مسجد میں پڑھوں یا گھر میں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((اتری بیتی هذاما اقربه من مسجدی؟ قال نعم قال: فافضل صَلَاةُ الْمَرْءِ فِي بَيْتِهِ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ))

کیا تم میرے گھر کو دیکھ رہے ہو کہ میری مسجد کے کتنا قریب ہے؟ اس شخص نے کہا جی ہاں تو آپ نے فرمایا کہ آدمی کی اپنے گھر میں نماز پڑھنا فرض کے علاوہ مسجد میں پڑھنے سے افضل ہے۔

نوٹ: جو شخص اپنے ہی ملک میں ہو اور اس جگہ کو خاص فضیلت حاصل ہو جیسے مسجد حرام ہے اور مسجد نبوی یا مسجد اقصیٰ ہے تو ایسی صورت میں عورت کا اپنے گھر میں فرض نماز پڑھنا اور مرد کا اپنے گھر میں نفل نماز پڑھنا یہ مراد نہیں مگر نماز افضل ہوگی۔ بشرطیکہ ان مذکورہ مساجد میں سے کسی ایک میں پڑھ لے۔ مرد اگر نفل نماز مسجد حرام میں پڑھے تو اس کی نماز لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔ عورت اگر فرض یا نفل مسجد حرام میں پڑھے تو اسے بھی لاکھ نمازوں کے برابر ثواب ملے گا لیکن اگر مرد و عورت نفل نماز اپنے گھر میں پڑھے۔ اسی طرح جب عورت اپنے گھر میں پڑھے۔ تو ان میں سے ہر ایک کی نماز لاکھ نماز کے برابر ہوگی اور مزید ثواب ہوگا۔ یہ ہے فضیلت کا معنی۔

سوال کیا حاملہ عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ بیٹھ کر نماز پڑھے کہ جب اسقاط حمل کا خطرہ ہو؟[فتاویٰ الامارات:٣٦]

جواب جی ہاں جائز ہے؟

سوال عورتوں کے لیے قبرستان جانے کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ المدینہ:٦٢]

جواب عورتیں مردوں کی طرح ہیں۔

تو جو مردوں کے لیے جائز ہے وہ عورتوں کے لیے بھی جائز ہے اور جو مردوں کے لیے مستحب ہے وہ عورتوں کے لیے بھی مستحب ہے مگر کسی چیز کو کوئی خاص دلیل مستثنیٰ کرے۔ عورتوں کے متعلق الگ خاص کوئی حدیث نہیں ہے کہ جس میں عمومی طور پر عورتوں کے لیے جانا قبرستان میں حرام قرار دیا گیا ہو۔ بلکہ صحیح مسلم میں عائشہ رضی اللہ عنہا کا قصہ معروف ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بستر سے اتر کر چلے گئے اور بقیع قبرستان کی طرف گئے تا کہ مردوں کے لیے سلامتی کی دعا کریں تو عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ان کے پیچھے پیچھے چلی گئیں ۔ پھر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واپس پلٹے تو وہ بھی پلٹی اور جب آپ علیہ السلام تیز تیز چلنے لگے تو یہ بھی تیز چلی۔ یہاں تک کہ بستر پر پہنچ گئی اور وہ عائشہ تیز تیز سانس لے رہی تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عائشہ تجھے کیا ہو گیا؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عائشہ سے فرمانے لگے:

((اظننت ان یحیف اللہ علیك ورسولہ ان جبریل اتانی آنفافقال ان ربك یقرئك السلام' ویامرك اناتاتی الی البقیع وتستغفر لھم))

”کیا تم نے یہ گمان کیا کہ اللہ اور اس کا رسول تجھ پر ظلم کریں گے' بے شک جبریل علیہ السلام میرے پاس ابھی ابھی آئے اور انہوں نے کہا کہ تمہارا رب تمہیں سلام کہہ رہا تھا اور آپ کے نام حکم دیا کہ آپ بقیع میں آئیں اور ان کے لیے استغفار کریں۔ صحیح کے علاوہ ایک اور روایت میں ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا میں کہاں اور آپ کہاں ۔ اے اللہ کے رسول! پھر کہنے لگی جس طرح صحیح مسلم میں ہے کہ اے اللہ کے رسول! جب میں قبروں

کی زیارت کرنے کے لیے جاؤں تو کیا کہوں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: قولی...... '' پھر وہ معروف دعا ذکر کی۔

دوسری جو حدیث ہے ''لعن اللہ زوارات القبور'' کہ قبروں کی زیارت کرنے والوں پر اللہ کی لعنت ہے۔ تو یہ آپ کا فرمان مکی دور کا ہے۔ کیونکہ ایک معروف حدیث:

((کنت نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ ألا فَزُورُوهَا))

''میں نے تمہیں قبروں کی زیارت کرنے سے روکا تھا تو تم اب ان کی زیارت کیا کرو۔''

بلاشبہ مدینہ میں منع نہیں ہے بلکہ منع مکہ میں تھی۔ کیونکہ اس وقت لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے تو مدینہ میں اس منع کا تصور بھی نہیں ہے کیونکہ شرک کا امکان ہی نہیں تھا ''الا فزوروھا'' تو ممکن ہے کہ یہ مکہ کے بارے میں ہو' چاہے مکہ میں ہو یا مدینہ میں ہو تو اجازت کے بعد۔ اس کے ساتھ اس پر کچھ احکام مرتب ہوتے ہیں۔

بہرحال راجح یہ ہے کہ قبروں کی زیارت سے مکی زندگی میں روکا گیا تھا پھر مکی عہد کے آخر میں اور مدنی عہد کے شروع میں آپ ﷺ نے فرمایا ''الا فزوروھا''

اس تمہید کے بعد اب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نہی جو ہے یہ مردوں اور عورتوں سب کو شامل ہے اور اجازت بھی اسی طرح مردوں اور عورتوں سب کو شامل ہے۔ جب اس کا حکم اسی طرح ہے ''لعن اللہ زوارات القبور'' یہ حدیث کب آئی ہے؟ اگر تو اجازت کے بعد آئی تو اس کا معنی یہ ہے کہ فسخ حکم دو مرتبہ ہوا عورتوں کی نسبت اور اسے ہم منسوخ احکام میں سے شمار نہیں کرتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نبی علیہ السلام نے ''لعن اللہ زوارات القبور'' فرمایا تو اس کے بعد مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی اجازت دے دی۔ ورنہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا محل کیا ہوگا؟ اگر یہ کہا جائے کہ یہ منع پہلے کی ہے تو ہمارے نزدیک بھی یہی بات راجح ہوگی تو ہم کہیں گے کہ یہ خاص نہیں ہے اور عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ خاص صورت

حال میں اور اس میں قبروں کی زیارت سے منع میں مبالغہ ہے۔ وگرنہ قبروں کی زیارت عورتوں پر حرام کے لیے ہیں۔

(سوال) عورت کے چہرے کے پردے کا کیا حکم ہے؟[فتاوی المدینہ: ١٠]

(جواب) ہم صحابہ میں سے کسی کو نہیں جانتے کہ کسی نے اس کو واجب قرار دیا ہو۔ عورت پر۔ لیکن عورت کے لیے بہتر اور افضل یہ ہے کہ وہ اپنے چہرے کو ڈھانپیں۔ باقی وجوب کے حوالہ سے ایسی کوئی دلیل شریعت میں ثابت نہیں ہے۔ تو کسی شخص کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اسے واجب قرار دے۔ اس لیے میں نے اپنی کتاب "حجاب المرأة المسلمة" میں ایک فصل باندھ کر ان لوگوں کا رد کیا کہ جو چہرے کے پردہ کو بدعت کہتے ہیں اور میں نے واضح کیا کہ یہ افضل ہے۔ ابن عباس سے صریح نص کے ساتھ ثابت ہے کہ چہرہ اور دونوں کف یہ ستر ہیں کہ جسے ابن ابی شبہ کی روایت ہے "مصنف" میں۔

ہم کوئی نئی چیز نہیں لائے۔ سلف صالحین اور مفسرین میں سے بھی علماء کا یہ مؤقف ہے، جسے ابن جریر، طبری وغیرہ کا چہرہ اور کف ستر میں شامل نہیں ہے لیکن افضل یہ ہے کہ ان کو ڈھانپنا چاہیے۔

بعض چہرے کے پردہ کے وجوب کے لیے ایک اصولی قاعدہ سے دلیل پکڑتے ہیں کہ "درء المفاسد مقدم علی جلب المصالح" میں کہتا ہوں کہ یہ قاعدہ نئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ قاعدہ بھی شریعت سے ماخوذ ہے جس شخصیت پر وحی نازل ہوئی وہ رسول ہے اور وہ لوگ جنہوں نے ان سے یہ شریعت سیکھی بلاشبہ وہ اس قاعدہ کو سمجھنے والے تھے۔ اگر چہ انہوں نے اس قاعدہ کو ہمارے جوڑا اور تعبیر نہیں کیا۔ "حجاب المرأة المسلمة" میں ہم نے بنو خثیمہ کی اس عورت کا واقعہ بھی ذکر کیا ہے جس میں یہ ہے کہ فضل بن عباس نبی اکرم ﷺ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، وہ اس عورت کی طرف دیکھ رہے تھے اور عورت ان کی طرف دیکھ رہی تھی جبکہ فضل خوبصورت تھے اور وہ عورت بھی خوبصورت

تھی اگر چہرے کا پردہ فرض ہوتا تو کیسے معلوم ہوتا کہ وہ عورت خوبصورت تھی کیونکہ چہرہ مطلق ڈھانپا ہوتا اور کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا اور فضل کے چہرے کو نبی اکرم ﷺ دوسری طرف ہٹا رہے ہیں تو معنیٰ یہ ہوا کہ اس عورت کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔

بعض نے یہ جواب دیا کہ وہ عورت احرام میں تھی تو احرام کی حالت میں چہرہ کھلا رکھنا جائز ہے۔ باوجودیکہ اس حدیث میں ایسی کوئی نص نہیں ہے کہ وہ احرام میں تھی اور میں نے اپنی کتاب میں تحقیق کے ساتھ یہ بات لکھی ہے کہ یوم النحر کو جمرات کو کنکریاں مارنے اور پہلی حلت حاصل ہوجانے کے بعد کی بات ہے۔ تو بالفرض اگر ہم تسلیم کرلیں کہ وہ عورت حالت احرام میں تھی تو پھر نبی اکرم ﷺ نے یہاں اس قاعدہ کو کیوں فٹ نہیں کیا؟ درء المفاسد......؟ شرعی لحاظ سے اس میں کوئی فرق نہیں کہ مرد عورت کی طرف دیکھے یا عورت مرد کی طرف دیکھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان دونوں کے لیے الگ الگ ہے:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾ [النور: ۳۰]

''یعنی عورتوں سے کہا اپنی نگاہوں کو جھکا رکھے۔''

﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ﴾۔[النور ۳۱]

یعنی مردوں کو دیکھنے سے وہ اپنی نظریں جھکا کر رکھیں۔ تو جو امر دوسری آیت میں ہے، وہی امر پہلے والی آیت میں بھی ہے۔ یعنی وجوبی طور پر اپنی نظروں کو جھکا کر رکھیں۔ دوسری آیت سے یہ مراد نہیں ہے کہ مرد اپنے چہرے وجوبی طور پر عورتوں سے چھپائیں، اسی طرح اس دوسری آیت سے یہ مراد نہیں ہے۔ عورتیں اپنے چہرے کو وجوبی طور پر اپنے چہروں کو ڈھانپ کر رکھیں۔

تو یہ دونوں آیتیں صریح ہیں کہ یہاں کوئی ایسی چیز ہے کہ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مرد اور عورت دونوں کو نظریں جھکانے کا حکم دے رہے ہیں اور یہ جو حدیث ہے ''المرأة عورة'' عورت پردہ ہے۔

تو یہ حدیث اطلاق پر محمول نہیں ہوگی۔ تو پھر عورت کے لیے کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ نماز کے دوران وہ اپنے پردے کو ظاہر کرے۔ بہت کم علماء یہ کہتے ہیں کہ عورت کا چہرہ پردہ ہے اور جمہور یہ کہتے ہیں عورت کا چہرہ پردہ نہیں ہے۔ دوسری ایک حدیث ہے:

((المرأة عورة فاذاخرجت استشرفهاالشیطان))

اس حدیث سے مطلقاً یہ قاعدہ سمجھ میں نہیں آتا۔

ہر وہ نص کہ جس کے تحت بہت سارے اجزا داخل ہوں۔ تو اس کے دوسرے اجزا کو چھوڑ کر صرف ایک جز پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔ تو جائز نہیں ہے کہ ہم اس کے لیے عام نص سے حجت پکڑیں اور اسے دوسرے اجزا میں شامل کریں۔ تو بہر حال یہ کہنا کہ ''المرأة عورة'' کہ اس میں چہرہ اور ہاتھ شامل ہے یہ سلف کا عمل اس کے برخلاف نہیں ہے۔

سوال آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ چہرہ اور ہاتھ ستر میں شامل نہیں ہیں۔ آپ نے عائشہ عن اسماء کی حدیث سے دلیل لی ہے، اس میں تو سعید بن بشیر ہے کہ جس کے بارے میں امام شوکانی فرماتے ہیں ''اس کے متعلق کئی ایک آئمہ نے کلام کیا ہے اور یہ روایت بھی مرسل ہے اور عائشہ کی حدیث جو وجوب حجاب کے بارے میں ہے وہ بھی اس کے مخالف ہے۔ اسی طرح حدیث الرکبان اور ابن ام مکتوم کی حدیث جس میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''احتجبامنه''۔ [فتاویٰ المدینه: ١٢٢]

جواب یہ جتنے بھی دلائل آپ نے ذکر کیے' ان میں سے ہر ایک کا تفصیلی جواب میں ''حجاب المرأة المسلمة'' میں ذکر کر چکا ہوں۔ لیکن ایک جلدی جواب ضروری ہے ۔ عائشہ کی اکیلی حدیث سے ہم نے دلیل نہیں لی ۔ دوسری اسماء کی حدیث بھی اس کے ساتھ ذکر کی ہے۔ اس حدیث میں تھوڑا سا ضعف ہے لیکن یہ حدیث شواہد کی وجہ سے قوی ہوجاتی ہے۔

عائشہ کی دوسری حدیث (حدیث الرکبان) جس میں وہ فرماتی ہیں لوگ ہمارے

پاس سے گزر جاتے تھے اور ہم احرام کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ جب لوگ ہمارے قریب آتے تو ہم چادر سر سے چہرے پر کھینچ لیتیں تھیں۔ جب ہمیں لوگ کراس کر جاتے تو ہم اپنے چہرے کھول دیتیں تھیں۔

تو عورتوں کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ اپنے چہروں کو ڈھانپ رکھیں تو عائشہ نے جو کیا یہ اس کی افضلیت پر دلالت کرتا ہے۔ وجوب پر دلالت نہیں کرتا۔ ابن ام مکتوم کی جو حدیث ہے وہ ضعیف ہے۔ اس میں ایک راوی مجہول ہے۔

اور ہم نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ جمہور علماء کا مؤقف یہ ہے کہ عورت کا چہرہ اور ہاتھ ستر میں شامل نہیں ہیں۔

سوال کیا بہن کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے بھائی کے آگے اپنی پنڈلیاں سینہ یا بازو کھلے رکھے؟[فتاویٰ المدینہ:۹۶]

جواب عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے محرم رشتہ داروں کے سامنے یا عورتوں کے سامنے ظاہر کرے۔ سوائے زینت کے مقامات کے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

﴿وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ ....﴾ [النور:۳۱]

وہ عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر صرف اپنے شوہروں کے لیے یا اپنے باپ کے لیے زینت کے مقامات۔ اس سے مراد سر، ہار کی جگہ، کنگن پہننے کی جگہ، اپنے بازو، قدم اور بالیوں کی جگہ۔ تو ان مقامات کو عورت اپنے محارم یا عورتوں کے سامنے ظاہر کر سکتی ہے۔

سوال جس عورت کو نکاح کا پیغام بھیجنا ہو کیا اس کو چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ یعنی بال وغیرہ اس طرح کی چیزیں دیکھنا جائز ہے؟[فتاویٰ المدینہ:۱۱۳]

جواب میرے علم کے مطابق واللہ اعلم، یہ جائز ہے، بشرطیکہ پہلے اتفاق نہ ہوا ہو۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((اذاالقي في قلب احدكم خطبة امرأة فلينظرالي ما يدعوه الي نكاحها))

کہ جب تم میں سے کسی کے دل میں کسی عورت کو نکاح کا پیغام بھیجنے کا خیال پیدا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ چیز دیکھے کہ جو اس کو نکاح کی طرف بلاتی ہے۔" پہلے سے اتفاق کے ساتھ ہو تو پھر چہرہ اور ہاتھوں کے علاوہ دیکھنا جائز نہیں ہے۔

سوال عورت اگر اپنے کچھ بال کٹوالے تو اس کا کیا حکم ہے؟[فتاوی المدینہ:۹]

جواب عورت کے بال کٹوانے کے سبب کی طرف دیکھا جائے گا' اگر تو اس لیے کاٹتی ہے تاکہ کافر و فاسق عورتوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرے تو اس نیت کی وجہ سے کاٹنا جائز نہیں ہے۔اگر ہلکا کرنے کے لیے کاٹتی ہے یا اپنے شوہر کے رغبت رکھنے کی وجہ سے کٹوائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے:

((ان نساء النبی کن یاخذن من شعورھن حتی تکون کالوفرۃ))

نبی کی عورتیں اپنے بال کٹواتی تھیں یہاں تک کہ ان کے بال وفرہ ہوتے تھے۔

سوال جب عورت اپنے چہرے کے بال نوچے اور بھویں اکھیڑے تو کیا اس وقت اس پر واجب ہے چہرہ ڈھانپنا؟[فتاوی المدینہ:۸]

جواب جی ہاں! اس حالت میں تو چہرے کا پردہ ہر صورت میں ضروری ہے۔

بالوں کے نوچنے کا حرام ہونا اور چہرہ ڈھانپنا ان میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔جب ہم یہ کہیں کہ مطلق طور پر بال نوچنا حرام ہے تو چہرہ ڈھانپنا واجب ہوگا۔ جب ہم یوں کہیں کہ تھوڑا سا نوچنا جائز ہے تو ایسی صورت میں چہرہ نہ ڈھانپنا بھی اس کے لیے جائز ہوگا لیکن نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((لعن اللہ النامصات و المتنمصات......))

اللہ کی لعنت ہو بھویں باریک کرنے والی پر اور کروانے والی پر اور اس حدیث کے آخر میں اس کی علت بیان کی "المغیرات لخلق اللہ للحسن" کہ خوبصورتی کے لیے اللہ کی مخلوق کو بدلنے والی تو یہ دلیل ہے کہ لعنت کا سبب کثرت یا قلت نہیں ہے

بلکہ اللہ کی مخلوق کو بدلنا علت ہے۔ جب عورت اپنے بھنویں نوچے گی تو اس پر اللہ کی لعنت ہو گی کیونکہ لعنت اس کام کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ بعض اہل علم حرمت کو صرف بھنویں نوچنے کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور بعض صرف چہرے کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔

لیکن درست یہ ہے کہ حدیث پہ مطلق طور پہ عمل کرنا چاہئے۔ مرد کے بجائے عورت کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے جسم کے کچھ بال نوچے۔ علاوہ اس کے کہ جس کی نص آئی ہے۔ نص کے عموم کی وجہ سے۔

سوال یہ سوال کثرت سے کیا جاتا ہے کہ عورت کے بازوؤں پر بال ہوں اور اس کا شوہر ناپسند کرتا ہو کیا ان بالوں کو نوچنا جائز ہے؟

جواب یہ نوچنا اللہ کی مخلوق تبدیل کرنے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زیادہ بالوں والا بنایا تو واجب ہے کہ آپ اللہ کی پیدائش پر راضی ہوں اور اسے تبدیل نہ کریں مگر جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہو کہ جیسے بغلوں کے بال اکھیڑنا۔

آج کل عورتیں عاریتاً بال لگوانے کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ تو بعض کہتے ہیں کہ جائز ہے کیونکہ عورت اپنے آپ کو خوبصورت بنانے کے لیے ایسا کرتی ہے کہ شوہر خوش ہو جائے۔ ''لعن اللہ النامصات......'' اس طرح کی حدیثوں کے بعض طرق میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

((لعن اللہ الواصلات والمستوصلات))

اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے بال ملانے والیوں پر اور ملوانے والیوں پر اور ''صحیح'' میں ایک حدیث آتی ہے کہ ایک عورت نبی اکرم ﷺ کے پاس آئی کہنے لگی کہ اس کی بیٹی کی کسی بندے کے ساتھ شادی ہوئی ہے لیکن اس کے بال گر رہے ہیں تو کیا اس کے لیے جائز ہے کہ اس کے ساتھ دوسرے بال ملا لے؟ تو آپ نے فرمایا:

((لعن اللہ الواصلات والمستوصلات))

اللہ کی لعنت ہے بال ملانے والیوں پر اور ملانے والیوں پر اور یہ جو بات ہے کہ بھنویں باریک کروانا یا دانتوں میں فاصلہ کروانا یہ تخصیص نہیں ہے بلکہ عام نص کے مفردات میں سے ہے۔ تو نص کے عموم سے یہی علت ملتی ہے:

((المغیرات لخلق اللہ للحسن))

کہ خوبصورتی کے لیے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو بدلنے والی۔ اس آخری جملہ سے ہمیں دو اہم فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

پہلا فائدہ: کہ جس تغییر کی وجہ سے اس کے کرنے والے پر لعنت کی گئی ہے۔ اس کی علت حسن کی وجہ تغییر کرنا ہے۔ ہاں اگر تغییر کسی ضرر کو رفع کرنے کے لیے ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

دوسرا فائدہ: آپ علیہ السلام کا فرمان: ''المغیرات لخلق اللہ'' یہ ہر قسم کی تبدیلی کو شامل ہے۔ تو لائق ہے اس حکم کی طرف سب متنبہ ہوں یہ حکم مردوں' عورتوں سب کو عام ہے۔ بعض لوگوں کے گالوں پر بال آتے ہیں وہ انہیں منڈوا دیتے ہیں۔ تو وہ بھی اس میں شامل ہیں تو یہ ساری چیزیں اللہ کی مخلوق میں شامل ہے۔ جیسے حدیث ہے۔ آپ علیہ السلام نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کی نیچے کی چادر اس نے لمبی چھوڑ رکھی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''ارفع ازارك'' اپنی چادر اونچی کرو تو اس نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میرا پاؤں ٹیڑھا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

((کل خلق اللہ حسن))

''اللہ کی ہر مخلوق خوبصورت ہے۔''

سوال ٹیلی ویژن اور رسائل میں عورتوں کی تصاویر دیکھنے کا کیا حکم ہے؟ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہ جس میں یہ ہے کہ وہ حبشیوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔ [فتاویٰ الامارات: ۱۰۸]

جواب بعض لوگ عورت کی تصویر دیکھنے کو مباح سمجھتے ہیں کہ تصویر دیکھنے کا مطلب

ایک خیال ہے۔عورت کی شخصیت کی طرف دیکھنا حقیقت کو دیکھنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ حیلہ بازی ہے۔ ورنہ عورت کی تصویر میں ٹیلی ویژن کی تصویر میں اور حقیقی عورت دیکھنے میں کیا فرق ہے؟ فقہاء کہتے ہیں عورت کی تصویر دیکھنا کیوں حرام ہے؟ وہ کہتے ہیں فتنہ کے ڈر سے اور یہ فتنہ عورت کی تصویر میں بھی ہے اور شخصیت میں بھی ہے۔

سیدہ عائشہ کا حبشیوں کی طرف دیکھنا تو یہ ان کو معاف ہے اور اگر کوئی اور دیکھے تو اسے بھی معاف ہے کیونکہ ایسی صورت میں کھیل کی طرف دیکھ رہی تھی' نہ کہ ان لوگوں کی شخصیت کی طرف۔ گویا یہ عورت لڑائی کے معرکہ کی طرف دیکھ رہی ہے۔ ایسی صورت میں عورت پر کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ فتنہ کا خوف نہیں ہے۔

اس وقت یہ حدیث اس قرآنی نص:

﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوْجَهُمْ﴾ [النور: ۳۰]

''مومنوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نظریں جھکا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں''

اور دوسرا فرمان:

﴿وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ﴾ [النور: ۳۱]

''کہ مومن عورتوں سے کہہ دو وہ اپنی نظریں جھکا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔'' تو یہاں نظر سے مراد دلی ارادہ ہے اگر برے ارادہ سے دیکھنا مقصود ہو تو اس کا یہ حکم ہے۔اگر حسن اتفاق سے نظر پڑ جائے تو اس کا یہ حکم نہیں ہے۔

جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے ''علی ابن ابی طالب سے کہا کہ ''یاعلی لَا تُتْبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ فَاِنَّ لَكَ الْاُولٰی لك' والثانيه عليك''

''اے علی رضی اللہ عنہ نظر کے پیچھے نظر نہ لگا بے شک پہلی بار دیکھنا تو جائز ہے اور دوسری بار دیکھنا تیرے خلاف حجت ہے۔''

یعنی جس شخص نے نظر گھما کہ عورت کی ذات کی طرف دیکھا تو یہ فتنہ شمار ہوگا۔

خثعمیہ عورت کی جو حدیث "بخاری" میں ہے کہ جب وہ کھڑی ہوکر نبی اکرم ﷺ سے پوچھ رہی تھی کہ فریضہ حج نے میرے باپ کو پالیا حالانکہ وہ خود بوڑھے ہیں۔ سواری پر بیٹھ نہیں سکتے۔ تو کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپ ﷺ نے اس سے کہا "فحجی عنه" تم اس کی طرف سے حج کرلو۔ نبی اکرم ﷺ کے پیچھے سواری پر فضل بن عباس بیٹھے تھے تو فضل اس عورت کو دیکھ رہا ہے۔ عورت فضل کو دیکھنے لگ گئی تو نبی اکرم ﷺ فضل کا چہرہ دوسری طرف پھیر دیتے تھے کہ کہیں ان دونوں کے درمیان شیطان داخل نہ ہو جائے۔

جس طرح مرد کے لیے جائز نہیں ہے کہ تکرار کے ساتھ عورت کی طرف دیکھے۔ اسی طرح عورت کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ تکرار کے ساتھ کسی مرد کی طرف دیکھے۔ سوائے نکاح کے پیغام کے وقت کے۔

سوال محرم کے بغیر عورتوں کے پرامن قافلہ کے ساتھ عورت کے سفر کا کیا حکم ہے؟ جبکہ بعض لوگ اس کے جواز کے لیے اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ ((ان الظعینة تسیرمن الیمن الی العراق لاتخشی الا الله والذائب علی الغنم؟))

[فتاویٰ الامارات:۵۸']

جواب اس حدیث میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے کہ جو اکیلے سفر کرنے والی عورت کے سفر کے جواز پر دلالت کرے کیونکہ شرعاً اس طرح کی کوئی حدیث نہیں آئی بلکہ یہ ایک غیبی خبر ہے اور غیبی خبروں کا دارومدار خبر دینے پہ ہوتا ہے' چاہے خبر ممدوح ہو یا مذموم جیسے نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے۔

((لا تقوم الساعة حتی یتسافدالناس فی الطرقات تسافدالحمیر))

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی کہ جب تک لوگوں میں زنا اس طرح سے ہوجائے گا کہ جس طرح گدھے آپس میں ملتے ہیں سرعام۔ اب اس میں ایک خبر ہے کہ جو واقع ہوگی لیکن یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ کام جائز ہوجائے گا اور جس حدیث سے

انہوں نے استدلال کیا ہے اس کے الفاظ بے شمار ہیں مثلاً:

((لاتسافر المرأة سفراً ثلاثة ایام الا ومعها محرم))۔

اور بعض روایات میں ''یومین''

کے الفاظ ہیں اور بعض روایات بالکل مطلق ہے۔ جیسے فرمایا:

((لاتسافر امرأة سفراً الا ومعهامحرم))۔

کوئی عورت سفر نہ کرے مگر اس کے ساتھ محرم ہو۔ پھر بات یہ ہے کہ عورت کے اکیلے سفر کرنے پر دل بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ حقیقت میں۔

امام ابن حزم کی کتاب ہے ''طوق الحمامۃ'' میں لکھتے ہیں کہ یورپ کے ممالک سے سے کچھ عورتیں کسی کام کے لیے نکلیں اور حج بھی ان عورتوں نے کیا۔ واپس جاتے ہوئے کشتی میں سفر کے دوران کشتی میں کام کرنے والوں میں سے ایک کے ساتھ وہ برائی میں واقع ہو گئیں۔

محرم کی دو قسمیں ہیں...... ایک محرم لذاتہ اور دوسرا محرم لغیرہ۔

مثلاً نبی اکرم ﷺ نے عورت کی طرف دیکھنے اور کان لگا کر ان کی باتیں سننے سے منع فرمایا ہے۔ اس ذریعہ کے سدباب کی وجہ سے تو یہ لازمی نہیں ہے کہ جو عورت بھی محرم کے علاوہ سفر کرے گی وہ ضرور برائی میں واقع ہوگی۔ یا عورتوں کی ایک جماعت بغیر محرم کے سفر کرے تو وہ برائی میں واقع ہو جائیں گیں لیکن یہ شرط اس لیے لگائی کہ کہیں خدانخواستہ برائی میں واقع ہو جائیں لیکن کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کوئی بھی عورت ہوائی جہاز میں ایک گھنٹہ یا آدھا گھنٹہ سفر کرے اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ عین ممکن ہے، اس سفر کے دوران وہ عورت برائی میں واقع ہو جائے جبکہ ایسے واقعات وقوع پذیر ہوئے ہیں۔

سوال کیا عورت کے لیے جائز ہے کہ مردوں کو مصافحہ کیے بغیر سلام کرے؟

[فتاوی الامارات: ١٠٤]

جواب فقہاء کے نزدیک اس مسئلہ میں تھوڑی تفصیل ہے۔ واللہ اعلم۔ نوجوان عورت

کے لیے جائز نہیں کہ وہ لوگوں کو سلام کرے۔

ہاں اگر کوئی عورت بڑی عمر کی ہو اور اس کے سلام کرنے سے فتنہ کا خدشہ نہ ہو تو کوئی حرج نہیں کہ وہ سلام کرسکتی ہے۔ جس طرح بوڑھی عورت کو سلام کیا بھی جا سکتا ہے۔سلف صالحین سے بھی یہ چیز نہیں ملتی کہ وہ جب گزرتے ہوں تو اس طرح بغیر تفریق کے سلام کرتے ہوں۔

جوان عورت کی طرف سے مردوں کو سلام کرنے کا حرام ہونا یہ سدالذریعہ میں سے ہے۔اس قاعدے کی بہت ساری دلیلیں ہیں۔ان میں سے سب سے واضح تر یہ دلیل یہ حدیث ہے۔

((كتب على ابن آدم حظه من الزنا فهو مدركه لامحالة فالعين تزني وزناها النظروالاذن تزني وزناهاالسمع واليد تزني وزناها البطش' والرجل تزني وزناها المشي والفرج مصدق ذالك كله أو يكذبه))

ابن آدم پر اس کے زنا کا حصہ لکھ دیا گیا تو ہر حالت میں وہ اسے پائے گا۔آنکھ زنا کرتی ہے، اس کا زنا دیکھنا ہے، کان زنا کرتا ہے،اس کا زنا سننا ہے، ہاتھ زنا کرتا ہے اس کا زنا پکڑنا ہے، پاؤں زنا کرتا ہے اور اس کا زنا چل کر جانا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ یا اسے جھٹلاتا ہے۔صحیح سند کے ساتھ ''ابوداؤد'' میں ایک روایت ہے۔

((الرجل تزني......والفم يزني وزناه القبل))

کہ پاؤں زنا کرتا ہے اور منہ زنا کرتا ہے' منہ کا زنا کرنا بوسہ لینا ہے۔اس حدیث میں دونوں کے قسم کے محرمات کا بیان ہے۔ پہلا: کہ غیر کی وجہ سے جسے حرام قرار دیا گیا ہو......دوسرا: کہ جو ذاتی طور پر حرام ہو۔

سوال کوئی شخص کبھی کبھار کسی کو فون کرتا ہے۔آگے سے گھر کی کوئی عورت فون اٹھاتی ہے تو یہ اس شخص 'اس کے والد یا بھائی یا کسی اور کا پوچھتا ہے ۔اگر وہ موجود بھی ہو تو کیا اس میں بھی گناہ ہے؟ [فتاویٰ الامارات:١٠٥]

جواب یہاں اسی صورت میں بات کرنا مجبوری ہوتی ہے تو بہتر ہے کہ پہلے سلام کرے۔ اصل تو یہ ہے کہ کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ بات نہ کرے کیونکہ یہ سد ذریعہ میں سے ہے اور اگر اس کے پیچھے فتنہ کا خوف نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح سے اگر کوئی عورت اپنی بہن یا سہیلی سے بات کرنے کے لیے فون کرے، آگے سے اس کے ساتھ کوئی مرد بات کرے تو یہ عورت اپنی ضرورت کے بارے میں اس سے پوچھ لے اور جب عورت کے لیے مرد سے بات کرنا ضروری ہو تو اسے چاہیے کہ پہلے سلام کرے کیونکہ بعض احادیث میں آتا ہے ''آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

((من بدء الكلام قبل السلام فلا تجيبوه))۔

کہ جو شخص سلام سے پہلے بات کرنا شروع کرے تو تم اسے جواب نہ دو۔

سوال بڑی عمر کی عورت ہو تو کیا اس کو مصافحہ کرنا یا خلوت کرنا یا بیمار ہو تو تیمارداری کرنا جائز ہے؟[فتاویٰ المدينه:۸۸]

جواب ممکن ہے کہ ہم اس کے جواز کا فتویٰ دے دیتے کہ جب ہمیں یہ قول یاد نہ ہوتا۔

((لكل ساقطة في الحي لاقطة))

کہ ہر گرنے والی کے لیے زندہ لوگوں میں اٹھانے والے ہیں۔ تو اس لیے بہتر ہے کہ اس سے دوری اختیار کی جائے۔

سوال مسلمانوں کے گھروں میں غیر مسلم مردوں اور عورتوں کے خدمت کرنے کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ الامارات:۱۰۷]

جواب مسلمان مرد کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر میں کسی کافر عورت کو لائے، اس لیے کافر عورت مسلمان عورت کی ستر والی چیزوں پر مطلع ہو جائے گی۔ تو مومنہ عورت کے مقابلہ میں کافرہ عورت آدمی کی منزلت پر ہے۔ تو مسلمان عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کافرہ عورت کے سامنے ظاہر کرے سوائے چہرے اور ہاتھوں کے۔

توجب کافرہ عورت کا یہ حکم ہے تو کافر مرد تو بالاولیٰ رکھنا جائز نہیں ہے۔ اگر میاں بیوی کا خادم کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو تو لازم ہے کہ ایسی عورت رکھیں کہ جو مسلمان ہو۔

سوال ایک مسلمان عورت اپنے بچے مسلم خادموں یا تربیت کرنے والوں کے پاس، چھوڑ کر گھر سے باہر جا کر کوئی مباح کام کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ [فتاویٰ الامارات: ۱۰۰]

جواب اس مسئلہ میں اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امت کی عورتوں کو مخاطب کر کے کہا:

﴿وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى﴾۔[الاحزاب: ۳۳]

تم سب اپنے اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور جاہلیت والی زینت اختیار نہ کرو۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ مرد کے لیے ہے اصل نکلنا' باہر جانا اور عورت کے حق میں اصل یہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھی رہے باہر نہ نکلے' سوائے مجبوری کے۔ ''صحیح بخاری'' میں ایک حدیث ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لیے پردے کا حکم نازل فرمایا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((قَدْ أَذِنَ اللّٰهُ لَكُنَّ أَنْ تَخْرُجْنَ لِحَوَائِجِكُنَّ))۔

تحقیق تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ تم اپنی ضرورت کے لیے باہر نکلو۔ جب عورت خوشبو لگائے بغیر اور شرعی پردہ کر کے کسی کام سے گھر سے نکلے تو یہ جائز ہے۔ اگر ان واجبات میں سے کوئی چیز چھوڑ کر ایسے گھر سے نکلے گی تو ایسی عورتوں کے لیے حکم یہ ہے کہ ''وقرن فی بیوتکن'' تو ایسی عورتوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ گھر سے باہر نکلیں اور بچوں کو خاوندوں کے حوالے کر دے۔ ماں سب سے زیادہ پہچان اور خیال رکھنے والی ہوتی ہے اور اپنے بچوں کی ضروریات کے لحاظ سے۔

سوال کیا پڑھانا یا ڈاکٹری کرنا یہ شرعی ضروریات میں سے ہے' ان کی وجہ سے اپنے بچوں کو خدمت کرنے والوں کے پاس چھوڑا جا سکتا ہے؟ [فتاویٰ الامارات: ۱۰۱]

جواب جب وہاں کوئی اور ایسی صورت نہ ہو کہ جوان بچیوں کو ضروری تعلیم دے سکے تو ایسی اہم ضرورت کی وجہ سے اس عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے گھر سے نکلے اور

اپنی ہی ہم جنسوں کو تعلیم دے لیکن مذکورہ شرائط کے ساتھ کہ وہاں مردوں کے ساتھ اختلاط والی صورت نہ بنے۔

سوال اگر عورتیں طب اور پڑھائی کے میدان میں نہیں جائیں گی تو دوسری عورتوں کے مسائل کون حل کرے گا؟ بیماری وغیرہ کی صورت میں اور قاعدہ بھی ہے ''ضرورتیں ممنوع چیزوں کو مباح کرتی ہیں۔'' اگرچہ پڑھائی کے دوران وہ لڑکی غیر شرعی معاملات کا شکار بھی ہو سکتی ہے؟ تو اس کا ہم رد کیسے کریں؟ [فتاویٰ الامارات:۲۰۱]

جواب اس قاعدہ سے استدلال کرنے کو میں درست نہیں سمجھتا۔ کیونکہ ضرورتیں ممنوعات کو جائز کردیتی ہیں کہ جن کا تعلق افراد کے ساتھ ہو اور یہ قاعدہ اس آیت سے ماخوذ ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنزِيرِ﴾

تو لازمی ہے کہ ہم یہاں دو چیزوں پر نوٹ لکھیں:

پہلا: جب انسان مکلّف ہو کسی چیز میں تو مجبور ہو جائے اس طرف کہ وہ کسی چیز میں واقع ہو کہ جس میں حرمت کی دلیل نہ ہو تو ایسی چیز میں کہا جاتا ہے کہ ضرورتیں ممنوعات کو مباح کردیتی ہیں۔

دوسرا: کسی چیز میں واقع ہونے کے بعد یہ نہیں کہا جاتا کہ ''الضرورات تبیح المحظورات'' بسا اوقات مستقبل میں ایسی چیزیں پیش آتی ہیں تو ہمارے لیے لائق نہیں کہ ہم اپنے نفسوں کو ہلاکت کے سامنے پیش کریں۔ انسان اگر کسی جماعت میں داخل ہوا سے معلوم ہو کہ وہ حرام میں واقع ہو سکتا ہے تو یہاں اس قاعدے کے پیش نظر وہ اپنے آپ کو بری سمجھے۔ اسی طرح علماء نے اس قاعدہ کو دوسرے قاعدہ کے ساتھ مقید کردیا کیونکہ اندازے کے مطابق مقرر ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص مردہ کھانے کے لیے مجبور ہو جائے تو وہ ایسے بیٹھ کر نہ کھائے کہ جس طرح تازہ حلال گوشت کھایا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ واجب کفائی ہے۔ یہاں مسلمان ڈاکٹرز عورتیں ہوں۔ لیکن اگر

وجوب کفائی کو حاصل کرنے میں بھی غیر شرعی کام میں ملوث ہونا پڑے تو ایسا جائز نہیں ہے۔اسی طرح ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم اپنی عورتوں اور نوجوان بچیوں کو دیکھنے کے باوجود فساد اور فتنہ میں ڈالیں'یونیورسٹیوں اور اس طرح کے اداروں میں باوجودیکہ ہم اسے فرض کفائی سمجھتے ہیں ۔یہ لازمی نہیں ہے کہ یونیورسٹیوں اور مدارس میں پڑھنے والی سب بچیاں وہیں مقیم ہوں بلکہ جن کے پاس سہولت میسر ہو تو وہ اس فرض کفایہ کے ساتھ قائم ہوں۔ دوسری عورتیں اس فرض کفایہ کو اگر پورا نہ کریں تو ان سے اس کے متعلق پوچھ گچھ نہیں ہوگی۔

سوال کسی مرد ڈاکٹر کا عورت کی ڈلیوری کرنے کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ الامارات:۳۰]

جواب بچہ جننے کے لیے عورت کا ہسپتال میں داخل ہونا مطلق طور پر جائز نہیں ہے۔ بلکہ مجبوری وغیرہ کا ہونا لازمی ہے۔ اگر لیڈیز ڈاکٹر اپنے علم تجربے کے مطابق یہ فیصلہ کرے کہ اس عورت کا بچہ طبی طور پر نہیں ہوگا بلکہ بچہ کی ولادت آپریشن کے ذریعہ ہوگی تو اس حالت میں اس عورت کو ہسپتال منتقل کیا جائے گا۔ ہاں جب طبی طور پر ولادت ہوسکتی ہے تو ایسی عورت کو ہسپتال منتقل نہیں کرنا چاہیے۔جب مجبوری کی صورت میں عورت ہسپتال میں داخل ہو تو لازم ہے کہ اس کی نگرانی لیڈیز ڈاکٹر کرے۔ اگر نہ ہو تو پھر مرد ڈاکٹر ولادت کروا سکتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بلکہ خطرہ کی صورت میں واجب ہے ۔ڈاکٹر وہاں موجود رہے کہ جب تک لیڈیز ڈاکٹر نہیں آجاتی اور یہ جواب اصول فقہ کے قاعدے ماخوذ ہے۔"الضرورات تبیح المحظورات "تو جب عورت کے لیے گھر میں بچہ جننا ممکن ہو تو اس کے لیے ہسپتال کی طرف جانا جائز نہیں ہے۔سوائے مجبوری کے۔کیونکہ اصل یہ ہے کہ عورت گھر سے کام کے علاوہ نہ نکلے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى﴾

[الاحزاب:۳۳]

دوسرا نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((قَدْ أَذِنَ اللّٰهُ لَكُنَّ أَنْ تَخْرُجْنَ لِحَوَائِجِكُنَّ))

تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہیں اجازت دی ہے کہ تم صرف اپنی ضرورت کی وجہ سے نکلو۔

سوال کیا کسی شخص کے لیے جائز ہے کہ وہ ڈاکٹر کو اجازت دے کہ وہ اپنا پانی اس کی بیوی میں منتقل کرے؟[فتاویٰ الامارات: ٦٩]

جواب نہیں قطعاً جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس منتقلی میں کم از کم یہ تو لازم آئے گا کہ ڈاکٹر کے سامنے اس کی بیوی کا ستر کھلے گا اور اپنی بیوی کے علاوہ دوسری عورتوں کے پوشیدہ معاملات پہ مطلع ہونا جائز نہیں ہے اور جو چیز شرعاً جائز نہیں ہے۔ ضرورت کی وجہ سے اس کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔ ضرورت کے مطابق اور ہم تصور نہیں کر سکتے کہ یہاں اس شخص کی ضرورت کی وجہ سے ہم اس طرح کے حرام طریقہ سے اس کے لیے پانی منتقل کرنا جائز قرار دیں کیونکہ بسا اوقات ڈاکٹر مطلع ہو جاتا ہے۔ آدمی کی ستر کی جگہ پر اور یہ جائز نہیں ہے۔

اور اس طریقہ پر چلنا یہ یورپ والوں کی تقلید ہے۔ ہر اس چیز میں کہ جس پر وہ آتے ہیں اور جسے وہ چھوڑتے ہیں اور اس انسان کو گویا کہ اولاد طبی طریقہ سے نہیں دی گئی۔ مطلب کا یہ انسان اللہ کے فیصلہ پر خوش نہیں ہوا۔ جب نبی اکرم ﷺ سب مسلمانوں کو اس بات پر ابھارتے ہیں کہ حلال و جائز طریقہ سے رزق حاصل کرو تو اس سے کہیں زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ حلال و جائز طریقہ سے اولاد حاصل کی جائے۔

سوال لڑکی کے ختنہ کروانے کا کیا حکم ہے؟[فتاویٰ الامارات: ٨٩]

جواب عورت کا ختنہ کروانا نبی اکرم ﷺ کے دور میں معروف تھا۔ تو یہ ختنہ عورت کی نسبت کے لحاظ سے ہے۔ بعض عورتوں کو ختنہ کروانے کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض عورتوں کو ختنہ کروانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تو بعض کے حق میں سنت ہے۔

سوال عورت کا ختنہ کروانا واجب ہے یا مستحب ہے؟[فتاویٰ المدینہ: ١١٦]

جواب نبی اکرم ﷺ سے کئی ایک حدیثوں میں ثابت ہے کہ آپ نے عورتوں کا ختنہ کروانے کی ترغیب دی ہے ختنہ کرنے والی عورت کو حکم دیا ہے کہ وہ ختنہ میں مبالغت نہ کرے۔ ختنہ کا حکم علاقہ کے حساب سے مختلف ہو جاتا ہے۔ عورت کا جو ٹکڑا ختنہ میں کاٹا جاتا ہے، کبھی کبھار وہ ظاہر ہوتا ہے، واضح ہوتا ہے اور کبھی کبھار ظاہر نہیں ہوتا اور یہ ٹھنڈے علاقوں میں ہوتا ہے۔ اگر اتنی کھال ہو کہ جو کاٹنے کے مستحق ہو تو کٹے گی، ورنہ نہیں۔

حج بیت اللہ اور عمرہ

کے متعلق چند

اہم فتاویٰ

تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اور درود و سلام ہو اللہ کے رسول محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی آل اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اور ان تمام لوگوں پر جنھوں نے آپ ﷺ کا راستہ اختیار کیا۔ امابعد!

چند مسلمان بھائیوں نے حج اور عمرہ سے متعلق چند سوالات کیے ہیں جن کے جوابات مندرجہ ذیل ہیں۔ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ مسلمان بھائیوں کو ان سے فائدہ پہنچائے اور ان کو دین کی سمجھ دے۔ اللہ ہی دعاؤں کا سننے والا اور اپنے بندوں کے قریب ہے۔

سوال نسک (اعمال حج وعمرہ) کی تین قسمیں کون سی ہیں، انہیں کیسے ادا کیا جاتا ہے اور حج کی کون سی قسم افضل ہے؟

جواب اہل علم نے نسک یعنی اعمال حج کی تین صورتیں بتائی ہیں اور ان میں سے ہر صورت رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ثابت ہے۔

پہلی صورت: صرف عمرہ کا احرام باندھنا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ عمرہ کرنے والا (اللهم لبيك عمرة) یا (لبیك عمره) یا (اللهم انى اوجبت عمرة) کہے۔ اس کا مشروع طریقہ یہ ہے کہ اگر عمرہ کرنے والا مرد ہے تو اپنے سلے ہوئے کپڑے اتار دے، ناف کے نیچے کے بال صاف کرے، بغل کے بال صاف کرے، ناخن تراشے اور مونچھوں کے بال کاٹے، اس کے بعد نہائے، اس لیے کہ نہانا شرعی طور پر مطلوب ہے، خوشبو لگائے اور پھر احرام کے کپڑے پہنے۔ یہی افضل طریقہ ہے۔

عورت کے لیے احرام کا کوئی خاص کپڑا نہیں۔ کوئی بھی کپڑا پہن کر احرام کی نیت کر سکتی ہے لیکن افضل یہی ہے کہ اس کے کپڑے جاذب نظر، خوبصورت اور ایسے نہ ہوں جن سے دیکھنے والے فتنہ میں مبتلا ہوں۔

اگر محرم (اللهم لبيك عمرة) کے بعد یہ کہنا چاہے کہ اگر (راستہ میں) کوئی مانع

پیش آ گیا تو میرا احرام وہیں کھل جائے گا یا یہ کہے کہ یا اللہ میری طرف سے اس عمرہ کو قبول کر یا یہ کہے کہ یا اللہ اسے اچھی طرح ادا کرنے میں میری مدد کر تو کوئی حرج نہیں۔

اگر محرم یہ کہے کہ اگر مجھے کوئی مانع پیش آ گیا تو میرا احرام وہیں کھل جائے گا یا اسی طرح کی کوئی اور عبارت کہے اور اس کے بعد کسی حادثہ کی وجہ سے عمرہ کے اعمال مکمل نہ کر سکا تو اس کے لیے احرام کھول دینا جائز ہوگا اور اس پر کوئی جرمانہ واجب نہ ہوگا، اس لیے کہ ضباعہ بنت الزبیر بن عبدالمطلب رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور کہا کہ میں بیمار ہوں، تو آپ نے فرمایا: "حج کی نیت کرو اور یہ شرط کر لو کہ اگر بیماری نے مجھے کسی جگہ روک دیا تو میرا احرام وہیں کھل جائے گا۔" یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

بنا بریں اگر کوئی عورت عمرہ کے لیے روانہ ہوتی ہے اور یہ شرط لگاتی ہے۔ اس کے بعد اسے ماہواری آ جاتی ہے اور ہمراہیوں کی وجہ سے طہارت کے وقت تک انتظار نہیں کر سکتی تو اس کے لیے یہ شرعی عذر ہوگا اور احرام کھول دینا جائز ہوگا۔

اسی طرح اگر محرم کو کوئی بیماری ہو جائے یا کوئی ایسا حادثہ لاحق ہو جائے جو اسے عمرہ کے اعمال پورے نہ کرنے دے تو یہ عذر شرعی ہوگا اور احرام کھول دینا جائز ہوگا۔

یہی حکم حج کا بھی ہے۔ حج کی مذکورہ بالا اقسام میں سے دوسری صورت یہ ہے کہ حج کرنے والا یوں کہے: (اللهم لبيك حجاً) یا (لبيك حجاً) یا (اللهم قد أوجبت حجاً) لیکن افضل یہ ہے کہ اس تلبیہ کی ادائیگی غسل، خوشبو اور احرام کا کپڑا پہن لینے کے بعد ہو، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان امور میں حج اور عمرہ کا ایک ہی حکم ہے۔ مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے سنت یہی ہے کہ احرام کی نیت غسل، خوشبو اور ان کاموں کے بعد کرے جو احرام کے وقت کرنے کے ہیں اور اگر یہ کہنے کی ضرورت محسوس کرے کہ میرا احرام وہیں کھل جائے گا جہاں کوئی مانع پیش آئے گا تو عمرہ کرنے والے کی طرح اس کے لیے بھی ایسا کہنا جائز ہے۔

اگر آدمی نجد، طائف یا مشرق کی طرف سے آیا ہے تو طائف کے میقات "سیل"

(وادی قرن) سے احرام باندھے، اگر کسی نے میقات سے پہلے ہی احرام کی نیت کر لی تو بھی نیت واقع ہو جائے گی اور اس کی پابندی ضروری ہوگی لیکن ایسا کرنا مناسب نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے میقات سے احرام کی نیت کی تھی، چنانچہ سنت یہی ہے کہ جب میقات پر پہنچے تو احرام باندھے۔

اگر کسی نے اپنے گھر میں یا میقات پر پہنچنے سے پہلے راستہ میں کسی جگہ غسل، خوشبو اور دیگر امور سے فراغت حاصل کر لی اور احرام کی نیت اور ان امور کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں گزرا ہے تو کوئی حرج نہیں۔

جمہور اہل علم کی رائے ہے کہ احرام سے قبل دو رکعت نماز پڑھنا مستحب ہے۔ ان کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے: ''میرے پاس میرے رب کا فرشتہ آیا اور کہا کہ اس مبارک وادی میں نماز پڑھیں اور کہیں کہ میں حج کے ساتھ عمرہ کا ارادہ بھی کرتا ہوں'' اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے اور یہ واقعہ وادی ذی الحلیفہ کا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی نماز کے بعد احرام کی نیت کی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نماز کے بعد احرام کی نیت کرنا افضل ہے۔

جمہور کی یہ رائے اچھی ہے لیکن احرام کے لیے نماز پڑھنے کے بارے میں کوئی نص صریح یا کوئی صحیح حدیث نہیں پائی جاتی، اس لیے اگر کوئی شخص پڑھتا ہے تو کوئی حرج نہیں اور اگر کسی نے وضو کیا اور وضو کی سنت کے طور پر دو رکعت نماز پڑھ لی تو یہی دو رکعتیں احرام کے لیے کافی ہوں گی۔

نسك کی تیسری صورت یہ ہے کہ حج اور عمرہ کی نیت ایک ساتھ کی جائے۔ ایسی صورت میں حج کرنے والا کہے: (اللهم لبيك عمرة وحجاً) یا (اللهم لبيك حجاً وعمرة) یا ایسا کرے کہ میقات پر صرف عمرہ کے لیے تلبیہ کہے اور پھر راستہ میں حج کی بھی نیت کر لے اور طواف کرنے سے پہلے حج کے لیے تلبیہ کہے۔ اسے حجِ قران کہتے ہیں، یعنی حج اور عمرہ کو جمع کرنا۔

نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع میں حج قران کی نیت کی تھی جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خبر دی ہے کہ نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع میں (ھدی) یعنی قربانی کے جانور ساتھ لے گئے تھے۔ اس لیے قربانی کا جانور ساتھ لے جانے والے کے لیے یہی افضل ہے لیکن اگر کوئی شخص جانور ساتھ نہیں لے گیا ہے تو اس کے لیے افضل حج تمتع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہی آخری فیصلہ تھا، چنانچہ جب آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور طواف اور سعی سے فارغ ہوگئے تو حج قران یا حج افراد کرنے والے صحابہ کو حکم دیا کہ صرف عمرہ کریں تو لوگوں نے طواف وسعی کیا اور بال کٹوا کر حلال ہوگئے اور اس طرح یہ بات طے پاگئی کہ حج تمتع افضل ہے اور یہ کہ اگر قارن یا مفرد پہلے عمرہ کی نیت کرلیتا ہے تو وہ متمتع ہوجائے گا، یعنی اگر حج افراد یا قران کی نیت کرتا ہے اور اپنے ساتھ قربانی کا جانور نہیں لاتا ہے تو امر شرعی یہ ہے کہ طواف وسعی اور بال کٹوانے کے بعد حلال ہوجائے گا اور اس کا حج، حج تمتع میں بدل جائے گا، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا اور فرمایا کہ جو کچھ مجھے اب معلوم ہوا ہے اگر پہلے معلوم ہوا ہوتا تو قربانی کا جانور نہ لاتا اور پہلے عمرہ کی نیت کرتا۔

اگر عمرہ کی نیت سے آنے والا حج کا ارادہ نہیں رکھتا تو اسے معتمر (عمرہ کرنے والا) کہتے ہیں۔ بعض اوقات اسے متمتع (عمرہ اور پھر حج کرنے والا) بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا ہے، لیکن فقہاء کی اصطلاح میں اس کو معتمر ہی کہا جائے گا، اگر اس نے حج کی نیت نہیں کی ہے، بلکہ ماہ شوال یا ذی القعدہ میں صرف عمرہ کی نیت سے آیا ہے اور پھر اپنے ملک کو واپس چلا جائے گا۔

لیکن اگر اس کے بعد مکہ مکرمہ میں حج کی نیت سے ٹھہر جاتا ہے تو متمتع ہوجائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص رمضان یا غیر رمضان میں عمرہ کی نیت سے آیا ہے تو اس کو معتمر کہا جائے گا، اور عمرہ بیت اللہ کی زیارت کو کہتے ہیں۔ متمتع اس کو کہتے ہیں جو

رمضان کے بعد(حج کے مہینوں میں) عمرہ کی نیت سے مکہ مکرمہ میں داخل ہو اور حج کا ارادہ بھی رکھتا ہو، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص حج قِران کی نیت سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوا اور حج کا انتظار کرتا رہا اور احرام نہیں کھولا تو اسے متمتع کہا جائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿فمن تمتع بالعمرة الی الحج فما استیسر من الھدی﴾ یعنی جو شخص عمرہ اور حج کی ایک ساتھ نیت کرے گا وہ قربانی کرے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ قارن کو متمتع بھی کہا جاتا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہی ثابت ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: (تمتع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالعمرة الی الحج) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ اور حج کی نیت کی اور تمتع کیا، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج قران کی نیت کی تھی۔

لیکن بہت سے فقہاء کے نزدیک متمتع وہ ہے جو عمرہ کے بعد احرام کھول دے اور آٹھویں ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھے اور اگر عمرہ اور حج کو جمع کر دیتا ہے اور احرام نہیں کھولتا تو وہ قارن ہے۔ بہرکیف اگر مطلب اور حکم واضح ہو تو پھر اصطلاحات کی کوئی زیادہ اہمیت باقی نہیں رہتی۔

تو یہ بات واضح ہوگئی کہ متمتع اور قارن کے مسائل ایک جیسے ہیں، دونوں پر قربانی واجب ہے اور اگر کوئی شخص قربانی کی طاقت نہیں رکھتا تو اسے ایام حج میں تین روزے رکھنے ہوں گے اور سات روزے اپنے ملک واپس جانے کے بعد اور دونوں ہی کو متمتع کہا جاتا ہے۔

لیکن سعی کے بارے میں دونوں کا حکم بدل جاتا ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک متمتع دو مرتبہ سعی کرے گا، پہلی سعی عمرہ کے طواف کے ساتھ اور دوسری حج کے طواف کے ساتھ۔ اس لیے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ (حجۃ الوداع میں) جن لوگوں نے عمرہ کے بعد احرام کھول دیا تھا اور حج تمتع کی نیت کر لی تھی انہوں

نے دو مرتبہ سعی کی۔ پہلی عمرہ کے طواف کے ساتھ اور دوسری حج کے طواف کے ساتھ۔ لیکن قارن صرف ایک سعی کرے گا۔ اگر طواف قدوم کے ساتھ سعی کر لیتا ہے تو وہی سعی کافی ہوگی ورنہ پھر حج کے طواف کے ساتھ سعی کرے گا۔ جمہور اہل علم کی یہی رائے ہے کہ متمتع دو مرتبہ سعی کرے گا اور قارن ایک مرتبہ اور یہ کہ قارن کو اختیار ہے کہ چاہے طواف قدوم کے ساتھ سعی کر لے، بلکہ یہی افضل ہے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے کیا تھا کہ آپ ﷺ نے طواف قدوم کے ساتھ سعی بھی کر لی تھی اور چاہے تو سعی کو مؤخر کر دے اور حج کے طواف کے ساتھ سعی کرے۔ یہ اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے سہولت پر مبنی امر ہے۔ فالحمدلله علي ذلك

ایک اور مسئلہ قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ اگر متمتع عمرہ کے بعد سفر کے لیے روانہ ہو جائے تو کیا قربانی ساقط ہو جائے گی؟ اس بارے میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مشہور اور ثابت ہے کہ قربانی ساقط نہ ہوگی۔ چاہے سفر کر کے اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ جائے یا کہیں اور جائے۔ عام دلائل سے اسی رائے کی تائید ہوتی ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اگر سفر کر کے ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں نماز قصر کرنی جائز ہو جاتی ہے اور پھر حج کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ واپس آئے تو مفرور ہو جائے گا اور قربانی ساقط ہو جائے گی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قربانی صرف اس وقت ساقط ہوگی جب سفر کر کے اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے کہ اگر عمرہ کے بعد وطن لوٹ جائے اور پھر حج کے لیے واپس آئے تو مفرور ہوگا اور قربانی واجب نہ ہوگی لیکن اگر وطن کے علاوہ کسی دوسری جگہ کا سفر کیا ہے، مثال کے طور پر حج اور عمرہ کے دوران مدینہ منورہ، جدہ یا طائف چلا جائے تو اس کا حکم متمتع کا ہوگا۔

دلائل کے اعتبار سے یہی رائے زیادہ بہتر اور واضح ہے۔ اس لیے کہ حج اور عمرہ کے دوران سفر کرنے سے متمتع کا حکم ختم نہیں ہوتا اور اسے قربانی دینی ہوگی۔ اس لیے

اگر عمرہ کے بعد مدینہ منورہ، طائف یا جدہ کا سفر کرتا ہے تو وہ متمتع ہی رہے گا، مفرد اسی صورت میں ہوگا کہ وطن واپس چلا جائے (جیسا کہ حضرت عمر اور ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے) اور پھر میقات سے حج کی نیت کر کے لوٹے۔ اس لیے کہ وطن واپسی کے بعد عمرہ اور حج کے درمیان کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک مسلمان کے لیے احتیاط اسی میں ہے کہ وہ قربانی کرے، چاہے وطن ہی کیوں نہ واپس چلا گیا ہو، تاکہ اس اختلاف سے بچا جاسکے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے ہے، یا ان لوگوں کی رائے جو یہ کہتے ہیں کہ مسافت قصر تک سفر کرنے سے قربانی ساقط ہو جاتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ سنت نبوی کا پورا التزام کیا جائے اور اگر قربانی کی طاقت نہیں رکھتا تو ایام حج میں تین روزے رکھے اور وطن واپسی کے بعد سات روزے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ (جو عمرہ کے ساتھ حج کی نیت کرے وہ حسب استطاعت قربانی کرے) یہ حکم حج تمتع اور حج قران دونوں کے لیے ہے، اس لیے قارن کو متمتع بھی کہا جاتا ہے، جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے۔

سوال ایک شخص نے حج کے مہینوں میں مثلاً ذی القعدہ میں عمرہ کیا، پھر مدینہ منورہ چلا گیا اور وہاں حج تک ٹھہرا رہا، تو کیا اس کے اوپر حج تمتع واجب ہوگا یا تینوں صورتوں کے درمیان اسے اختیار ہے؟

جواب اس پر حج تمتع واجب نہ ہوگا۔ اگر چاہے گا تو دوسرا عمرہ کرے گا اور متمتع ہو جائے گا۔ ان لوگوں کے قول کے مطابق جو یہ کہتے ہیں کہ سفر کی وجہ سے تمتع ہو جاتا ہے، نئے عمرہ کے بعد بہرحال وہ متمتع ہو جائے گا اور قربانی واجب ہو جائے گی اور اگر چاہے گا تو صرف حج کی نیت کرے گا۔ اس صورت میں اختلاف ہے کہ وہ قربانی کرے گا یا نہیں؟ صحیح یہی ہے کہ وہ قربانی کرے گا، اس لیے کہ مدینہ منورہ چلے جانے سے تمتع کا حکم منقطع نہیں ہو جاتا، سب سے صحیح قول یہی ہے۔

سوال اگر کوئی شخص حج یا عمرہ کی نیت سے تلبیہ کہتے ہوئے میقات سے آگے بڑھ

جاتا ہے اور کوئی شرط نہیں لگاتا،اس کے بعد اسے کوئی مانع پیش آ جاتا ہے جو اسے نسک (حج یا عمرہ) کی ادائیگی سے روک دیتا ہے تو ایسی صورت میں اسے کیا کرنا چاہیے؟

جواب ایسے آدمی کو ''محصر'' کہا جاتا ہے،یعنی جس کو راستہ میں کوئی رکاوٹ پیش آ گئی ہو۔اسے چاہیے کہ صبر کرے،شاید کہ رکاوٹ دور ہو جائے اور وہ اپنا نسک پورا کر سکے، وگرنہ وہ محصر ہوگا اور اس کا حکم یہ ہے کہ جس جگہ مانع پیش آیا ہے،وہیں قربانی کرے گا اور بال کٹوا کر حلال ہو جائے گا،چاہے مانع کوئی دشمن ہو یا کوئی اور سبب اور چاہے وہ حرم میں پیش آیا ہو یا حرم سے باہر اور قربانی کا گوشت فقیروں میں بانٹ دے گا اور اگر وہاں پر کوئی آدمی نہ مل سکے تو حرم یا آس پاس کے فقیروں کے درمیان تقسیم کر دے گا اور بال کٹوا کر حلال ہو جائے گا اور اگر قربانی کی استطاعت نہیں رکھتا تو دس روزے رکھے اور پھر بال کٹوا کر حلال ہو جائے۔

سوال ایک حاجی نے میقات سے احرام باندھا،لیکن تلبیہ میں یہ کہنا بھول گیا کہ وہ حج تمتع کی نیت کر رہا ہے تو کیا متمتع کی حیثیت سے اپنا عمل پورا کرے گا،یعنی کیا پہلے عمرہ کر کے حلال ہو جائے گا اور پھر مکہ مکرمہ سے حج کی نیت کرے گا؟

جواب اگر احرام کے وقت عمرہ کی نیت کی،لیکن تلبیہ میں کہنا بھول گیا تو اس کا حکم تلبیہ میں عمرہ کا ذکر کرنے والے کا ہوگا۔طواف اور سعی کرے گا،بال کٹوائے گا اور حلال ہو جائے گا۔اس لیے کہ تلبیہ سفر کے دوران بھی کہہ سکتا ہے اور اگر تلبیہ نہ بھی کہے تو کوئی حرج نہیں۔اس لیے کہ تلبیہ سنت مؤکدہ ہے اور اگر احرام کے وقت صرف حج کی نیت کی اور وقت میں گنجائش باقی ہے تو افضل یہی ہے کہ حج کو عمرہ میں بدل دے،طواف اور سعی کرے،بال کٹوائے اور حلال ہو جائے اور متمتع بن جائے۔

سوال اگر کسی نے اپنی ماں کی طرف سے حج کیا،میقات پر تلبیہ حج کہا،لیکن اپنی ماں کی طرف سے تلبیہ نہ کہا تو ایسے آدمی کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب اگر اس کی نیت ماں کی طرف سے حج کرنے کی تھی لیکن تلبیہ میں ذکر کرنا

بھول گیا تو حج اس کی ماں کی طرف سے ہوگا، کیونکہ نیت (تلبیہ سے) زیادہ قوی ہے۔رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے''اس لیے اگر نیت دوسرے کی طرف سے حج کرنے کی تھی لیکن احرام کے وقت ذکر کرنا بھول گیا تو حج اسی کی طرف سے شمار ہوگا جس کی طرف سے نیت کی تھی۔

سوال کیا عورت حالت احرام میں موزے اور دستانے پہن سکتی ہے؟اور کیا اس کے لیے احرام کے کپڑے بدلنا جائز ہے؟

جواب عورت کے لیے افضل یہی ہے کہ حالت احرام میں موزے پہنے رہے کیونکہ اس میں زیادہ پردہ ہے اوراگر اس کے کپڑے ڈھیلے اور تمام بدن کو ڈھانکنے والے ہوں تو وہی کپڑے کافی ہیں۔اگر احرام کے وقت موزے پہنے ہوئے تھی اور بعد میں اتار دیے تو بھی کوئی حرج نہیں جیسے کہ کوئی آدمی احرام کے وقت تو جوتے پہنتا ہے لیکن بعد میں اتار دیتا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن عورت حالت احرام میں دستانے نہیں پہنے گی اور نہ ہی اپنے چہرے کے لیے نقاب یا برقعہ استعمال کرے گی کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ہاں! اگر اس کے سامنے کوئی غیر محرم آجائے تو چہرے پر نقاب ڈال لینا ضروری ہے۔اسی طرح طواف اور سعی کی حالت میں غیر محرم کے سامنے آنے کی صورت میں چہرہ پر نقاب ڈالنا ہوگا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ''قافلے ہمارے پاس سے گزرتے تھے اور ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوتے تھے، جب قافلے والے ہمارے سامنے پہنچتے تو ہم میں سے ہر کوئی اپنے سر سے نقاب چہرہ پر گرا لیتی تھی اور جب وہ آگے بڑھ جاتے تو ہم اپنا چہرہ کھول لیتے۔''

(ابوداؤد،ابن ماجہ)

مردوں کے لیے چمڑے کے موزے پہننا جائز ہے، اگرچہ وہ کٹے ہوئے نہ ہوں جمہور کی رائے یہ ہے کہ ان کا اوپر سے کاٹنا ضروری ہے، لیکن صحیح رائے یہی ہے کہ جوتے نہ ہونے کی حالت میں ان کا کاٹنا ضروری نہیں۔اس لیے نبی کریم ﷺ نے

میدان عرفہ میں لوگوں کے سامنے خطبہ دیا اور فرمایا: ''جس کے پاس تہبند نہ ہو وہ پائجامہ پہن لے اور جس کے پاس جوتے نہ ہوں وہ موزے پہن لے'' (متفق علیہ)
اس حدیث میں آپ ﷺ نے موزوں کو کاٹنے کا حکم نہیں دیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ موزے کا بالائی حصہ کاٹ دینے کا حکم منسوخ ہو گیا۔

سوال: کیا احرام کی نیت زبان سے کرنی چاہئے اور اگر کوئی شخص کسی دوسرے آدمی کی طرف سے حج کر رہا ہو تو کس طرح نیت کرے؟

جواب: نیت کی جگہ دل ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دل میں نیت کرے کہ وہ فلاں آدمی یا اپنے بھائی یا فلاں بن فلاں کی طرف سے حج کر رہا ہے، زبان سے کہنا مستحب ہے (اللهم لبيك حجاً عن فلان) یا (لبيك عمرة عن فلان) تاکہ جو کچھ دل میں ہے اس کی تاکید الفاظ کے ذریعے ہو جائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حج اور عمرہ کا تلبیہ زبان سے ادا کیا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی زبان سے ادا کیا تھا، جب کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو تعلیم دی تھی اور خود بھی بلند آواز سے ادا کیا تھا۔ اس لیے یہی سنت ہے لیکن اگر کوئی شخص زبان سے نہیں کہتا تو صرف نیت کافی ہوگی۔ حج کے اعمال وہ ویسے ہی پورے کرے گا جیسا کہ اپنی طرف سے حج کرنے کی صورت میں کرتا اور بغیر کسی کا نام لیے ہوئے اسی طرح تلبیہ پکارے گا جیسا کہ اپنی طرف سے حج کرنے کی صورت میں تلبیہ کہتا، لیکن اگر ابتدائے تلبیہ میں اس آدمی کا تعین کر دے جس کی طرف سے حج کر رہا ہے تو بہتر ہے۔ اس کے بعد عام حج اور عمرہ کرنے والے کی طرح تلبیہ کہتا رہے گا، جس کے الفاظ یہ ہے:

(لبيك اللهم لبيك، لبيك لاشريك لك لبيك، ان الحمد والنعمة لك والملك، لا شريك لك، لبيك اللهم لبيك، لبيك اله الحق لبيك)

مقصد یہ ہے کہ بغیر کسی کا نام لیے عام تلبیہ کہتا رہے گا۔

سوال: اگر کوئی آدمی کسی کام سے یا ڈیوٹی پر مکہ مکرمہ آیا اور حج کا موقع مل گیا تو کیا وہ

اپنی جائے اقامت سے احرام باندھے گا یا حرم سے باہر جا کر احرام باندھ کر واپس آئے گا؟

جواب اگر کوئی آدمی حج یا عمرہ کی نیت کے بغیر کسی دوسری ضرورت سے مکہ مکرمہ آئے، مثال کے طور پر کسی رشتہ دار سے ملنے یا کسی مریض کی عیادت کے لیے آئے یا تجارت کی غرض سے آئے پھر اس کے دل میں حج کا خیال آئے تو اپنی جائے اقامت سے ہی حج کا احرام باندھ لے، چاہے مکہ مکرمہ میں ہو یا اطراف مکہ مکرمہ میں اور اگر عمرہ کی نیت کرے تو حرم سے نکل کر تنعیم ،جعرانہ یا کسی اور جگہ جانا ہوگا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تنعیم سے عمرہ کی نیت کرنے کا حکم دیا اور ان کے بھائی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ان کو حرم سے باہر تنعیم یا کسی اور جگہ لے جائیں۔

سوال احرام کے لیے دو رکعت نماز پڑھنی شرط ہے یا نہیں؟

جواب شرط نہیں، بلکہ استحباب میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور کی رائے ہے کہ دو رکعت نماز پڑھنی سنت ہے ۔وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھے گا اور تلبیہ کہے گا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع میں ظہر کی نماز کے بعد احرام کی نیت کی اور فرمایا: ''میرے پاس میرے رب کا پیغامبر آیا اور کہا کہ اس مبارک وادی میں نماز پڑھیے اور کہیے کہ حج کے ساتھ عمرہ کی بھی نیت کرتا ہوں۔''

دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ اس بارے میں کوئی نص موجود نہیں اور نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ میرے پاس میرے رب کا پیغامبر آیا اور کہا کہ اس مبارک وادی میں نماز پڑھیے، اس سے مراد فرض نماز ہوسکتی ہے اور احرام کی دو رکعتوں کے لیے اسے نص نہیں مانا جاسکتا اور نبی کریم ﷺ کا فرض نماز کے بعد احرام باندھنا احرام کے لیے دو رکعتوں کی مشروعیت کی دلیل نہیں بن سکتی۔ بلکہ دلیل صرف اس امر کی ہے کہ اگر ممکن ہو تو عمرہ اور حج کا احرام نماز کے لیے باندھنا افضل ہے۔

سوال اگر حالت احرام میں یا نماز کے لیے جاتے ہوئے مذی یا پیشاب کے قطرے

ٹپک جائیں تو اس کا کیا حکم ہے؟

(جواب) ایسی صورت میں ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ جب نماز کا وقت آئے تو وضو کرے لیکن وضو سے پہلے پیشاب یا مذی سے طہارت حاصل کرنے کے لیے استنجاء کرے۔ مذی کی صورت میں آلہ تناسل اور دونوں فوطوں کو دھونا ضروری ہے۔ پیشاب کی صورت میں آلہ تناسل کا وہی حصہ دھونا ہوگا۔ جہاں پیشاب لگا ہو۔ اس کے بعد اگر نماز کا وقت ہو تو وضو کرے اور اگر ابھی نماز کا وقت نہیں ہوا تو وضو کو نماز کے وقت تک مؤخر کر سکتا ہے لیکن یہ سب کچھ صرف وسوسہ نہیں یقین کی بنیاد پر ہونا چاہیے، وسوسہ میں نہیں پڑنا چاہیے کیونکہ بعض لوگوں کو صرف وہم ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز خارج ہوئی حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے وسوسہ کا عادی نہیں بننا چاہیے اور اگر وسوسہ کا خطرہ ہو تو وضو کے بعد اپنی شرمگاہ کے اردگرد پانی چھڑک لے تاکہ اگر کہیں وسوسہ ہو بھی تو ذہن میں یہ بات آئے کہ یہ تو پانی کے قطرے ہیں۔ ایسا کرنے سے وسوسہ کے شر سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

(سوال) کیا دھونے کے لیے احرام کا کپڑا بدلنا جائز ہے؟

(جواب) احرام کا کپڑا دھونا اور اس کے بدلے میں دوسرے دھلے ہوئے یا نئے کپڑے پہننا جائز ہے۔

(سوال) نیت اور تلبیہ سے قبل احرام کے کپڑوں پر خوشبو لگانا کیسا ہے؟

(جواب) احرام کے کپڑوں پر خوشبو نہیں لگانا چاہیے۔ سنت یہ ہے کہ آدمی اپنے بدن پر خوشبو لگائے۔ سر، داڑھی اور دونوں بغلوں میں لگائے۔ احرام کی نیت کرتے وقت احرام کے کپڑوں پر خوشبو نہ لگائے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''محرم کوئی ایسا کپڑا نہ پہنے جس میں زعفران یا ورس (خوشبو) لگی ہو۔'' اس لیے اگر کسی نے اپنے احرام کے کپڑوں میں خوشبو لگالی تو اسے چاہیے کہ اسے دھوڈالے یا دوسرے کپڑے پہن لے۔

(سوال) اگر کوئی شخص آٹھویں تاریخ سے پہلے ہی منیٰ میں موجود ہو تو کیا وہ مکہ مکرمہ میں آ کر احرام کی نیت کرے گا یا منیٰ سے ہی نیت کرے گا؟

(جواب) جو شخص آٹھویں تاریخ کو منیٰ میں موجود ہوگا وہ وہیں سے احرام باندھے گا اور تلبیہ کہنا شروع کر دے گا۔ مکہ مکرمہ آنے کی ضرورت نہیں۔

(سوال) کیا حج تمتع کا وقت مقرر ہے اور کیا حج تمتع کرنے والا آٹھویں تاریخ سے قبل حج کی نیت کر سکتا ہے؟

(جواب) ہاں! حج تمتع کا وقت مقرر ہے، شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجہ کا پہلا عشرہ یہی حج کے مہینے ہیں، اس لیے شوال سے قبل یا عید الاضحیٰ کی رات کے بعد حج تمتع کی نیت نہیں کی جا سکتی، لیکن افضل یہی ہے کہ صرف عمرہ کی نیت کرے اور اس سے فراغت کے بعد صرف حج کی نیت کرے۔ یہی صحیح حج تمتع ہے اور اگر کسی نے حج اور عمرہ دونوں کی ایک ساتھ نیت کر لی تو اسے متمتع بھی کہا جائے گا اور قارن بھی اور دونوں حالتوں میں اسے قربانی کرنی ہوگی، ایک بکرا، یا اونٹ یا گائے کا ساتواں حصہ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ کہ جس نے حج تمتع (حج اور عمرہ) کی نیت کی اسے جو جانور میسر آئے، اس کی قربانی کرے۔'' اگر قربانی کی قدرت نہیں رکھتا تو دس روزے رکھے، تین دن ایام حج میں اور سات دن اپنے وطن میں۔

حج تمتع میں عمرہ اور حج کے درمیان مدت کی کوئی تحدید نہیں۔ اگر کسی نے عمرہ شوال کے اول ایام میں کیا تو عمرہ اور (آٹھویں ذی الحجہ کو) حج کے احرام کے درمیان مدت طویل ہوگی۔ اس لیے افضل یہی ہے کہ آٹھویں ذی الحجہ کو ہی حج کی نیت کرے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق کیا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب مکہ مکرمہ پہنچے تو ان میں سے بعض مفرد تھے اور بعض قارن۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو حکم دیا کہ عمرہ کے بعد احرام کھول دیں، سوائے ان لوگوں کے جو قربانی کا جانور ساتھ

لائے تھے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے طواف کیا اور سعی کی اور بال کٹوا کر حلال ہو کر متمتع بن گئے اور پھر آٹھویں ذی الحجہ کو آپ نے ان سب کو اپنی اقامت گاہوں سے حج کی نیت کرنے کا حکم دیا۔ اس لیے افضل یہی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص شروع ذی الحجہ یا اس سے پہلے ہی حج کی نیت کر لیتا ہے تو بھی صحیح ہوگا۔

سوال اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو بغیر احرام باندھے میقات سے آگے بڑھ جائے، چاہے حج یا عمرہ کے لیے جا رہا ہو یا کسی اور کام سے؟

جواب جو شخص حج اور عمرہ کے لیے جا رہا ہو اور میقات سے آگے بڑھ جائے اسے واپس آ کر میقات سے احرام باندھنا ضروری ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اہل مدینہ ذوالحلیفہ سے احرام باندھیں گے، اہل شام جحفہ سے، اہل نجد قرن منازل سے اور اہل یمن یلملم سے، صحیح حدیث سے یہ ثابت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کا میقات ذوالحلیفہ کو قرار دیا، اہل شام کا جحفہ، اہل نجد کا قرن منازل اور اہل یمن کا یلملم اور کہا کہ یہ جگہیں مذکورہ بالا علاقہ والوں کے لیے میقات ہیں اور ان لوگوں کے لیے بھی جو وہاں سے گزریں اور حج یا عمرہ کا ارادہ رکھیں۔

اس لیے اگر حج یا عمرہ کا ارادہ ہو تو میقات سے احرام باندھنا ضروری ہے۔ اگر مدینہ منورہ کی طرف سے آ رہا ہو تو ذوالحلیفہ سے احرام باندھنا ہوگا، اگر شام، مصر یا کسی اور مغرب کی جانب واقع ملک سے آ رہا ہو تو جحفہ سے، جسے آج کل ''رابغ'' کہتے ہیں، اگر یمن کی طرف سے آ رہا ہو تو ''یلملم'' سے اور اگر نجد یا طائف سے آ رہا ہو تو ''وادی قرن'' سے احرام باندھنا ہوگا جسے آج کل ''سیل'' اور بعض لوگ ''وادی محرم'' بھی کہتے ہیں۔ چاہے تو صرف حج کا احرام باندھے اور چاہے تو صرف عمرہ کا، یا دونوں ہی کی نیت کرے لیکن اگر حج کا مہینہ ہے تو افضل یہ ہے کہ صرف عمرہ کا احرام باندھے اور طواف، سعی اور قصر کر کے عمرہ سے حلال ہو جائے، پھر حج کے وقت حج کا احرام

باندھے۔ حج کے مہینوں کے علاوہ ایام میں مثلاً رمضان یا شعبان میں صرف عمرہ کی نیت کرے۔اگر مکہ مکرمہ کسی اور ضرورت سے آنا ہوا ہے، حج یا عمرہ کے لیے نہیں، مثال کے طور پر تجارتی غرض سے ہو یا کسی عزیز یا دوست کی زیارت کے لیے تو صحیح اور راجح حکم یہی ہے کہ ایسے آدمی کے لیے احرام باندھنا ضروری نہیں۔بغیر احرام کے مکہ مکرمہ میں داخل ہوسکتا ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ موقع سے فائدہ اٹھائے اور عمرہ کی نیت سے احرام باندھ لے۔

سوال اگر محرم کو یہ ڈر ہو کہ وہ کسی بیماری یا خوف کی وجہ سے حج یا عمرہ ادا نہیں کر پائے گا تو اسے کیا کرنا چاہیے؟

جواب ایسا شخص احرام کے وقت یہ کہے کہ (اگر مجھے کسی جگہ کوئی مانع پیش آ گیا تو میرا احرام وہیں کھل جائے گا) سنت یہی ہے کہ اگر مانع پیش آنے کا ڈر ہو تو شرط لگا دے کیونکہ رسول اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ جب ضباعہ بنت الزبیر بن عبدالمطلب نے آپ سے کسی مرض کا شکوہ کیا تو آپ نے ان کو ایسا ہی کرنے کا حکم دیا تھا۔

سوال کیا عورت کسی بھی لباس میں احرام باندھ سکتی ہے؟

جواب ہاں! عورت جس لباس میں چاہے احرام باندھے۔عورت کے لیے احرام کا کوئی مخصوص لباس نہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے، لیکن افضل یہ ہے کہ اس کے احرام کے کپڑے ایسے سادہ ہوں جو کسی فتنہ کا باعث نہ بنیں۔اگر خوبصورت کپڑوں میں احرام باندھتی ہے تو جائز ہے لیکن افضل نہیں۔

مرد کے لیے افضل یہ ہے کہ دو سفید کپڑوں (تہبند اور چادر) میں احرام باندھے۔ اگر سفید نہ ہوں تو بھی کوئی حرج نہیں۔رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے طواف میں ہرے رنگ کی چادر استعمال کی۔اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے سیاہ عمامہ استعمال کیا۔حاصل کلام یہ ہے کہ سفید کے علاوہ دوسرے رنگ کے کپڑے بھی احرام میں استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

سوال ہوائی جہاز سے آنے والا آدمی حج یا عمرہ کی نیت کب کرے گا؟

جواب ہوائی یا سمندری راستہ سے آنے والا خشکی کے راستہ سے سفر کرنے والے کی طرح جب میقات کے سامنے پہنچے تو احرام باندھ لے یا ہوائی یا سمندری جہاز کی سرعت کا لحاظ کرتے ہوئے بطورِ احتیاط میقات آنے سے کچھ پہلے ہی باندھ لے۔

سوال جس آدمی کا گھر میقات کے اندر ہو، وہ کہاں سے احرام باندھے گا؟

جواب ایسا آدمی اپنی رہائش سے احرام باندھے گا۔ ام السلم اور بحرہ کے رہنے والے لوگ اپنی اپنی جگہ سے احرام باندھیں گے اور جدہ والے اپنی جگہ سے احرام باندھیں گے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جو شخص میقات کے اندر مقیم ہو وہ اپنی جگہ سے احرام باندھے'' ایک دوسری روایت میں ہے کہ ''وہ اپنے گھر والوں کے پاس سے احرام باندھے، اہل مکہ، مکہ سے احرام باندھیں۔''

سوال آٹھویں ذی الحجہ کو حاجی کہاں سے احرام باندھے گا؟

جواب آٹھویں ذی الحجہ کو حاجی اپنی اقامت گاہ سے احرام باندھیں گے۔ جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم ﷺ کے حکم سے حجۃ الوداع میں اپنی قیام گاہ (ابطح) سے احرام باندھا تھا تو جو مکہ مکرمہ میں ہوں وہ اپنے گھر سے احرام باندھیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سابقہ حدیث میں نبی کریم ﷺ کا قول (جو شخص میقات کے اندر ہو وہ اپنے گھر والوں کے پاس سے احرام باندھے، یہاں تک کہ اہل مکہ اپنے گھروں سے احرام باندھیں) یہی بتا رہا ہے اور یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

سوال اگر کوئی شخص کسی ملک سے حج کی نیت سے آرہا ہو اور احرام کی نیت کیے بغیر جدہ ایئر پورٹ پر اتر جائے اور پھر جدہ سے احرام باندھے تو ایسے آدمی کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب ایسا آدمی اگر شام یا مصر سے آرہا ہو تو اسے رابغ جا کر احرام باندھ کر آنا چاہیے، جدہ سے احرام باندھنا صحیح نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی نجد سے آرہا ہو تو اسے وادی قرن

(سیل) سے احرام باندھ کر آنا چاہیے، اگر جدہ سے احرام باندھ لے تو اسے مکہ مکرمہ میں ایک بکری ذبح کرکے یا گائے یا اونٹ کا ساتواں حصہ فقیروں میں تقسیم کردینا چاہیے تاکہ حج وعمرہ میں جو نقص واقع ہوا ہے وہ پورا ہوجائے۔

(سوال) اگر کوئی شخص حج افراد کی نیت کرکے مکہ مکرمہ میں داخل ہو۔ اس کے بعد اپنی نیت کو حج تمتع میں بدل دے اور عمرہ کرکے حلال ہوجائے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ اور ایسا آدمی حج کی نیت کب اور کہاں سے کرے؟

(جواب) جو شخص حج افراد یا حج قِران کی نیت کرکے مکہ مکرمہ میں داخل ہو اس کے لیے افضل یہی ہے کہ اپنی نیت کو عمرہ کی نیت میں بدل دے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے لیے آئے تو ان میں سے بعض قارن تھے اور بعض مفرد اور ان کے پاس قربانی کا جانور نہ تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ صرف عمرہ کرکے حلال ہوجائیں، چنانچہ وہ لوگ طواف، سعی اور بال کٹوانے کے بعد حلال ہو گئے۔ ہاں! جو شخص قربانی کا جانور ساتھ لائے اسے احرام نہیں کھولنا چاہیے، یہاں تک کہ حج اور عمرہ دونوں سے فارغ ہوجائے۔ اگر قارن ہے اور اگر مفرد ہے تو عید کے دن حج کے اعمال سے فراغت کے بعد (احرام کھولے)۔

مقصد یہ ہے کہ جو شخص مکہ مکرمہ صرف حج یا عمرہ یا دونوں کی نیت کرکے آئے اور اس کے ساتھ قربانی کا جانور نہ ہو، اس کے لیے مسنون یہی ہے کہ اپنی نیت کو صرف عمرہ کی نیت میں بدل دے اور طواف، سعی اور بال کٹوانے کے بعد حلال ہوجائے اور جب حج کا وقت آئے تو حج کا احرام باندھے۔ اس طرح وہ آدمی متمتع ہو جائے گا اور اس پر دم تمتع واجب ہوگا۔

(سوال) ایک شخص نے حج تمتع کی نیت کی لیکن میقات کے بعد رائے بدل دی اور حج افراد کا تلبیہ پڑھنے لگا تو کیا اس پر دم واجب ہوگا؟

(جواب) اگر اس شخص نے میقات پر پہنچنے سے قبل تمتع کا ارادہ کیا تھا لیکن میقات پر اپنی

رائے بدل دی اور صرف حج کا احرام باندھا تو کوئی حرج نہیں اور نہ ہی اس پر دم واجب ہے۔ ہاں! اگر اس نے میقات پر یا میقات سے قبل عمرہ اور حج کا تلبیہ کہا اور بعد میں چاہا کہ اپنی نیت کو صرف حج میں بدل دے تو ایسا کرنا صحیح نہیں، البتہ صرف عمرہ کی نیت میں بدل سکتا ہے، اس لیے کہ حج قران کو حج افراد میں نہیں بدل سکتا، عمرہ میں بدل سکتا ہے، اس لیے کہ اس میں مسلمانوں کے لیے سہولت ہے اور رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اسی کا حکم دیا تھا۔ اس لیے اگر کوئی شخص میقات سے عمرہ اور حج دونوں کی نیت کرتا ہے تو پھر بعد میں حج افراد میں نہیں بدل سکتا، صرف عمرہ میں بدل سکتا ہے، بلکہ یہی افضل ہے تاکہ طواف، سعی اور بال کٹوانے کے بعد حلال ہو جائے اور پھر آٹھویں تاریخ کو حج کا تلبیہ کہے تاکہ اس کا حج حج تمتع ہو جائے۔

سوال ایک شخص نے حج اور عمرہ کا احرام باندھا اور مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد اس کا زاد سفر گم ہو گیا اور قربانی کرنے کی استطاعت نہ رہی اس وجہ سے اس نے اپنی نیت کو حج افراد کی نیت میں بدل دیا تو کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟ اور اگر حج کسی اور کی طرف سے کر رہا تھا اور شرط یہ تھی کہ حج تمتع کرے گا تو اسے کیا کرنا چاہیے؟

جواب اس کے لیے ایسا کرنا صحیح نہیں، اگرچہ زاد راہ کھو گیا ہو۔ اگر قربانی نہیں کر سکتا تو دس روزے رکھے گا، تین دن ایام حج میں اور سات دن وطن واپسی کے بعد۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ شرط پوری کرے۔ پہلے عمرہ کا احرام باندھے اور طواف، سعی اور بال کٹوانے کے بعد حلال ہو جائے، پھر آٹھ تاریخ کو حج کا تلبیہ کہے اور قربانی کرے اور عدم استطاعت کی صورت میں دس دن کے روزے رکھے۔ تین دن ایام حج میں یوم عرفہ سے قبل اور سات دن وطن واپسی کے بعد۔ کیونکہ عرفہ کے دن نبی کریم ﷺ کی اقتداء میں روزہ نہ رکھنا ہی افضل ہے۔ وقوف عرفہ کے وقت آپ ﷺ روزے سے نہیں تھے۔

سوال ایک شخص نے حج قران کی نیت کی اور عمرہ کے بعد احرام کھول دیا تو کیا اس

کا حج حج تمتع ہو جائے گا؟

(جواب) ہاں! اگر حج قران کی نیت کرنے والا طواف، سعی اور بال کٹوانے کے بعد عمرہ کی نیت سے احرام کھول دیتا ہے تو وہ متمتع ہو جائے گا اور اسے قربانی کرنی ہوگی۔

(سوال) تارک نماز کے حج کے بارے میں کیا حکم ہے، چاہے قصداً نماز نہ پڑھتا ہو یا سستی کی وجہ سے؟ اور کیا اس کا حج فرض حج کے لیے کافی ہوگا؟

(جواب) اگر تارک نماز، نماز کے وجوب کا منکر ہے تو باجماع امت کافر ہے اور اس کا حج صحیح نہیں ہوگا اور اگر سستی اور کاہلی کی وجہ سے نہیں پڑھتا تو علماء امت کا اختلاف ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس کا حج صحیح ہے اور بعض کے نزدیک صحیح نہیں۔ صحیح رائے یہی ہے کہ اس کا حج صحیح نہیں۔ کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ”ہمارے اور کافروں کے درمیان وجہ امتیاز نماز ہے، اس لیے جس نے نماز چھوڑی وہ کافر ہوگیا“ اور یہ بھی فرمایا: ”آدمی اور کفر و شرک کے درمیان حد فاصل نماز ہے“ اور یہ حکم عام ہے، چاہے نماز کے وجوب کا منکر ہو یا سستی کی وجہ سے نہ پڑھتا ہو۔

(سوال) کیا عورت ایام حج میں مانع حیض گولیاں استعمال کر سکتی ہے؟

(جواب) اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس لیے کہ اس میں فائدہ اور مصلحت ہے تاکہ لوگوں کے ساتھ طواف کر سکے اور یہ کہ رفقائے سفر تعطل میں نہ پڑ جائیں۔

(سوال) اگر عورت کو حالت احرام میں حیض یا نفاس آ جائے تو کیا وہ طواف کر سکتی ہے؟ اگر نہیں تو اسے کیا کرنا ہوگا اور کیا اس کے لیے طواف وداع ہے؟

(جواب) حیض یا نفاس والی عورت طہارت کا انتظار کرے گی، پاک ہونے کے بعد طواف اور سعی کرے گی اور بال کٹوا کر عمرہ پورا کرلے گی اور اگر عمرہ کے بعد یا آٹھویں ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھنے کے بعد حیض یا نفاس آجائے تو حج کے تمام اعمال ادا کرے گی۔ وقوف عرفہ و مزدلفہ، کنکریاں مارنا، تلبیہ و ذکر الٰہی تمام اعمال سرانجام دے گی اور پاک ہوجانے کے بعد حج کا طواف اور سعی کرے گی اور اگر حج کے طواف اور سعی

کے بعد حیض یا نفاس آئے تو طواف وداع ساقط ہو جائے گا کیونکہ حائضہ اور نفاس والی عورت پر طواف وداع نہیں ہے۔

سوال: کیا طواف کی دو رکعتیں مقام ابراہیم کے پیچھے ہر طواف کے بعد ضروری ہیں اور اگر کوئی بھول جائے تو کیا حکم ہے؟

جواب: طواف کی دو رکعتیں مقام ابراہیم کے پیچھے ہی ضروری نہیں، حرم میں کسی جگہ بھی پڑھ سکتے ہیں اور اگر کوئی آدمی بھول جائے تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ دو رکعتیں سنت ہیں، واجب نہیں۔

سوال: اگر کسی نے طواف افاضہ، طواف وداع تک مؤخر کر دیا اور دونوں کی نیت سے ایک طواف کر لیا تو اس کا کیا حکم ہے؟ اور کیا رات میں طواف افاضہ کرنا صحیح ہے؟

جواب: اس میں کوئی حرج نہیں۔ اگر اعمال حج کی ادائیگی کے بعد سفر کے وقت طواف کرنا ہے تو طواف افاضہ ہی طواف وداع کے لیے کافی ہوگا، چاہے طواف وداع کی نیت کرے یا نہ کرے۔ مقصد یہ ہے کہ سفر کے وقت طواف افاضہ، طواف وداع کے لیے کافی ہوگا۔

اگر دونوں طوافوں کی بیک وقت نیت کر لے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ طواف افاضہ اور طواف وداع دونوں ہی رات اور دن میں کسی وقت کر سکتے ہیں۔

سوال: اگر طواف یا سعی پوری کرنے سے قبل نماز کے لیے اقامت ہو جائے تو حاجی یا عمرہ کرنے والے کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: پہلے نماز پڑھے۔ اس کے بعد طواف یا سعی کو جس جگہ چھوڑا ہے وہاں سے پورا کرے۔

سوال: کیا طواف اور سعی کے لیے طہارت (وضو) ضروری ہے؟

جواب: صرف طواف کے لیے طہارت (وضو) ضروری ہے۔ سعی کے لیے طہارت افضل ہے اور اگر بغیر طہارت (وضو) کے کرے تو بھی جائز ہے۔

سوال کیا عمرہ میں طواف وداع واجب ہے؟ اور کیا طواف کے بعد مکہ مکرمہ سے کوئی چیز خریدنی جائز ہے؟

جواب عمرہ میں طواف وداع واجب نہیں، البتہ افضل ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص بغیر طواف وداع کیے روانہ ہو جاتا ہے تو کوئی حرج نہیں، لیکن حج میں طواف وداع واجب ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک روانہ نہ ہو جب تک کہ خانہ کعبہ کا طواف نہ کرلے'' اس کے مخاطب حجاج تھے۔

طواف وداع کے بعد کوئی بھی چیز خرید سکتا ہے' یہاں تک کہ کوئی تجارتی سامان بھی خرید سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ مدت لمبی نہ ہو۔ اگر مدت لمبی ہو جائے تو دوبارہ طواف کرنا ہوگا۔ اگر عرف عام میں مدت لمبی نہیں ہوئی ہے تو طواف کا اعادہ نہیں کرے گا۔

سوال کیا حج یا عمرہ میں طواف سے قبل سعی کرنا جائز ہے؟

جواب سنت یہی ہے کہ پہلے طواف اور پھر سعی کرے۔ اگر کسی نے نادانستہ طواف سے قبل سعی کرلی تو کوئی حرج نہیں۔ رسول اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ ایک شخص نے آپ ﷺ سے پوچھا اور کہا کہ میں نے طواف سے قبل سعی کرلی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں۔ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ اگر کوئی شخص سعی پہلے کرلے تو صحیح ہے لیکن سنت یہی ہے کہ حج اور عمرہ دونوں میں پہلے طواف کرے اور پھر سعی۔

سوال سعی کی کیا صورت ہے؟ کہاں سے شروع کرے گا اور کتنے چکر ہیں؟

جواب سعی جبل صفا سے شروع کرے گا اور مروہ پر ختم کرے گا۔ اس کے سات چکر ہیں۔ صفا سے ابتدا ہوگی اور مروہ پر اختتام ہوگا۔ سعی کے دوران ذکر الٰہی اور تسبیح اور دعا میں مشغول رہے اور صفا و مروہ پر ہر بار قبلہ رخ ہاتھ اٹھا کر تین مرتبہ ذکر، دعا اور تکبیر کہے اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا ہی کیا تھا۔

سوال حج اور عمرہ میں بال منڈانا افضل ہے یا کٹوانا؟ اور کیا بالوں کے بعض حصہ کا کٹوانا کافی ہے؟

(جواب) حج اور عمرہ دونوں ہی میں بال منڈانا افضل ہے، کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے منڈانے والوں کے لیے تین مرتبہ مغفرت اور رحمت کی دعا فرمائی جبکہ بال کٹوانے والوں کے لیے صرف ایک بار۔ اس لیے بال منڈانا ہی افضل ہے لیکن اگر عمرہ کے بعد حج کا وقت قریب ہو تو افضل بال کٹوانا ہے تاکہ حج میں بال منڈا سکے، اس لیے کہ حج عمرہ سے بہتر ہے تو بہتر کام بہتر وقت میں کرنا چاہیے۔ اگر عمرہ ایام حج سے بہت پہلے کرے، مثال کے طور پر ماہ شوال میں تو سر کے بال بڑھ سکتے ہیں، ایسی صورت میں عمرہ میں بال منڈوالے تاکہ افضلیت کو پا سکے۔

بالوں کے بعض حصے کا منڈانا یا کٹانا علماء کے صحیح قول کے مطابق کافی نہیں بلکہ واجب یہی ہے کہ پورے سر کے بال کٹوائے یا منڈوائے اور بہتر یہ ہے کہ دونوں ہی صورتوں میں دائیں طرف سے ابتدا کرے۔

(سوال) حاجی عرفہ کب جائے گا اور کب واپس ہوگا؟

(جواب) نویں تاریخ کو طلوع آفتاب کے بعد عرفہ کے لیے روانگی ہوگی۔ وہاں ظہر اور عصر کی نمازیں دو دو رکعت ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ظہر کے وقت نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتباع کرتے ہوئے پڑھے اور غروب آفتاب تک ذکر، دعا، تلاوت قرآن اور تلبیہ میں مشغول رہے اور کثرت کے ساتھ مندرجہ ذیل اذکار کا ورد کرتا رہے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِي وَيُمِيْتُ بيده الخير وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔سُبْحَانَ اللّٰهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ

دعا کے وقت قبلہ رخ ہو کر دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھائے۔ اللہ کی حمد بیان کرے، اور نبی کریم ﷺ پر درود بھیجے۔ میدان عرفات میں کسی جگہ بھی قیام صحیح ہے۔ غروب آفتاب کے بعد مزدلفہ کے لیے سکون اور وقار کے ساتھ کثرت سے تلبیہ کہتا ہوا روانہ

ہو۔ مزدلفہ پہنچ کر مغرب کی نماز تین رکعتیں اور عشاء کی دو رکعتیں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ادا کرے۔

(سوال) مزدلفہ میں قیام اور رات گزارنے کا کیا حکم ہے؟ اور اس قیام کی مدت کیا ہے؟ حجاج کرام کی وہاں سے واپسی کب شروع ہوگی؟

(جواب) صحیح رائے یہ ہے کہ مزدلفہ میں رات گزارنی واجب ہے، بعض نے اسے رکن بتایا ہے اور بعض نے مستحب، لیکن صحیح رائے یہی ہے کہ واجب ہے اور جو وہاں رات نہ گزارے وہ قربانی کرے اور سنت یہ ہے کہ فجر کی نماز اور پو پھٹنے سے پہلے مزدلفہ سے روانہ نہ ہو۔ وہاں سے منیٰ تلبیہ کہتا ہوا روانہ ہو۔ فجر کی نماز کے بعد اللہ کا ذکر کرے اور دعائیں مانگے اور پو پھٹنے کے بعد تلبیہ کہتا ہوا منیٰ کی طرف روانہ ہو جائے۔

کمزور عورتوں، مردوں اور بوڑھوں کے لیے مزدلفہ سے آدھی رات کے بعد روانگی جائز ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے ایسے لوگوں کو یہ اجازت دی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے طاقت والوں کے لیے سنت یہ ہے کہ مزدلفہ میں قیام کریں۔ فجر کی نماز ادا کریں اور نماز فجر کے بعد اللہ تعالیٰ کا خوب ذکر کریں۔ پھر طلوع آفتاب سے قبل روانہ ہو جائیں۔ مزدلفہ میں دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر قبلہ رخ ہو کر دعا کرنا سنت ہے جیسا کہ عرفہ میں کیا تھا۔ مزدلفہ کا پورا میدان قیام کی جگہ ہے۔

(سوال) ایام تشریق (ذی الحجہ کی گیارہ، بارہ اور تیرہ تاریخیں) میں منیٰ کے باہر رات گزارنے کا کیا حکم ہے، چاہے تو قصداً ایسا کرے یا منیٰ میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے؟ اور منیٰ سے واپسی کب ہوگی؟

(جواب) صحیح قول یہ ہے کہ گیارہ اور بارہ کی راتیں منیٰ میں گزارنی واجب ہے، اہل تحقیق علماء کرام نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے اور یہ حکم مردوں اور عورتوں سب کے لیے ہے۔ اگر منیٰ میں جگہ نہ ملے تو وجوب ساقط ہو جاتا ہے اور کوئی جرمانہ عائد نہیں ہوتا۔ ہاں اگر کوئی شخص بغیر عذر منیٰ میں رات نہ گزارے تو اس پر دم واجب ہوگا۔

بارہویں تاریخ کو زوال کے بعد کنکریاں مارنے کے بعد حاجی منٰی سے روانہ ہو سکتا ہے۔لیکن تیرہویں تاریخ کو کنکریاں مارنے کے لیے منیٰ میں رک جانا افضل ہے۔

سوال قربانی کے دن حاجی کے لیے کون سا کام افضل ہے؟ اور کیا تقدیم و تاخیر جائز ہے؟

جواب سنت یہ ہے کہ قربانی کے دن جمرۃ العقبہ کو کنکریاں مارے، جو مکہ مکرمہ کی جانب ہے،سات الگ الگ کنکریاں مارے، ہر کنکری کو مارتے وقت تکبیر کہے، اگر اس کے پاس جانور ہے تو قربانی کرے، پھر سر کے بال منڈوائے یا کٹوائے، منڈوانا افضل ہے، پھر طواف کرے اور سعی بھی، اگر اس کے ذمہ سعی باقی ہے۔یہی افضل ہے۔اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی کیا تھا۔پہلے کنکریاں ماریں، پھر قربانی کی،اس کے بعد بال منڈوائے، پھر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور طواف کیا۔یہی ترتیب افضل ہے، لیکن اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کام کو آگے پیچھے کر دیتا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر رمی سے قبل قربانی یا رمی سے قبل طواف افاضہ یا رمی سے پہلے بال منڈوالے، یا قربانی سے پہلے بال منڈوالے تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو کسی کام کو آگے پیچھے کر دے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ کوئی حرج نہیں، کوئی حرج نہیں۔''

سوال مریض، عورت اور بچے کی طرف سے کنکریاں مارنے کا کیا حکم ہے؟

جواب مریض اور عاجز عورت (مثال کے طور پر حاملہ ، بھاری بدن والی اور کمزور عورت جو کنکریاں نہیں مار سکتی) کی طرف سے کنکریاں مارنا جائز ہے۔طاقتور عورت اپنی کنکریاں خود مارے اور اگر دن میں زوال کے بعد نہ مار سکے تو رات کو مارے۔ جو شخص عید کے دن کنکریاں نہ مار سکے وہ گیارہ کی رات کو مارے اور جو گیارہ کے دن نہ مار سکے وہ بارہ کی رات کو مارے اور جو بارہ کے دن میں نہ مار سکے یا زوال کے بعد نہ مار سکے وہ تیرہ کی رات کو مارے۔ طلوع فجر کے ساتھ رمی کا وقت ختم ہو جاتا ہے،لیکن

گیارہ، بارہ اور تیرہ کو دن کے وقت صرف زوال کے بعد ہی کنکریاں ماری جائیں گی۔

(سوال) کیا بغیر عذر ایام تشریق کی کنکریاں رات کو مارنی جائز ہیں؟ اور اگر کوئی مرد، عورتوں اور کمزوروں کے ساتھ دسویں تاریخ کی رات کو مزدلفہ سے آدھی رات کے بعد روانہ ہو جائے تو کیا وہ جمرۃ العقبہ کو ان عورتوں اور کمزور لوگوں کے ساتھ کنکریاں مار سکتا ہے؟

(جواب) صحیح قول یہی ہے کہ غروب آفتاب کے بعد کنکریاں مارنا جائز ہے، لیکن سنت یہ ہے کہ زوال کے بعد اور غروب سے پہلے کنکریاں مارے۔ بصورت آسانی یہی افضل ہے، ورنہ غروب آفتاب کے بعد مارے۔

جو کوئی کمزور لوگوں اور عورتوں کے ساتھ مزدلفہ سے روانہ ہو جائے، اس کا حکم انہی لوگوں کا حکم ہے، اس لیے جو طاقتور افراد (محرم مرد، ڈرائیور اور دوسرے طاقتور لوگ) عورتوں کے ساتھ ہوں گے وہ بھی رات کے آخری پہر کنکریاں مار سکتے ہیں۔

(سوال) حاجی کنکریاں مارنا کب شروع کرے گا؟ اور کیسے مارے گا؟ کنکریوں کی تعداد کیا ہو گی؟ کس جمرہ سے کنکری مارنے کی ابتدا کرے گا اور کہاں انتہا ہو گی؟

(جواب) بقرہ عید کے دن، پہلے جمرہ کو کنکریاں مارے، یعنی اس جمرہ کو جو مکہ مکرمہ سے قریب ہے اور جسے جمرۃ العقبہ کہا جاتا ہے اور اگر کوئی شخص یوم قربانی کی رات کو ہی کنکریاں مار لے تو صحیح ہے، لیکن افضل یہی ہے کہ صبح آفتاب نکلنے کے بعد مارے۔ غروب آفتاب تک کنکریاں ماری جائیں گی۔ اگر کوئی شخص کسی مجبوری کی وجہ سے غروب آفتاب سے قبل نہ مار سکے تو رات کو مارے۔ کنکریاں یکے بعد دیگرے مارے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہے۔ ایام تشریق میں زوال آفتاب کے بعد کنکریاں مارے، پہلے مسجد خیف کے قریب والے جمرہ کو سات کنکریاں مارے، ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہے، پھر بیچ والے جمرہ کو سات کنکریاں مارے، پھر آخری جمرہ کو۔ گیارہ اور بارہ دونوں دن ایسا کرے اور اگر کوئی شخص بارہ کو منیٰ سے واپس نہیں جانا چاہتا تو تیرہ کو

بھی اسی طرح کنکریاں مارے۔ سنت یہ ہے کہ پہلے اور دوسرے جمرہ کے نزدیک ٹھہرے۔ پہلے جمرہ کی رمی کے بعد قبلہ رخ ہو کر کھڑا ہو،اس طرح کہ جمرہ اس کے بائیں جانب اور دیر تک اللہ سے دعا کرے۔ گیارہ اور بارہ دونوں دن ایسا کرے اور تیرہ کو اگر کنکری مارنے کے لیے منیٰ میں رک گیا ہے تو آخری جمرہ (جو مکہ مکرمہ کے قریب ہے) کو کنکریاں مارے،لیکن اس کے نزدیک نہ ٹھہرے،اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ آخری جمرہ کی رمی کے بعد نہیں ٹھہرے تھے۔

سوال اگر کسی شخص کو یہ شک ہو جائے کہ شاید اس کی بعض کنکریاں حوض میں نہیں گری ہیں تو اسے کیا کرنا چاہیے؟

جواب ایسے آدمی کو اپنی رمی کی تکمیل کرنی چاہیے،زمین سے کنکریاں اٹھا کر رمی پوری کر لے۔

سوال کیا جمرات کے آس پاس سے کنکریاں لے کر رمی کرنی جائز ہے؟

جواب ہاں جائز ہے،اس لیے کہ قرین قیاس یہی ہے کہ ان کنکریوں سے رمی نہیں کی گئی ہے،البتہ جو کنکریاں حوض میں ہیں،ان سے رمی کرنی صحیح نہیں۔

ادارہ کی دیگر مطبوعات

- فتاویٰ البانیہ (جلد دوم)
- فتاویٰ ابن حزم
- فتاویٰ ابن تیمیہ (مختصر)
- مرسلِ خاص
- جہنم میں لے جانے والے 200 اعمال
- افواہوں کی شرعی حیثیت
- نماز کا انسائیکلوپیڈیا
- رسول اللہ ﷺ کے شب و روز
- ماہ شعبان بدعات کے گھیرے میں
- رسول اللہ ﷺ کا حج وعمرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ارباب فتاوی اور اہل علم، محققین طلباء، و متلاشیان اسلام کے لیے مکتبہ الصدیق السلفیہ
کی جانب سے فتاوی ابن تیمیہ۔ جدا ایک اور عظیم علمی پیشکش

شیخ الاسلام تقی الدین ابی العباس احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام ابن تیمیہ ؒ کے سینکڑوں فتاوی کا مجموعہ

بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ان شاء اللہ

خصوصیات

١۔ تمام کتب کو "ابواب فقہیہ" پر مرتب کر کے ان میں سے اہم اہم سوالات کا انتخاب کیا گیا ہے۔

٢۔ جس میں عقائد سے لے کر سیرت تک جو سوالات ہمارے معاشرے میں گردش کرتے ہیں ان سب کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

٣۔ روزمرہ کے تمام مسائل کا بہترین انتخاب کیا گیا ہے۔

٤۔ تکرارات کو حذف کر کے اہم مسئلہ کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

٥۔ لفظی ترجمہ کی بجائے مفہوم پر زور دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی معلومات جس کا جاننا ایک مسلم گھرانہ کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ارباب فتاویٰ اور اہل علم، محققین، طلباء اور شائقین اسلام کے لیے مکتبہ الصدیق السلفیہ کی جانب سے فتاویٰ ابن تیمیہ کے بعد ایک اور عظیم الشان پیشکش

حافظ ابو محمد علی بن احمد بن سعید المعروف بہ امام ابن حزم اندلسی

منتخب

فتاویٰ ابن حزمؒ

بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ان شاء اللہ

۱۔ تمام کتب کو "ابواب فقہ" پر مرتب کر کے ان میں سے اہم اہم سوالات کا انتخاب کیا گیا ہے۔

۲۔ جس میں عقائد سے لے کر سیرت تک جو سوالات ہمارے ذہنوں میں گردش کرتے ہیں ان سب کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۳۔ روزمرہ کے تمام مسائل کا بہترین انتخاب کیا گیا ہے۔

۴۔ مکررات کو حذف کر کے اہم مسئلہ کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۵۔ لفظی ترجمہ کی بجائے مفہوم پر زور دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی معلومات جس کا جاننا ایک مسلم گھرانہ کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

تعریفات کے لائق اللہ بابرکت کی ذات ہے اور درود وسلام پیارے پیغمبر مفتی اعظم جناب حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی پر۔

"عربی زبان میں فَتْوٰی (یا فُتْوٰی) اور فُتیا، اِفْتَاء سے ماخوذ ہے، جس کے معنی اظہار و بیان ورائے دہندگی کے ہیں۔ اصطلاح میں فتویٰ سے مراد پیش آمدہ مسائل اور مشکلات سے متعلق دلائل کی روشنی میں شریعت کا وہ حکم ہے جو کسی سائل کے جواب میں کوئی عالم دین اور احکام شریعت کے اندر بصیرت رکھنے والا شخص بیان کرے۔ اکثر علماء نے مفتی کے لیے اجتہاد کی شرط ضروری قرار دی ہے اور مقلد کے فتویٰ کو درست نہیں بتایا ہے، کیونکہ وہ دوسرے کی بات بغیر دلیل کے قبول کرتا ہے، اس طرح وہ عالم نہیں رہتا اور جس کی یہ شان ہو اسے دوسرے کو فتویٰ دینے کا مجاز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اگر کوئی مجتہد عالم موجود نہ ہو تو ضرورت کے وقت مقلد بھی فتویٰ دے سکتا ہے۔[صفة الفتوىٰ والمفتي والمستفتي لابن حمدان (ص ٢٤)، اعلام الموقعين (١/٤٦)] لیکن اس صورت میں بھی اس کے فتویٰ کو حقیقتاً فتویٰ نہیں کہا جائے گا، کیونکہ وہ صرف اتنا ہی کر سکتا ہے کہ اپنے امام کا قول نقل کر دے۔

[إرشاد الفحول للشوكاني (ص ٢٩٦)]

فتویٰ پوچھنے اور فتویٰ دینے کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے، چودہ صدی کے طویل عرصے میں علماء نے اس شعبے کی دینی اہمیت کے پیش نظر ہمیشہ ہی اس کا خصوصی اہتمام کیا ہے، تمام مسلمان اپنے اکثر دینی و دنیاوی امور کے متعلق پیش آمدہ مشکلات اور مسائل کے حل کی خاطر برابر ان کی طرف رجوع کرتے رہے ہیں، افتاء کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے، قرآن مجید میں دو جگہ لوگوں کے فتویٰ پوچھنے کے جواب میں اللہ کے فتویٰ دینے کا ذکر آیا ہے۔[النساء: ١٢٧، ١٧٦]

الحمد للہ ہمارے سلف فتویٰ دینے میں صحابہ کرام، تابعین عظام اور فقہاء و محدثین کے طرزِ عمل اور طریقہ کار کو سامنے رکھتے ہیں اور یہی راہ صواب، جادۂ مستقیم اور منہاج قویم ہے۔ اور محقق العصر امام ناصر الدین البانی رحمہ اللہ جو کہ متبحر فی العلم تھے کے فتاویٰ بنام **"فتاوىٰ البانيه"** بھی اس سلف کے منہج کی ایک کڑی ہے، آپ رحمہ اللہ کے حالات و واقعات اور آپ کی علمی مجلسوں کا ذکر اللہ نے موقع دیا تو کسی دوسری جگہ کریں گے یہاں موقع نہیں، لیکن **"فتاوىٰ البانيه"** کو جن احباب نے ترتیب دیا وہ مختصر اور جامع ہے اس فتاویٰ میں آپ کے روزمرہ پیش آنے والے مسائل کا ذکر کیا گیا ہے جس میں عقائد، طہارت، صلاۃ، قرآن، زکوٰۃ، حج اور جنائز وغیرہ کے متعلق اہم سوالوں کے جواب موجود ہیں۔ آپ رحمہ اللہ کا اسلوب محدثانہ فقیہانہ اور مجتہدانہ ہے، ہر عام و خاص کے لیے یکساں مفید ہے۔

اللہ تعالیٰ اس سعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور ہمیں اپنی رحمت سے نوازے۔

ابو الحسن مبشر احمد ربانی